

نکارنگ کہانیوں کے آئینہ دلچسپ حیدرہ

ماہنامہ سے افق کچی

PDFBOOKSFREE.PK

مغرب سے انتخاب

60	طاہر قریشی	ملکہ جہنم
68	اسرار احمد	غلط فہمی
74	فضیلت حسن ناول	تلاش بیٹی
24	نوشاد عادل	مفرور
230	راحیلہ تاج	ساز تمنا
80	شہناز بانو	گردش
142	اسمہ جمیل	گنگا کلہ بھاری
219	حافظ شبیر احمد	روحانی مسائل
223	عمر اسرار	خوشبو سخن
227	عفان احمد	ذوق آگہی

خط و کتابت کا پتہ: ناہنا مینے افق پوسٹ بکس نمبر 874 لاہور 74200 فون نمبر 021-35620771/2
 فیکس 021-35620773 کیلئے مطبوعات سے افق پبلی کیشنز پرائیویٹ لیمیٹڈ
 info@aanchal.com.ph

ابتدائیہ

8	مشتاق احمد قریشی	دستک
10	عمران احمد	گفتگو
20	طاہر قریشی	اقرا
22	مشتاق احمد قریشی	چچا چراندی
117	سچی کھانیاں ربحانہ سعیدہ	زرق برق
122	خلیل جبار	اندھا اعتماد
132	محمد سلیم اختر	ٹھوکریں
178	ریاض بٹ	آدھی پٹری
188	محمد ثقلین	آخری خط
196	ایم الیاس	شکجہ
204	غزالہ جلیل راؤ	سزا

پبلشر مشتاق احمد تریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ انجمن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
 دفتر کاپی: 7 منسیرہ جیسر ز عبد اللہ ہارون روڈ کراچی

دستک

مشتاق احمد قریشی

دوقومی نظریہ.....!!

میں ذاتی طور پر ایم کیو ایم کے بانی اور قائد خرمیک جناب الطاف حسین کی جدوجہد کا معترف ہوں کہ انہوں نے جس طرح بانیان پاکستان یعنی تقسیم ہند کے نتیجے میں اس دھرتی پر آنے والے مسلمانوں جنہوں نے اس ملک کی اپنے خون سے آبیاری کی جو اصل بانیان پاکستان ہیں، ان کی اولادوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کر کے ان کے حقوق کی آواز بلند کی آج یہ آواز اتنی مستحکم ہوئی ہے کہ دنیا کے ایوانوں میں اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ آج یہ تنظیم صرف مہاجرین ہی کے لیے نہیں بلکہ پورے ملک کے مظلوموں کی بات کر رہی ہے اور ملک میں جہنم لینے والے ہر مسئلہ پر نہ صرف بات کر رہی ہے بلکہ اس کا حل بھی تجویز کر رہی ہے۔ میں الطاف حسین کی جدوجہد کی دل سے قدر کرتا ہوں۔

ہم ان لاکھوں لوگوں کی قربانیوں کو کیسے بھول سکتے ہیں جنہوں نے دوقومی نظریے کے لیے اپنی جان مال اور جائیدادوں کی قربانی دی پاکستان کے اصل بانی بھی لوگ ہیں جنہوں نے ہندو باد یوں میں گھرے ہوئے اور یہ جاننے کے باوجود کہ جہاں وہ رہتے ہیں وہ شہر، قصبہ اور گاؤں پاکستان کا حصہ نہیں بن سکتے، وہاں پاکستان کا نعرہ بلند کیا اور تحریک چلائی اور اپنا سب کچھ وار کر پاکستان چلے آئے۔ میں خود بھی قیام پاکستان کے وقت خون کا دریا پار کر کے پاکستان پہنچا تھا۔

وہ نظریہ جس کی اساس پر مملکت خدا داد پاکستان کی تعمیر کی گئی (وجود میں آئی) اسے انتہائی سادہ لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان ہندوؤں سے قطعاً ایک علیحدہ قوم ہے۔

قائد اعظم نے ایک بار فرمایا تھا "جب ہندوستان کا پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا۔ وہ جدا گانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آ گئی۔"

یہ بات بھی قطعی تسلیم شدہ ہے کہ اسلام اور ہندو مذہب اور دیگر مذاہب کا طرز معاشرت بالکل مختلف ہے۔ زبان و ادب، فنون لطیفہ، فن تعمیر، رسم و رواج، گو یا ہر معاملے میں اسلام کا اپنا ایک علیحدہ نقطہ نظر ہے۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ قدیم آریاؤں کے بعد سرزمین ہند پر جس قوم نے بھی پیغمبری وہ کچھ عرصے بعد اپنی انفرادیت کھو بیٹھی تھی۔ صرف مسلمان ہی ایسی واحد قوم تھی جس نے ہر دور میں اپنا شخص برقرار رکھا۔ اگرچہ مسلمانوں کی انفرادیت ختم کرنے کے لیے اور انہیں اپنے اندر ضم کرنے کے لیے ہندو ہمیشہ مختلف انداز سے حملے کرتے رہے ہیں وہ اکبر اعظم کے دور میں دین الہی رو شاس کے کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن ہر دور میں ہر فرعون کے لیے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کا بندوبست فرمایا ہے۔ مسلمانوں میں اللہ کا کوئی نہ کوئی بندہ دین اسلام کی تجدید و احیاء کے لیے مجدد و الف ثانی جیسے مشاہیرین اٹھتے رہے ہیں ہندوؤں اور تمام غیر مسلموں کی کوششوں پر پانی پھیرتے رہے ہیں۔

1930ء میں اسی مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے الیہ آباد میں علامہ سر محمد اقبال نے اپنے خطبے میں کہا تھا۔ "اب تک ہم نے باہمی تعاون و اشتراک کی جس قدر کوششیں کی وہ سب ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ اگر فرقہ وارانہ

امور کے ایک مستقل اور پائیدار تصفیے کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانان ہند کو اپنی روایات و تمدن کے تحت اس ملک میں آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔"

اپنے اس خطبے میں علامہ اقبال نے دوقومی نظریے کی بنیاد (مسلم اور غیر مسلم) پر ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کرنے کی تجویز پیش کی جسے بعد میں چوہدری رحمت علی نے لفظ پاکستان سے تعبیر کیا۔ دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہی 14 اگست 1947ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا اور پاکستان کے قیام کا اعلان 14 اگست اور 15 اگست کی درمیانی شب کیا گیا۔ جس کے فوراً بعد ہندو قومیوں جن میں سکھ پیش پیش تھے نے اپنے کواس کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑی۔ انتہاپسند ہندو قومی جگہ دیگر غیر مسلم قومیں جن میں سکھ پیش پیش تھے نے اپنے اپنے علاقوں میں مسلمانوں کو بے دریغ شہید کرنا شروع کر دیا اور مسلم اکثریتی علاقوں سے مسلمانوں کو نکالنے اور اقلیت میں بدلنے کی ہولناک سازش ہندو لیڈروں نے بنائی تاکہ تمام مسلم اکثریتی علاقے پاکستان کا حصہ نہ بن سکیں اور ہندو انگریز ملی جھگٹ سے ہندوؤں نے مسلم ریاستوں کو اپنی قوت اور زور بازو سے پاکستان کا حصہ نہیں بننے دیا مثلاً حیدرآباد کن دیگر چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں پر جبراً انگریز حکمرانوں کی مدد سے قبضہ جمالیا۔

پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کی قرارداد مقاصد میں کہا گیا کہ پاکستان کی حکومت اسلامی ہوگی اور اس کے آئین و قوانین قرآن و سنت کے مطابق ہوں گے۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان ایک اسلامی نظریاتی مملکت کے طور پر وجود میں آیا پاکستان ایک مسلم ریاست کے طور پر معرض وجود میں آیا ہے۔ اسے ہم آج کیسے غیر مذہبی یا سیکولر کہہ سکتے ہیں کیا اس طرح ہم قیام پاکستان کے بنیادی نظریے اور دوقومی نظریے سے منحرف نہیں ہوں گے کیا اس طرح ہم وطن عزیز کے قیام کے بنیادی مقصد اور حقیقت سے جو خود کو الگ نہیں کریں گے۔ جہاں تک طالبان کے اسلام کی بات ہے تو لفظ طالبان کے معنی طلب کرنے والے کے ہیں پہلے یہ لفظ طالب علم کے لیے استعمال ہوتا تھا لیکن اب یہ لفظ بھتہ طلب کرنے والوں کے لیے استعمال ہو رہا ہے جن کا تعلق دینی مدارس سے نہیں بلکہ یہ امریکی اور نیٹو کے پروردہ ہیں جو پاکستان میں امن و امان نہیں دیکھنا چاہتے ان کی پشت پناہی بھارت اور اسرائیل کر رہے ہیں پاکستان میں سرگرم نام نہاد طالبان کا کوئی مذہب نہیں ہے نہ ہی اسلام سے ان کا کوئی تعلق ہے علم کے مراکز کو دھماکوں سے اڑانے والے طالب علم کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ اسلام اور خصوصاً ایشی پاکستان کے خلاف امریکا اور اس کے حواریوں کی کھلی کھلی سازش ہے۔ اسلام نہ طالبان کا ہے اور نہ ہی کسی اور قوم و ملت کا دین ہے۔ اسلام تو اللہ تعالیٰ کا نافرذ کردہ دین اولین و آخرین ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور اس دین اسلام کی تکمیل نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے کی گئی اور یہی دین اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے کوئی مسلمان جس نے کلمہ توحید ادا کیا ہو وہ کسی بھی طرح غیر مذہب یعنی سیکولر نہیں ہو سکتا اس کا تعلق دین اسلام سے ہی رہے گا۔ اللہ ہماری ہمارے دین اسلام کی وطن عزیز کے دو قومی نظریے کی حفاظت فرمائے اور ہمیں سچا سیدھا مسلمان بنائے۔ آمین



گفتگو

عمران احمد

حضرت عمارہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ میں نے خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا ہے آپ ﷺ ارشاد فرماتے تھے کہ ”جو کوئی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت و بندگی کے لائق نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں تو اللہ نے اس شخص پر دوزخ کی آگ حرام کر دی ہے۔“

عزیزانِ مضمحل..... سلامت باشید!

امید ہے دنیا بھر میں ہمارے قارئین سر دیوں سے خوب لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ ویسے تو غریبوں کے لیے خاص طور پر پاکستانیوں کے لیے تو ہماری اشرافیہ نے جو ہمیشہ روپ بدل بدل کر ایوانِ اقتدار میں براجمان رہتی ہے سارے موسم ہی عذاب بنا ڈالے ہیں گرمی ہو یا سردی یا پھر خزاں ملک بھر میں کسی نہ کسی شے کے بحران کے باعث عوام بکلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں دریا بہن پلہاں ہیں مگر کھیتی باڑی نہیں گندم کی پمیر فصل ہے مگر لوگ آٹا نہیں خرید پاتے 80 فیصد سے زائد لوگوں کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں ہے جو موت آتے۔ بحرانوں کا شکار ہو رہے ہیں چاری موسم کیا بجوائے کرے گی۔ پھر بھی

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

گزشتہ ہمارے ایک پیارے لکھاری راوی پلنڈی کے محمد سلیم اختر ماں اور کراچی کی عالیہ انعام الہی دادی کی شفقت سے محروم ہو گئے ان اللہ و ان علیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل دے اور مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ہم سب بعد اپنے قارئین کے محمد سلیم اختر اور عالیہ انعام الہی کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اب آئیے اپنے خطوط کی طرف۔

شہناز بانو..... کراچی۔

محترم عمران بھائی! السلام و علیکم ورحمۃ اللہ اللہ کی کریم اور حیم ذات سے امید ہے کہ آپ اور انصار پر تخریرت کی۔ اپنی کارِ خلوص ساتھ ہو تو انعام ملک ہو جاتا ہے زندگی گزرتی رہے گی۔ خوشیاں بھی منائیں گے لیکن ساتھ چھوڑ کر جانے والوں کو دل بھی بھلا نہیں پاتا۔ بات خوشی کی لگی ہے تو آج اپنی زندگی کی ایک اور بہت بڑی خوشی شیئر کرنا چاہوں گی اسعد علی نے جج سے واپس آکر CA کا فاضل ایگزام دیا تھا اور الحمد للہ ان کا رزلٹ انانٹس ہوا ہے ماشاء اللہ وہ الیقانی ہو گئے کل کا دن بڑی زندگی کے اہم دنوں میں سے ایک تھا۔ یہ مبارک مہینہ ربیع الاول کا گزر رہا ہے۔ پاکستانی قوم بڑے جوش و خروش سے جشنِ عید منا رہی ہے لیکن مجھے بہت ساری چیزوں کا دکھ اور افسوس ہوا ہے پہلا دکھ اور افسوس تو یہ تھا کہ ہم مسلمان ہو کر بھی اپنے دین سے کتنے دور ہیں کیا اللہ کے محبوب نبی آخر زمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا بکلی انداز ہے کہ ہاتھوں میں ہرے چھندے کر سڑکوں پر نکل آئیں یا بڑے بڑے کیک بنا کر کائیں ڈھول تاشے بجا کر ناچیں اور فریہ کہیں کہ ہم اپنے نبی کی پیدائش کی خوشی منا رہے ہیں۔ ان سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں چند سوالات آئے ہیں۔ میں بھی ان کا جواب تلاش کر رہی ہوں اور آج سالہ دور خلافت میں منایا گیا ہے کہ آج کا مسلمان صحابہ کرام سے زیادہ عاشقِ رسول ہے؟ کیا اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب پسند آیا ہوگا؟ ضرور سوچے گا اور گفتگو کی جانب آتے ہیں۔ سب سے پہلے نازش کی جگہ تھی تو آواز سی ڈیئر تمہارا ناول ”شہناز“ اور تمہیں میں نے فون پر اس کے بارے میں بالکل ٹھیک شکاک رائے دے دی تھی۔ یہاں بالکل نہیں لکھوں گی۔ امید ہے کہ پڑھ کر آئندہ آنے والا ناول مزید بہتر ہوگا۔ تم میرے ناول نہیں پڑھتے لیکن میں تمہاری ہر تحریر ضرور پڑھتی ہوں۔ چلو خوش رہو جہاں تمہارا ہوا جواب ملنے پر مبارک باد۔ بھائی ریاض بٹ کہے ہیں میرے دکھ کو محسوس کرنے کا بہت شکریہ۔ آپ کی تحریر کشتہ تھانے دار بھی

پڑھی۔ بھائی اک مشورہ دینا چاہوں گی امید ہے آپ مایہ نہیں کریں گے۔ آپ کی کہانی کا پلاٹ جان دار ہے لیکن لکھتے ہوئے آپ جلدی کرتے ہیں۔ یعنی بہت علم الفاظ میں بات سمیٹ کر کہانی کو ختم کر دیتے ہیں۔ بہت سی باتیں تفصیل طلب ہوتی ہیں اور محسوس ہوتی ہیں۔ آپ پرچے میں چھپی کہانی کو تنقیدی نگاہ سے پڑھیں خود اپنی خامیاں تلاش کریں امید ہے مزید بہتر لکھ لکھیں گے۔ آپ بھی کہیں گے شہناز آج تنقید پر راز آتی ہے تو بھائی میں خود بھی کوئی بڑی رائے نہیں ہوں بلکہ اچھی پڑھنے والی ہوں اس لیے کسی بھی تحریر کو پڑھتے ہوئے جو کسی محسوس ہوتی ہے وہ بھائی سے بیان کر دیتی ہوں۔ میرا آج بھی یہی حال ہے۔ میں ہمیشہ اپنی تحریر کو تنقیدی نگاہ سے پڑھتی ہوں اور اپنی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ آپ کہانی ری رائٹ ضرور کیا کریں۔ فرق آپ کو محسوس کریں گے۔ ناراض تو نہیں ہیں سر.....! ریاض حسین قمر بیگانی کا رونا رو رہے ہیں۔ میرے بھائی اپنا ہی منہ پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں ملک میں جرائم بڑھنے کی ایک بنیادی وجہ یہ بیگانی ہے۔ ایک غریب آدمی جب اپنی جائز آمدنی میں اپنے بچوں کا پیٹ نہیں بھر سکتا تو وہ ناجائز ذرائع اپنالیتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کم از کم اپنے اعمال کا خود محاسبہ کرنا چاہیے۔ مجاہد ناز عبا کی تمہارا خط اچھا لگا میں تمہاری رائے سے پوری طرح متفق ہوں اپنے ابو جان کا میری جانب سے شکریہ ادا کرنا اور سلام کہنا۔ محترم بھائی ابن مقبول کا ویدہ صدیقی آپ کا بہت شکریہ۔ یہ اللہ کے شکر کا مقام ہے کہ اللہ نے آپ کو ٹیک اور سعادت مند اولاد عطا کی ہے۔ اپنی بہادر پوتے پوتی کو میسر آیا رہا دیکھو جیگا۔ اسعد پیلے بیگنوں کے ڈٹ پر تھے۔ اس لیے بیگن کے کام کے سلسلے میں پنڈی جانا ہوا تھا اب وہ ٹیکس ڈرامنٹ میں ہیں۔ اگر اس سلسلے میں بھی پنڈی یا اسلام آباد نا ہوا تو آپ سے رابطہ کریں گے۔ نازش کی کہانی پر جو تبصرہ آپ نے کیا ہے بخدا وہی الفاظ میرے بھی تھے۔ انکم فاروق اتنا مختصر خط کیا صرفوفیت بہت زیادہ ہے۔ بہن سے بھی میرے دلی دکھ کا اظہار کرنا۔ سہنی کے بارے میں ایک اہم اطلاع دینی ہے اور یہ کہ اس نے مردوں کے گے پسپائی اختیار کر لی ہے۔ فل سائنٹ ہو گئی ہے کیونکہ بہت جلد اپنے پیا کو پیاری ہونے والی ہے۔ محفل میں کیوں نہیں آ رہی مجھے نہیں معلوم ویسے اس نے میرے سفر تھاجز کو اچھا کر رکھا ہے تحریریں پروف ریڈنگ کی دو تین فاش غلطیاں تھیں۔ سورۃ احزاب کی جگہ ”الاحزنام“ لکھا ہے اس کے علاوہ چند اور غلطیاں ہیں سب سے آخر میں بھائی فقیر ناگہ موجود ہیں کسی ہیں آپ۔ اللہ آپ کو کھوت و زندگی عطا کرے۔ میرے لیے آپ کے دلی جذبات پر میں تہنوں سے شکر گزار ہوں۔ محفل سے نکل کر اب کچھ تبصرہ کہانیوں پر بھی ہو جائے۔ ”بلدا“ اس ماہ اختتام پذیر ہوئی۔ مجموعی طور پر بہترین کہانی تھی۔ مغربی کہانیوں میں انہونی کی دلچسپ رہی۔ اپنی مٹی ریحانہ کی اچھی لگی کہ وہ موضوع پر اپنا تھا پھر بھی اچھی لگی۔ بازگشت ایک عبرت آموز تحریر تھی۔ گنگا کا پجاری ہمیشہ کی طرح بہت اچھی لگی۔ اس ماہ کی قسط زیادہ جاندار رہی۔ آئی ایم سوری طاہرہ منزل کو پڑھ کر ایسا لگا جیسے کسی پرانی پاکستانی فلم کی اسٹوری پڑھ رہے ہوں۔ تمہارے پاس تو بہت سے نئے آئیڈیاز ہوتے چاہئیں۔ آخری صفحات میں ہمیشہ اسٹیشن چیز ہوتی ہے اس مرتبہ نواز عادل نے اپنی بساط بچائی۔ ناٹ بیڈ کہنا چاہیے۔ بہت شاندار سی۔ امید ہے میرا بے لاگ تبصرہ کسی پر بھی گراں نہیں گزرا ہوگا۔ بس میں اپنے رائے سنا سنا کر دیکھنا چاہتی ہوں اور اپنی ناص رائے کا جھٹ اظہار کر دیتی ہوں۔ گفتگو میں عرصے سے بہت سے ساخی غائب ہیں۔ عالیہ انعام کہاں ہو ان شائین اور طاہرہ..... تنافٹ حاضری لگاؤ ارشاد جعفری صاحب بہت عرصے سے دکھائی نہیں دیتے۔ اللہ کرے سب خبریت سے ہوں۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے امان میں رکھے اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

عصمت اقبال عین..... منگلا خیم۔

محترم عمران بھائی! السلام و علیکم امید ہے آپ بالکل خیریت سے ہوں گے۔ چناب میں ابھی بھی سردی عروج پر ہے۔ شام کی اس سخت سردی میں بیڑے کے پاس بیٹھی ہوں اور میرے ہاتھوں میں نئی تحریریں سے بھرا نئے اقد ہے۔ نائل یوں محسوس ہو رہا ہے کہ پہلے بھی رسالے کی زینت بن چکا ہے۔ محترم مشتاق احمد اور عمران بھائی ہر بار حالات کی منتی پر بہت کچھ لکھتے ہیں۔ آپ قلم کے ذریعے جہاد کا جو فریضہ ادا کر رہے ہیں اب اختیار پر ان باتوں کا اثر ہو یا نہ ہو حالات بدلیں یا نہ بدلیں لیکن آپ اپنے حصے کا کام بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ شہناز باجی آپ کی والدہ کی وفات کا پڑھ کر افسوس ہوا۔ دعا ہے کہ رب تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ نصیب فرمائے۔ رب نے ماں اور بیٹی کا بہت خوب صورت رشتہ بنایا ہے۔ اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب ماںیں جدا ہو جاتی ہیں میری والدہ بھی وفات پا چکی ہیں اور میں اس دکھ کو سمجھ سکتی ہوں۔ عبداللہ صاحب آپ کے کہنوں اپنا ایک وفات پا گئے پڑھ کر دکھ ہوا دعا ہے خدا ان کی بخشش اور مغفرت فرمائے آپ کو اور تمام گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ عبداللہ بھائی آپ نے میری غزل کی پسندیدگی کے لیے جن خوب صورت الفاظ کا چناؤ کیا

ہے پڑھ کر بے حد اچھا لگا آپ بہت باریک بینی سے تمام قریوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو ہم لکھنے والوں کے لیے حوصلہ افزا بات ہے۔ محترم ریاضی حسین قمر صاحب قلم پسند کرنے کا شکریہ۔ حسب معمول اس مرتبہ بھی آپ کی خوب صورت غزل خوش بوخن کی محفل کو چار چاند لگادی گئی۔ ریاضی بٹ صاحب کیسے مزاج ہیں شاعری کی پسندیدگی کا شکریہ مجاہد صاحب کیا حال ہیں آپ کی اس مرتبہ نظم اچھی تھی۔ ابن مقبول جلد یاد صاحب امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ جہاں تک مصوری کی بات ہے تو اس سلسلے میں عمران بھائی ہی کچھ بتا سکتے ہیں کہ یہ بات ممکن ہو سکتی ہے یا نہیں۔ یاد تو سارے لکھنے والے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر وہ احباب جو تفصیل سے تبصرے لکھتے ہیں جن میں آپ بھی شامل ہیں۔ ریاضی بٹ صاحب کیسے ہیں؟ خط اور غزل پسند کرنے کا شکریہ۔ عبد اللہ صاحب آپ نے لفظ خلاف معمول لکھا ہے۔ ایسی بات نہیں جہاں تک میرا خیال ہے اکثر و بیشتر میں اپنے خطوط میں دوسرے لکھنے والوں کا ذکر کرتی ہوں وہاں آپ کا بھی ذکر کرتی ہوں خوش رہیں۔ خوش بوخن میں سچا جہاں وسیم اختر پروفیسر اور جلد نگہبانی کی غزلیں عمدہ تھیں۔ نظموں میں عبد اللہ شاہد مجاہد ناز اور فقیر محمد بخش صاحب نے خوب لکھا۔ محمد شفاعت حسین کا انتخاب بھی خوب صورت تھا۔ دعا ہے کہ آنے والا سال ہم سب کے لیے خوشیوں کا پیغام لے کر آئے گفتگو کی محفل میں تمام لکھنے والوں کو سلام۔

ایمانہ سعیدہ..... لاہور۔

پرانے ہیں۔ وہی نارنگ ٹنگ وہی لاگ مارچ وہی انقلابی باتیں لوڈ شیڈنگ کیس و بجلی کی وہی غربت تاہم یہ آغاز وقت سے سو دعا گو ہوں رب سے اس ربیع الاول کے مقدس مہینے میں اللہ پاک اپنے نبی کے صدقے تمام مسلم ائمہ کے مسائل کو حل کرے اور انہیں سچا کر کے ملت و واحد استوار کرے۔ ورنہ تو عوام انقلاب کے نعروں اور لیڈروں کی چٹنی چڑی باتوں میں فرقہ فرتنہ ہیں اور اب آنے والے الیکشن پھر سے وعدہ کا سنہرا چال لے کر شکار کرنے والے لیڈر اللہ پاک ہمارے عوام پر رحم کرتے ہوئے ہمارے دیانتدار شخص اور ابومرعمری بیرونی کرنے والے لیڈر سے نوازے۔ عمران بھائی نے آٹھ 20 تاریخ تک ملتا ہے سو پھر تبصرہ لکھتے لکھتے رہ جاتی ہوں کہ ایسا نہ ہو جب تک بھیجوں نیا رسالہ نہ پبلش ہو جائے۔ اس لیے باقاعدہ حاضری نہیں دے پانی اور غیر حاضر ہو جاتی ہوں۔ شہناز آجی مجھے بھی آپ سے بات کر کے اچھا لگا آپ کو میری آواز اچھی لگی بہت شکریا آپ کے حسن ذوق کا اور شاید آپ کو میں دیکھنے میں بھی اچھی لگوں کیونکہ جو حسن ذوق کے مالک ہوتے ہیں وہ حسن نظر بھی رکھتے ہیں۔ جناب فوری طور پر گردش پر بھی اور حشام کی زندگی سے خوش بھی ہوئی جس طرح آپ اس نیت و رک کو بیان کر رہی ہیں اس سے ان لوگوں کی اصلاح ہو سکتی ہے جو روحانی پیشواؤں پر اندھا اعتقاد کر کے جاتے ہیں۔ خورشید صاحب نے بلاوا کا انتقام ہندو عقیدے کے عین مطابق کیا۔ سوچی اندھے مزہ آیا اور شرابی بھی زندہ تھی وہ معصوم لڑکی مجھے اچھی لگی تھی سوار خوش ہوئی۔ طاہر قریشی کا کٹا جس سے بھر پور تھا۔ پرچی بات بتاؤں کہ مجھے شہتی شاہد کا پتا چل گیا تھا کہ کون ہے اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ہارموریز اور سی آئی ڈی دیکھتی ہوں۔ فیاض صاحب نے شعبہ باز میں یونیورسل ترنہ بتایا کہ ایک مشہور بندہ ہر ایک کی طرف مسکرا دے دیکھتا ہے۔ اس مسکراہٹ سے غلط مطلب اور قاتل نہیں ہوتی چاہیے۔ راجیلہ تاج کی انہوئی بس انہوئی ہی تھی کیونکہ خاص متاثر نہیں کر سکی۔ سلیم اختر کی بازگشت آج کی نسل کے لیے سبق ہے۔ جو جنس عشق و عاشقی میں زندگی کی اصل خوب صورتوں سے منموڑ لیتے ہیں اور پھر پچھتاوا ان کا مقدر بنتا ہے۔ شہناز آجی کا سفر نامہ پڑھا لگ رہا تھا شاید خود بھی یہ سب کچھ دیکھ رہی ہوں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ شہناز آپ آپ اگر خود اس کو لکھیں تو اور زیادہ متاثر کن ہوتا کیونکہ دنیا کے ہر سفر کو بیان کیا جاسکتا ہے راوی کے مطابق لیکن ج و عمرہ نوکر کے آنے والے اس طرح بیان نہیں کر پاتے جو محسوس کرتے ہیں۔ ریاضی بٹ کی کہانی دلچسپ اور تجسس سے بھر پور تھی جو اختتام پر پھر سوال چھوڑ گئی۔ خوش بوخن میں عصمت اقبال عین کی غزل اچھی لگی۔ قدر رانا کی غزل نے بھی متاثر کیا۔ ریاض حسین کی شاعری نے بھی دل کو چھوا۔ نوشاد صاحب میرے تبصرے سے بچ گئے کیونکہ خری کہانی ابھی نہیں پڑھی۔ ریاضی بٹ صاحب قلم پسند کرنے کا شکریہ۔ ریاض حسین قمر مجاہد ناز فقیر محمد بخش لڑکھ کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری قلم کو پسند کر کے میری حوصلہ افزائی کی۔ ابن مقبول صاحب آپ کا تبصرہ بے لاگ اور انیسٹ فارورڈ تھا مجھے بہت اچھا لگا۔ اللہ نے آپ کو خدا ندان کی خوشیاں دکھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کی دلی مرادیں پوری کرے۔ سر آپ کو میری قلم اچھی بہت شکریہ۔ عمران بھائی کو میرے تبصرے کے لیے کوئی اسکریپٹ صفحہ لگانا سوا با اجازت جاہوں گی۔ اللہ حافظ

عالیہ انعام الہی..... کراچی۔

محترم عمران بھائی السلام علیکم امید تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ بخیر و عافیت ہوں گے خدائے بزرگ و برتر سے آپ کی ترقی اور کامرانی کے لیے دعا گو رہتے ہیں اللہ آپ کی ہمت اور قوت میں اضافہ

فرمائے آئیں۔ بڑا مباح صرگز راقلم ہاتھ میں لیے اب تو قتل کے لیے عرصے لگتا ہے کہ میرے قلم کے نصیب میں نکلتے اور ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح مستقل ہو گئے ہیں خود اپنی کوتاہیوں اور کالیوں پر سب سے بڑا پردہ اور آسان جلد ہی باقی رہتا ہے کہ تقدیر پر اپنی قوت سے تمام تیر چلا دوں یا؟ عمران بھائی کچھ حالات و وجہ ہے کچھ مصروفیات نے راہ رو کر رکھی کچھ صدقات نے داسن تر کیے رکھے کہ طبیعت ہر شے سے اچاٹ ہو گئی۔ تنہائی کی کچھ ایسی عادت پڑ گئی کہ محفل میں آنے کو بھی اس دل بد بخت نے انکار کر دیا۔ امی کے چلے جانے کے بعد زندگی ویسے ہی تہہ وبالا ہو چکی تھی اپنا آپ ڈھونڈنے سے کہیں نہیں ملتا تھا۔ خود کو حزن و ملال کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے مصروفیت کے جنگل میں کھودیا اور ہاتھ چھا کر برسوں ہو گئی مگر انیس محرم کو ادوی کی اچاٹ جلدانی نے پھر اسے دور اپنے پر لاکھڑا کیا کہ اپنا آپ پہچانا دھار ہو گیا۔ امی کی رخصتی کا منظر ابھی تک ذہن سے نہ مٹ سکا ہے اب بھی دل میں سے بھر جاتا ہے اور آنکھیں برسنے کو تیار رہتی ہیں ایسے میں دادی کا سہارا اللہ کے بعد بہت بڑا تھا۔ وہ ماں کی موجودگی میں بھی ہمارے لیے ماں سے بڑھ کر تھیں۔ ہمیں اسکول لے جانا اسکول سے لانا کالج میں بھی وہ ہمیں چھوڑ کر آیا کرتی تھیں کہیں دوستوں میں جانا ہو نہیں سے بڑھ کر تھیں۔ ہمیں اسکول لے جانا اسکول سے لانا کالج میں بھی وہ ہمیں چھوڑ کر آیا کرتی تھیں کہیں دوستوں میں جانا ہو نہیں کوئی کام ہو وہ ہمیشہ ہی ہمارے ساتھ رہیں۔ ان کی دعا میں ہمارے لیے سربا یہ تھیں۔ ان کی رفاقت ان کی محبت ہمارے لیے خزانہ تھی۔ اب تہی دای کا یہ عالم ہے کہ سایہ دنیا میں ہم جیسا غریب دوسرا کوئی نہ ہوگا۔ بس اچاٹ ہی ہمیں چھوڑ کر امی کے پاس جا سوں دوں ساس ہوساری زندگی ایک دوسرے کے ساتھ رہیں اور اب وہاں بھی ساتھ ہی ہیں۔ صبح سہر پر ہاتھ کر رکھ کر دعا دینے کی ان کی عادت ہمارے لیے زمانے کے مصائب سے بچاؤ کے لیے ڈھال تھی اب لگتا ہے کہ تہہ صحر میں کھڑے ہیں۔ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتے ہیں کہ اب تو ڈھارس بندھانے والا بھی کوئی نہ رہا۔ دو ماؤں کو کھونے کا کھہر ہر دم مارے ڈالتا ہے۔ بظاہر تو زندگی اپنے پورے کز و فر کے ساتھ رواں دواں ہے مگر حقیقت میں غموں نے پوشاک زندگی کو پتھروں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اب کوئی خوشی خوشی معلوم ہی نہیں ہوتی۔ ہر چیز کے لیے سوچنے کا انداز ایسی تسکیر تبدیل ہو چکا ہے۔ اللہ نے بڑی ہمت اور حوصلہ دیا ہے کہ اکثر صرف فراموشی کی کیفیت خود پر طاری کر لیتے ہیں اور یادداشت سے مٹ جاتا ہے کہ وہ اب ہم میں نہیں ہیں۔ مگر جب ان کے خالی بستر پر نظر پڑتی ہے تو ہر ہمت شکست کھا جاتی ہے۔ میرا تو ٹھکانہ ہی ان کی مسہری تھا روز شام کو کاموں سے فارغ ہو کر انہیں اخبار سنانا میرا معمول تھا کہ اخبار سننے کی وہ ہمیشہ سے شوقین تھیں۔ اپنے جانے سے ایک ہفتہ پہلے بھی وہ اخبار اپنے پاس رکھے میرا انتظار کر رہی تھیں کہ میں فارغ ہو کر انہیں خبریں سناؤں اب اخبار کا پڑھنا بھی جو حکم بن گیا ہے۔ مجھے ہمیشہ نے آٹھ کا شمار وہ خود بازار سے لاکر دیا کرتی تھیں اور مجھ سے زیادہ خود خوش ہوا کرتی تھیں۔ تین برسوں سے معذوری کے باعث وہ چل بھر نہیں سکتی تھیں۔ مگر مجھ سے ڈانچت لے کر ضرور دیکھا کرتی تھیں۔ یقین نہیں آتا کہ دبیر کا شمار اب تک مجھ سے لے کر بڑے شوق سے دیکھا تھا لگتا ہے کہ کوئی خواب ہے کہ ہفتے بھر کے اندر ہی اچانک ہمیں چھوڑ گئیں۔ اب یاد آتا ہے کہ کیسی جاہت سے انہوں نے عید کے بعد گلے لگا کر کہا تھا کہ بلا سے میں تمہارے سر پریشی تو ہوں میں نہ ہوتی تو کیا کرتی۔ بے وجہی ان کا یہ تبصرہ دل پر چر کہ بن کر لگتا ہے۔ نگاہوں سے ایک لمحے کو بھی وہ ہمیں اوجھل نہیں ہونے دیتی تھیں۔ بس ہر دم ہم بہن بھائیوں کی صورت دیکھتے رہنے کی خواہش کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ عمران بھائی لکھنے کو تو اتنا کچھ ہے ان کے بارے میں کہ مجھے بھرجائیں مگر ضبط ٹوٹ جائے گا۔ اب تو رونے کی ہمت بھی ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے آئیں۔ تمام پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ ان کے لیے دعا کریں۔ شہناز باجی کی والدہ کے انتقال کی خبر بڑی دیر سے ملی کہ پچھلے کئی دنوں سے کچھ بھی نہیں پڑھ پاری۔ آپ کے دفتر تون کر کے نمبر لینا جا پاس میں بھی نا کاکی رہی۔ شہناز باجی تاخیر کے لیے ہاتھ جوڑ کر معافی کی خواہش کرتا ہوں کہ آپ کی دی ہوئی محبت کا تقاضا تھا کہ اتنی تاخیر کی خطا تو مجھے ہرگز بھی زیب نہیں دیتی۔ آپ نے اپنی والدہ کا سفر کے لیے تیار کیا اس بات نے دلایا کہ امی کو جب تیار کر رہے تھے تو ہم بھونے نے بھی سہل دینے میں حصہ لیا تھا آج بھی اس وقت کا تصور بھانجیاں بندھا دیتا ہے۔ بس اللہ سب کو زندگیاں دے ایسے کڑے قوتوں کا سامنا کرنے کی اب ہمت نہیں رہی اللہ آپ کی امی کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے آئیں۔ فردی کا شمار اپنی نیکیوں کفایتوں کے ساتھ خوب بہار دکھا رہا ہے۔ مشتاق اٹھل کی کراچی کے والے سے گفتگو بڑی پر مغز رہی۔ محفل میں چپکے چپکے خطوط کی ریل بھی تھی۔ نازش کی باتیں خوب مزہ دے رہی تھیں آپ کو شاید کی بہت بہت مبارک ہو۔ آپ زندگی میں جتنا آج فعال ہوا اللہ تمہیں تا عمر اسی طرح مشل پارہ رکھے ہر دم مچلتا اور گلکھلتا ہوا زندگی کی ہر خوشی آپ کو میسر رہے یہ مسرور رہے ہوئے دعا ہے۔ قبول کرے آمین۔ عبد اللہ شاہد بھائی بھی تم کی کیفیت میں دکھائی دیے۔ شاہد بھائی اپنے پیارے

رشتوں کی جدائی میں ٹوٹ پھوٹ کا جو عمل ہمارے وجود میں ہوتا ہے اس کا اظہار بشری کمزوری آنسوؤں کے ذریعے ہی کر سکتی ہے پھر رب کی طرف سے بھیجے گئے فرشتے دل پر آ کر خود ہی صبر اور قرار کا بھیاہ رکھ دیتے ہیں۔ ورنہ موت کا غم اتنا بھاری ہوتا ہے کہ انسان کا سینہ پھٹ جائے رب کی محبتیں رب ہی جانتے ہیں ہم تو جانے والے کے لیے صرف دعائے مغفرت کر سکتے ہیں۔ اللہ آپ کو صبر عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ بس اللہ ایسے دکھوں سے ہم سب کو بچا تارکھے اور خوشیوں کے ساتھ زندگی جینے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ عمران بھائی بڑی معذرت کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ مطالعہ کے نام پر ابھی ایک کہانی بھی پڑھ نہیں پائی ہوں کوشش کروں گی کہ اگلے دفعہ پھر پورے سے اس کے ساتھ حاضر ہو جاؤں ابھی تو دل و دماغ ٹھکے پڑے نہیں ہیں میرے لیے دعا کیجئے کہ اجازت دیں، اللہ حافظ۔

محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد۔ السلام علیکم آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں کچھ دن پہلے شہر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں بک اسٹال پر ماہ فروری کا تازہ پرچہ سننے افق دیکھ کر میرا دل خوش سے باغ باغ ہو گیا۔ اب یہ خوب صورت پرچہ نکالنے پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کریں۔ یہ ایک معیاری میگزین ہے ہر ماہ کے آخر پر اس کا ہمیں بڑی شدت سے انتظار ہوتا ہے۔ سرورق پڑھیں ہر بار سرورق کچھ بچھا بچھا دکھائی دیتا ہے اس سے ہی پرچے کی زینت میں چار چاند لگتے ہیں اس سے قاری پرچہ خریدنے پر مجبور ہوتا ہے۔ کافی عرصہ سے آپ کو خط لکھنے کا سوچ رہا ہوں آج ہی وقت ملا ہے۔ ماہ فروری کے پرچے میں غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ گزرے ہوئے سال میں آپ نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا اس کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں امید کرتا ہوں کہ آپ نئے سال میں پہلے سے زیادہ میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اس کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں امید کرتا ہوں کہ آپ نئے سال میں پہلے سے زیادہ میرے ساتھ تعاون کریں گے۔ بہت تھوڑے پیسوں میں ایسی عمدہ اور دلکش تفریح قارئین کو دینا آپ ہی کا کام ہے۔ اس بار ہرگز پرانی اپنی جگہ پر کامیاب تھی۔ مثلاً اقرار دستک گفتگو اور بزم سخن خوش بوخن روحانی مشورے میں آپ نے کوزے میں دریا بند کر دیا ہے ویسے بھی آپ یاروں کے بار ہیں۔ اب ہم نئے سال میں سانس لے رہے ہیں نیا سال ہم سب کو دیکھنا نصیب ہو۔ خدا سے دعا گو ہوں کہ پرچہ بدن ترقی کرے میں اس کا ایک اداسنا قاری ہوں۔ گزرے سال میں سکھ کوئی نہ ملتا ہر طرف دکھوں کی پھواری شید معاشی بحران تھا ہر نگاہ پریشان تھی۔ خوشیوں کے تمام چراغ بجھے تھے دکھائی دیتے تھے۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت دے تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے اور زندگی میں آپ کو اچھے دن دیکھنا نصیب ہوں اور کوئی قابل ذکر بات نہیں اگر زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ اسی کے ساتھ اجازت چاہوں گا نیک تبادلوں کے ساتھ..... خدا حافظ۔

ریاض بٹ..... حسن ابدال۔ السلام علیکم ماہ فروری 2013ء کا شمارہ حسب معمول ہر دہائیوں کے سامنے جلوہ افروز ہوا۔ یقیناً جاوید صاحب طبیعت خوش ہو گئی اور سونے پہ پہا کہ یہ کہ میری کہانی بھی موجود ہے۔ ان سب عنایات کے لیے شکریہ۔ مہربانی چھوٹا لفظ ہے۔ بہر حال خدا آپ کو خوش رکھے اور قارئین کو بھی جو میری حوصلہ افزائی توجہ سے بڑھ کر کرتے ہیں۔ سب سے پہلے دستک پڑھی۔ واقعی انسان خسارے میں ہے۔ روشنیوں کے شہر کراچی کو خون میں نہلا دیا گیا ہے۔ خدا ہمارے حال پر رحم کرے۔ اب بڑھتے ہیں اپنی پیاری محفل میں۔ ناز سلوش ڈشے اپنی کونان گوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر تشریف لائی ہیں اور خوب لائی ہیں۔ بہن اپنے دل میں نرمی پیدا کریں۔ خدا آپ کو آپ کے مقصد میں کامیاب کرے۔ آمین۔ ریاض حسین بھائی آپ کا تبصرہ بھی خوب ہے اس بار آپ شاید مجھے بھول گئے۔ خیر خوش رہیں۔ مجاہد ناز عباسی ذوق آگاہی میں میرا انتخاب پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ ابن مقبول جاوید صاحب صدیقی بھائی آپ کی عظمت اور دیادگی میں سلام پیش کرتا ہوں۔ میری کہانی کو بیش کی طرح پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ میری ایک مجبوری ہے کہ مجھے نفسیاتی کہانی کو ڈرامہ لکھنا پڑتا ہے اس لیے میں کچھ باتیں قارئین کی ذہانت پر چھوڑ دیتا ہوں۔ آپ کا اندازہ صحیح ہے علاوہ ازیں مجرم کی ایک خاص نشانی (کٹی ہوئی انگلی) نے بھی ہمارے تجربہ اور ہماری تجربہ کو ڈھونڈنے میں آسانی پیدا کی۔ سید عبداللہ شاہد آپ کے بہنوئی کی وفات کا بڑھ کر دکھ ہوا۔ خدا بزرگ و برتر انہیں جنت الفردوس میں جلد سے اور آپ سمیت سب کو انہیں کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ محمد فقیر بخش صابر لنگاہ بھائی آپ کا خلوص بھر اخط قابل تعریف ہے۔ واقعی اچھی چیز کو اچھا ہی کہا جائے گا۔ میری کہانیاں آپ جیسے جہاندیدہ شخص کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ جو میرے لیے ایک اعزاز اور طمانیت کا باعث ہے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف حسب معمول سب سے پہلے قابل حد احترام

بہن شہناز بانو کی گردش پڑھی آہستہ آہستہ کہانی مزید بہتری کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جو آپ کے قلم کی چالکتی اور روانی کی مظہر ہے۔ اللہ کرے کہ زوق قلم اور زیادہ۔ مغربی ادب سے تینوں کہانیاں پسند آئیں۔ یعنی کاٹا، شعیبہ باز اور انہوئی۔ کئی کہانیاں بھی اچھی ہیں۔ کئی ایک کو زیادہ بہرہ مند بنانا ضروری ہوگی۔ عمران بھائی کا انتخاب لا جواب ہوتا ہے۔ اس لیے ہمارا پیارا سالہ دن وکی اور رات چونی ترقی کر رہا ہے۔ اب بڑھتے ہیں باقی سلسلوں کی طرف خوش بوخن میں شہناز کا نظام ریحانہ سعید کی عورت کہانی، عصمت اقبال عین سید عبداللہ شاہد اور ریاض حسین قمر کا انتخاب لا جواب لگا۔ باقی لوگوں کا انتخاب بھی خوب ہے۔ ذوق آگاہی میں بشیر احمد بھٹی پروفیسر واجد نیوٹی نجیب احمد اور پرویز احمد کا انتخاب میری ڈائری کی زینت بن گیا۔ کیونکہ اچھے انتخاب کی یہ قدر ہے۔ اب اجازت دیجئے اس شعر کے ساتھ

قاتل نے کیا صفائی سے دھوئی ہے آستین
اس کو خبر نہیں ابو بولتا بھی ہے

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی..... راولپنڈی۔ ابھی عمران جی اسلام علیکم اسادہ خوب صورت رنگوں کے امتزاج والا نئے افق ملا۔ فہرست زبردست کہانیوں کا مدعا دے رہی تھی۔ دستخط تو واقعی انسان بڑا خسارے میں ہے کہ بھرپور سبق دے رہی تھی۔ گفتگو میں انتہائی سادہ مگر گہرائی کا سمندر لیے حدیث ائمہ سبق دے رہی تھی جبراک اللہ۔ تصویروں میں ناز سلوش ڈشے بھی تعریف لائی ہیں۔ آپ کی ذکر کردہ چائیز کینی میں ہمارے یہاں عسکری میں کئی لوگوں نے کورس کیا ہے خاصے کی چیز ہے مگر ذرا سکی ہے۔ عام بندہ کب بغیر ڈاکٹر کے اعتبار کرتا ہے؟ خیر کئی رہے۔ کہانی پر تبصرہ کیسا لگا؟ ریاض بٹ بہت شکریہ جناب۔ اس دفعہ کی گمشدہ تھانے درجہ زبردست اور شاندار رہی وہی گندہ ملاقات کا منتظر رہوں گا۔ ریاض قمر مجاہد ناز عباسی یاد کرنے کا شکریہ۔ بہت اچھے تبصرے تھے۔ انجمن فوارق ساحلی آپ کا مختصر تبصرہ اتنا مختصر کیوں تھا؟ آپ کی کہانی کا انتظار ہے۔ گا۔ محترم فقیر محمد بخش صابر لنگاہ جی بے حد شکریہ یاد کرنے کا اور تبصرہ اس دفعہ اتنا مختصر کیوں تھا؟ اس دفعہ محترم مدہ بن شہناز بانو اپنی ارشاد تبصرہ میں غیر حاضر تھیں۔ آئیے جناب جلدی آئیے لیجئے ہمارے جذباتی عبداللہ شاہد بھی بھرپور غصے میں تشریف لے گئے ہیں۔ صرف اتنی یاد دہانی کرواؤں گا کہ جن کی بات مان کر آپ نے بات کی ہے بھی وہ بھی میرے ہی حق میں بول رہی تھیں۔ کان ادھر سے پکڑیں یا ادھر سے ایک ہی بات ہے اور پھر آسان کی طرف..... تنقید برائے تنقید ہرگز نہیں۔ مسلسل اسی چیز کی آپ نے رٹ لگا رہی ہے۔ سوچ مجھے بھی لیا کریں کبھی کبھی۔ وگرنہ زندگی میں ہمیشہ خوفناک غلطیاں ہی کرتے رہیں گے۔ سنیے صاحب متمول کے امتیازی اور معصنہ تبصرے نہیں بلکہ اللہ کے کرم سے صاحب متمول کا دلی اور غریب پرور تبصرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول کرنے والا ہے۔ جی ہاں ابھی تو آپ کا میری تنقید سے دل ہی جلا اگرایا ہے کہانی اور آگئی تو پھر تو پورا وجود شعلوں میں گھر جائے گا۔ اس لیے اگلی خود ساختہ تھلکہ چمادے والی ادنیٰ حلقوں میں نگارشات ذرا نہیں محتاط ہو کر لکھیے اور بچیں۔ وگرنہ ملازمت والی بات اور صرف مس کال دے کر دوسرے کے گھٹھوں پیسے ضائع کرنے کی عادت بھی ترک کر دیں۔ عمران جی چلیے کہانیوں کی طرف۔ ”بلاوا“ ختم ہوا۔ اچھی سی سیر بزم شروع کیجیے گا۔ بدلی کہانیوں میں طاہرہ ترشیہ نمبر لے گئے اور شعیبہ باز بڑا سبق آموز بار اور انہوئی مزہ دے گی۔ فیاض اور ارحیلہ دونوں کو مبارکباد۔ کئی کہانیوں میں محترمہ شہناز ارشاد تو گنیمت لے کر آئیں۔ پڑھ پڑھ کر آسرواں تھے اور ان کے لیے اور باوصاحبہ کے لیے دھیر دھیر دعا لکھتی چلی گئیں۔ ریحانہ سعیدہ کی اپنی مٹی لا جواب کہانی تھی۔ بازگشت زبردست نصیحت اور سبق آموز رہی۔ ازالہ ابھی قاری کے لیے انمول کہانی تھی۔ منزل کے آخری سیرا میں انمول نصیحت تھی۔ طاہرہ جمیں تارا کا ناول واقعی شاہکار ادبی کہانی ثابت ہوا۔ اب جناب نوشاد عادل کی بساط لباط کی کہانی خوب صورت طریقے سے شروع ہوئی اور روانی سے واقعات کے انتہائی خوب صورت موڑ کے ساتھ تسلسل کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ ہر چیز واضح تھی۔ کوئی کسی قسم کی بے جا غلطی بھی نہ تھی۔ واقعات زبردست لڑی میں پروئے ہوئے موتیوں کی طرح بڑھتے چلے گئے اور قاری کہیں کہیں محسوس نہیں کرتا کہ کہانی میں یہاں جھول آ گیا ہے۔ مطمئن اور مزے کے ساتھ پڑھتے پڑھتے کہانی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ حالانکہ مصنف نے بڑے پیچیدہ اور اچھے ہوئے مرکزی خیال کو چنانچہ مگر زبردست پلاننگ اور ٹرینٹ دے کر اور بڑی محنت کر کے قارئین کو ایک انمول کہانی دی۔ نوشاد صاحب بے حد مبارک آواہ بھی منتظر ایسی شاہکار کہانیوں کا۔ باقی ہمارے بڑے بڑے پچھنے خان لکھنے والے اس کہانی کو بار بار پڑھیں اور کسی قسم کی اچھی باتوں کو اس میں پائیں گے۔ ذوق آگاہی سب بہترین تھا۔ خوش بوخن میں بھی اعلیٰ معیار رکھا گیا تھا۔ مگر شہناز صاحبہ اور ریحانہ صاحبہ بازی لے لیں۔ قیمت کے

حوالے سے عمر ان جی آپ کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ تمام احباب مجلس کو سلام و ادب۔ تفصیلاً تبصرہ اگلے ماہ۔ دونوں سلسلوں پر تبصرہ ادھر اور یہاں۔ روحانی مسائل کی خوب خدمت کر رہے ہیں۔

سید عبداللہ شاہد..... حیدر آباد اسلام علیکم ورحمہ اللہ علیکم۔ خدائے مطلق سے پر امید ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور میرے ہر اول رسالے نے اتنی ہی تمام وحدتوں، جہتوں اور فطرتوں کی بہتری اور خوشحالی کی غرض سے شاہ روز مصروف عمل ہوں گے۔ اللہ عزوجل آپ کی صحبت حقیقی اور تعلق داری کے فخر آمیز احساس کو تاحیات قائم رکھے اور آپ جیسے لحاظ خیال رکھنے والے غم گسار مدد ساز اور شفیق ناخدا کو رسول پر سلامت رکھے آمین۔ اس مرتبہ رسالہ پھر قدرے تاخیر سے ملا ہے 18 19 جنوری بھی کہ جب نئے افق کا تازہ پرچہ ہاتھ میں آیا حالانکہ پہلے 13 14 کو موصول ہو چکا تھا۔ ساتھ شاید کاغذ کی گرانی کی وجہ سے بروقت اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہے۔ دوم آپ نے رسالے کی قیمت میں بھی اضافہ نہیں کیا۔ یہ بات انشت بدنتاں والی ہے۔ بہر غرض رسالے کی بروقت اشاعت سے لکھاریوں اور قارئین کی دلی وابستگی ہوتی ہے اس لیے دعا گو ہوں اللہ عزوجل آپ کی مشکلات کو آسان فرمائے اور نئے افق اپنے ہم رسالوں میں اپنی پروقتاں بان اور اپنی شاندار وایتوں کے ساتھ تازہ و درخشاں آفتاب کی مانند جگمگاتا رہے آمین۔ اعزاز میں یہ کجاش اور سہولت نکالنے پر احسان مند ہوں۔ بھائی عمران احمد آپ کبھی آزمائش لینے والی ماں کا رویہ اختیار کر لیتے ہیں کہ بچہ جب تک بلک کر روئے گا کہیں اسے دودھ نہیں ملائے گی۔ کیا ایسے نکت جگر کو تکلیف سے روٹا دیکھ کر اسے تپ نہیں جاتی اور اسے راحت اور خوشی پہنچانے کے لیے اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتی۔ خدائے مطلق آپ کی محبتوں اور شفقتوں سے جڑے میرے دل کے مان سامان کو قائم و سلامت رکھے آمین۔ اب مجلس ادارت کے احباب کو جن میں محترم حسن اختر پریم صاحب جناب اقبال بھٹی صاحب جناب عمر اسرار صاحب محترم طاہر قریشی اور بھائی عفاں احمد کی خدمت میں تبدل سے سلام عرض کرتا ہوں اور ولادت رسول کے اس مبارک مہینے میں ایمانی محبت و عقیدت سے جلا چلائی اس سرتوں پر انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مزید میرے قبلہ و کعبہ محترم مشتاق احمد قریشی سے دعاؤں کی عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کہ بعض ایسے دقیق اور انجیل قسم کے مسائل مجھے بہت دُشرب کر دیتے ہیں۔ خدا کرے وہ ہندرتن ہی کبھی لیکن کسی طرح ختم تو ہوں۔ اس دفعہ کے تازہ شمار کا رنگا رنگ سرورق دیکھ کر بے اختیار پرشوش اور خوشگوار محسوس کر رہا ہوں۔ کبھی طعنی شہر کے اونچے اونچے شہریتوں پر کھڑی تفصیل اور پر اسرار رنگ و نور سے گنگائی محراب و طاقچے جس کو کوہ ایدے محسوس ہوئے۔ ان کے نیچے شہر میں داخل ہوئی اور عمارتوں کے ہیولوں سے گزرتی سڑک کا منظر دل و ذہن کو بہت گری کی وجہ پیش کرنے کی دعوت دے رہا تھا۔ دونوں طرف جس طرح تعمیر کی دیو قیامت عمارتیں استاد تھیں۔ وہ شاید قدیم برطانوی دور کا تعمیراتی شاہکار تھیں جو جا بجا اور جنگل مو شاگایوں اور پرت پر ت جالیوں کی وجہ سے بڑی بڑی دیو پیکل مشینوں کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ بھی عجیب اور بھاننت بھاننت کے سرورق دینے میں ہمارے ہر ولعزیز نے افق کا جواب نہیں۔ بہر خیر حاضر افو کھے آئینہ بے اور خوش رنگی کی وجہ سے سرورق پسند آیا۔ پھر پہلے آجکل کے تعارف پر اور بعد میں نئی فہرست پر نظر ڈالیں اور شامل اشاعت تحریروں کا سرسری جائزہ لیا۔ اس بار سبھی لکھاریوں میں بھی شاسا اور جانے پہچانے نام تھے اس لیے کا حقدور چسپی سے تحریروں کا مطالعہ کیا۔ مغربی انتخاب میں سے اب اقرا کے جناب طاہر قریشی اپنی عمدہ کہانیوں کے ساتھ شامل ہونے لگے ہیں اور منتخب ترجمہ کی قدر و قیمت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ پچھلی دفعہ ان کی ترجمہ کہانی ”دم رخصت“ میں کسی لڑکی کی نسبت یا عفتی کے تعلق پر دلچسپ توضیحات کو کردار و واقعات کی صورت میں پیش کیا گیا تھا کہ کہانی کا ڈراما سین پر بڑھ کر مزہ دو دیا۔ ہو گیا تھا۔ اس مرتبہ ”دہ کائنا“ لکرائے جوابی عورت کے قتل پر مشتمل جرم کی داستان تھی۔ جناب طاہر قریشی ناٹن اسٹوری بیان کرتے وقت لگتے ہی نہیں ہیں کہ وہ اقرا کے صفحات پر تفریح کو تفریح بیان کرنے والے بالکمال واعظ و مولف بھی ہیں اس لیے کچھ مختلف اور ہٹ کر لکھ رہے ہیں۔ دیگر مترجم میں شعبہ باز (قیاض لقمان) دوسرے پر اور انہونی (راحیلہ تاج) تیسرے نمبر پر دلچسپی کی حامل تحریریں رہیں۔ سچ بیانیوں میں سوٹ کرلز میں مقابلے کی خوشبو ناک میں چڑھی محسوس ہو رہی تھی۔ لاہور کی بڑی اور چھوٹی دونوں بہنیں ہمارے ادھر کی معروف لکھاری محترمہ شبنم بی کو چوت کرنے کے عزم و دعوئی سے پر تمکنت نظر آ رہی تھیں۔ کیا بات ہے گزرا کسی پر خاش خیک نہیں ہے۔ ویسے آپس میں پرفیشنل جلسی رکھنا تو حق بنتا ہے آپ خواتین رائٹرز کا اوہو ہو ہوا پ متیوں لڑکیاں تو مجھ پر لگائی بھائی کا الزام دے رہی ہیں بھی ستونے کتنی بڑی نیکی کی بات ہے کہ میرے سے مقابلہ بڑی کلیر کرنے سے اگر آپ تینوں میرا مطلب ہے کہ بھاننہ سعیدہ اور طاہرہ جہیں تارا اور ادھر کی معروف شبنم ارشاد ایسی شاہکار کہانیاں تخلیق کر ڈالیں گی جو اردو ادب کے لیے سرمایہ

ثابت ہوں تو اس سے بڑھ کر میرے لیے تو شہ آخرت کیا ہو سکتا ہے میری صائب رائے تو ویسے یہ ہے کہ قیوں کہانیاں ہیں۔ ان ظاہر و چھین تارا کی تحریر جس کا عنوان ”منزل“ تھا پہلے نمبر پر عمدہ کہانی کہلانے کی مستحق تھی۔ عرصے بعد تاجا کی طویل اسٹوری پڑھنے کو ملی تھی لیکن افسوس کہ وہ لکھتے وقت انصاف نہ کر سکیں گی مگر جناب خلاف توقع حیران ولا جواب ہو گیا ہوں منزل پڑھ کر۔ دوم اچھے اور سہل انداز تحریر نے ان کا ناول پڑھتے ہوئے پورے دوست نہیں ہونے دیا اور ان کی قلم کاری کا معترف ہو گیا ہوں۔ دوسرے نمبر پر شہنشاہ ارشد ریحانہ سعیدہ سے بازی جیت کر کامیاب و سرخرو ہو گئیں۔ لاریب بچیا شہناز بانو کے جج کی روداد کو شہنی نے عیش مصطفیٰ کے جذبہ جاودانی سے قلم بند کیا اور اس مقدس سرزمین پر گزراے شب و روز کو ان کی قدر و منزلت کے ساتھ پیش کرنے میں معتبر اور سرخرو ٹھہریں۔ یہ مبالغہ ہرگز نہیں ہے کہ ”سفر حجاز“ میں بچیا کا آقا تائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہار پر حاضری و سلام پیش کرنے کے واقعے کو پڑھتے ہوئے آنکھوں میں نمی اور لہجے میں رقت طاری ہو گئی تھی۔ اپنے نبی کے عشق میں مبتلا کوئی بھی دل یا رحمت اللعالمین کی ذات مقدس سے قربت کی تڑپ رکھنے والا کوئی بھی بندہ یا بندی ان کے روضے پر اپنے جذبوں کے تلاطم کو صبر و ضبط سے روک نہیں سکتا۔ اپنے محبوب کے روبرو ہر جو فراق کی صعوبتوں کو برداشت کرنے والا کوئی بھی عاشق کلمہ یا حقیر اور در ماندہ ہی ہوتا ہے۔ اس سفر شوق مصطفیٰ کو کوئی کمال سے لکھنے پر شہنشاہ ارشد کو میری طرف سے بہت بہت مبارک و یسے شہنی یہ نہایت سنجیدہ موضوع لکھنے میں کیونکر کامیاب ہو گئیں۔ پڑھنے کے بعد دل میں مان رہا تھا کہ ایسی بزرگ زمانت تم کتنے پردوں میں چھپا کر رکھتی ہو؟ عشق نبی پر کیونکر لکھ سکتی ہو؟ میری جانب سے ویڈیو تمہارے لیے شہنی تیسرے نمبر پر ریحانہ سعیدہ کی ”پنی مٹی“ حب الوطنی سے بے دار کرنی اچھی تحریر تھی۔ احسن اور علی دونوں بھائیوں سے ان کی بہن گل کی نوک جھونک گئے رشتوں کی لطافت اور خوب صورتی کا احساس دلا رہی تھی۔ یہ کہانی اچھی ہونے کے باوجود کچھ کم بھی بتاتی لگ رہی تھی کہ کامریا جانے کے بعد احسن انگریز لڑکی ڈیزی سے شادی کر لیتا ہے پھر وہاں کی بے راہ روی سے اور ڈیزی کی پھول کی اصلیت ظاہر ہونے پر وہ پھر پاکستان لوٹ آتا ہے۔ تو یہ وضاحت طلب پہلو تھا کہ امریکن لڑکیاں آتی آسانی اور جلدی اپنے اسیر شوہروں کو اپنے رائس معاف نہیں کرتیں اور ان کا دیوالیہ نکالے بغیر آؤ نہیں کرتیں۔ اس لیے ریحانہ سعیدہ نے غلت میں کہانی کو دواڑھی کے البٹو پر اختتام پذیر کیا۔ مرد رازشہز میں محترم ریاض بٹ کی ریگولر اسٹوری اسٹیج خالد سیریز کی نئی کہانی ”گمشدہ تھانے دار“ عقل و خرد کی دل آویزی کو بڑھائی معیاری کہانی تھی۔ بٹ صاحب کی بوچھی گئی پہلیاں تحقیق و تفتیش کے گلدرد کے لیے سوئے رہا کہ گا مڑ دے جانی ہیں۔ ادھر برادر میل جبار بھی شعبہ عدالت سے ایک دلچسپ کوٹ کہانی لکھ کر لائے تھے اور مقدمے کی یوٹو کیوڈ سے آگاہ کرتے ہوئے دل و ذہن کو صلوات میں دھواڑھ سے تھے کوٹ سیریز کی۔ اسٹوری ”ازالہ“ بھی ایک اچھی اور معلوماتی تحریر تھی خلیل جبار کو میری طرف سے سلام و مبارک باد۔ اس مرتبہ بزرگوار جناب طاہر قریشی صاحب اقرآ کے روشن قراطس پر توجہ اور رضایہ قضا کے موضوع پر 247 سے 248 حدیث تک دو تین لفظوں میں تنبیہ بیان کرتے ہوئے ایمانی جذبوں کو قوت و تازگی بخش رہے تھے۔ آپ نے سچی بات کہی کہ اللہ پاک کے نیک بندوں کے لیے حلال کا میدان تنگ نہیں ہوتا حتیٰ کہ وہ اس کا دست قدرت تمام نہ لے۔ بعد میں سلسلے وار ناول ”ملاؤ“ پڑھی۔ خورشید پیر زادہ نے اس بار آخری قطر خیر کر کے یہ پرچم ناول کا گانگس مکمل کیا تھا اور برباد شہنشاہ اور سنیاتی دیو کے ساتھ موصد یوں پرانے محبت کے افسانے کو جدید زمانے کے رومن کمار اور شیون دیوی کے ملاپ پر اختتام پذیر کیا اور اس سچائی کو پری فیز کیا کہ محبت میں جذبہ صادق ہو تو پہاڑ بھی سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور حاکمیت اور رعیت کا سازشیں سب دھری رہ جاتی ہیں۔ اب اگلے مہینے ان صفحات پر نئے ناول کا انتظار رہے گا۔ رسالے کا ناول نمبر دوم ”گردش“ بھی پڑھنے والوں کے ذوق اور تفریح میں خاصی اہمیت کا حامل ہے اور قارئین کی دلچسپی اور توجہ کا 65 سے 75 فیصد تقاضا پورا کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ بچیا شہناز بانو نے سلیوین قسط سے میڈم روزی عرف رومانہ کی داستان کا آغاز کیا تھا تو قدرے عجیب سے تفکر کا احساس ہوا تھا کہ وہ شہروز اور سرمئی کے قریب ہوتے انجام سے احتراز کرتے ہوئے کمرشل تھکنک میں مبتلا ہو گئی ہیں اور روزی کی کہانی کو طوالت دے کر ناول کو مزید کھینچ کر لمبا کرنا چاہتی ہیں لیکن بچیا نے تازہ اشارہ ہوس قسط میں بری فکر و سوچ کو یوں غلط ثابت کر دیا کہ روزی کی خرابا لود کہانی کو چھڑاتے ہوئے شہروز کے دیرینہ دوست گولی استاد کو بڑا دیکر لیا اور دونوں دوستوں کی جذباتی کیفیت کو مشترک لفظوں میں تحریر کیا اور شائق قلم سے دل جیت لیا۔ ان کے علاوہ گانگس پچاری (اے حمید) اور بساط (نوشاد عادل) بشرط فرحت رکھ چھوڑا ہے۔ اب محفل دوستوں سے گفتگو ہو جائے۔ سر براہز شہنشاہ کی ناز سلوش ڈشے کے لیے کہ اس دفعہ بھی انٹیلی جنس کو لگ صدائی کرسی پر براجمان نظر آ رہی تھیں۔ بہت مبارک ہو نازش کو سر تسلیم

تمہاری پہل کا معترف ہو گیا ہوں اور کرسی کا مزہ..... ہائے نازش! میں تو اس مزے کے لیے ترس گیا ہوں مگر بھائی عمران احمد میرے خط کو شاید اس قابل نہیں سمجھتے۔ نجانے پتھر تم کس ٹیک سے صرف نظر کرتے ہوئے تبصر لو کو سبیل بنجھو دیتے ہیں۔ اپنے ارض وطن پر تم نے بہت خلوص دل سے اظہار کیا، اچھا لگا، نازش کی تم یقین کرو گی کہ تمہاری طویل کہانی ”شہر آوار“ پڑھ کر بے حد غم زدہ ہو گیا تھا۔ روٹی کے محبت کے فلسفے داور کے قرب کی نارسائی کا احساس را دینے والا تھا۔ نارسا لوگ اس دکھ کے فصول تر ہونے سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں۔ میں رو رہا تو نہیں لیکن جرن و ملاں سے خود کو بہت رنجیدہ محسوس کرتا رہا پاورے بنتے بنتے اٹنی میں پہلے ناول پر چھین میری جانب سے بہت مبارک باد اور تم کم قفل نہیں بلکہ صاف ستھرے دل کی مالک ہو۔ میری دعائیں اور نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں نازش ریاض بٹ آپ کی دعاؤں سے اچھا ہوں گا آپ نے وحشی پرارے نہیں دی۔ اس لیے افسوس ہوا پسند کرنے کا شکر ہے۔ برادر ریاض حسین قمر تبصر پسند کرنے کا شکر ہے۔ آپ کی غزل اس مرتبہ بھی لا جواب رہی ہے لیکن بھائی جناب فلسفہ اقبال کے علاوہ کبھی فکر مگر نہ برے گھوڑے کام میں لائے۔ عمیق فلسفہ آرا چاہی ہوتا ہے۔ اس لیے تنوع اور تبدیلی سے زندہ ولی میسر آ جاتی ہے یا پھر گیت نگاری کی طرف آ جائے۔ ایک سے بھلے دو ہو جائیں گے مجاہد ناز عباسی اس بار تمہاری غزل پچھلی سے بہتر اور خوب ہے۔ محنت اور مطالعہ ہی تحقیق کا آئینہ گردانا جاتا ہے اور تمہارے اشعار سے یہ جھلک رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ابن مقبول صدیقی آپ نے ترقی کے زینے کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے لیے اور گیت کی تعریف کرنے کا شکر ہے۔ ریزوگراف فقیہ محمد بخش لنگاہ اور انجم فاروق ساحلی یاد آوری اور تبصرہ پسند کرنے کا بہت بہت شکر ہے۔ خوش بوخن میں ریحانہ عبیدہ کی آزاد نظم ”عورت کہانی“، حقوق نسواں پر عمدہ کھٹار ہے۔ شبنی ارشاد کی نظم ”ہفتان“ پڑھ کر کھنکھ میں مبتلا ہو گیا ہوں تھوڑے لحاظ حروت میں مسکرا دینے سے بہت کچھ ہو جاتا ہے شبنی جی.....! والسلام

ایض حسین قمر..... منگا خیم لائق صدا احترام جناب عمران احمد صاحب اور فقہ الاسلام علیہ رحمۃ اللہ امید واقع ہے کہ مزاج کرامی، بخیر ہوں گے۔ ماہ فوری کا نئے افق پیش نظر ہے۔ ناٹھل مصور نے افق کا ایک شاہکار ہے۔ دستک میں کرم مشتاق احمد قریشی صاحب ایک اہم مسئلہ پر اپنے قیمتی خیالات کے کثر تشریف لائے۔ آپ ہر بار کوئی نئی کوئی اہم بات ہمیں سمجھانے کی کوشش فرماتے ہیں مگر ہم جیسے کوٹھ مغزوں کو کوئی بات بھی سمجھ نہیں آتی۔ ہماری اپنی ایک ڈگر ہے جس پر چلنا ہی ہم اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں۔ قرآن ہی تو دور کی بات ہے ہم قرآن خوانی گوارا نہیں کرتے۔ ہمارے دلوں سے خوف خدا نکل گیا ہے۔ یہی بات تمام برائیوں کا باعث بنی ہوئی ہے۔ عصر حاضر میں کی کو اچھی بات بتانا بیٹھیں گے مگر عین بجانے کے برابر ہے۔ خداوند قدوس ہمیں سمجھ عطا فرمائے اور ہم مسلمانوں کو اپنا مقام و مرتبہ پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ گفتگو کے شروع میں آپ نے جو حدیث مبارکہ بیان فرمائی ہے وہ ان امام حضرات کے لیے ایک سبق ہے جو جماعت میں نماز کو مبارک اپنی شان سمجھتے ہیں گفتگو میں اس بار بھی کرمی صدارت ناز سلوش ڈشے کے حصے میں آئی۔ وہ کرمی صدارت پر براجمان ہونے کا گر جاتی ہیں۔ میرا پوسٹل ایڈریس ہے مکان نمبر C-3/3 ایفٹ بنک کالونی منگا ڈیم آپ ہم پرانی فرما کر اس ایڈریس پر اپنے پیغام کا شمار ما شا اللہ بھتہ اچھے لکھار میں ہوتا معلومات بھیج دیجیے شکر گزار ہوں گا۔ محترم ریاض بٹ صاحب یا دفرمائی کا شکریہ آپ کا شمار ما شا اللہ بھتہ اچھے لکھار میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نظر بید سے بجائے اس بار بھی آپ کی کہانی کشمہ تھانے دار خوب رہی۔ مجاہد ناز عباسی صاحب کے خط کی ابتداء بہت اچھی تھی۔ مجاہد بھائی آپ کی شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ خالصتاً خلوص نیت سے لکھا مقصد اصلاح کے علاوہ کچھ نہیں۔ شاعری کا حسن و زن برابر ہونا ہے ورنہ وہ تک بند کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی شاعری میں مزید نکھار پیدا فرمائے آمین۔ لائق صدا احترام جناب متبول کا یاد احمد قیمتی حسب روایت بھر پور تبصرے کے ساتھ تشریف لائے ہیں وہ تقریباً ہر تحریر کا پوسٹ مارٹم کر دیتے ہیں اور لکھاری کو پر خلوص مشوروں سے نوازتے ہیں۔ مثبت تنقید بلا مشرفن کو مزید نکھارنے کا باعث ہوتی ہے۔ صدیقی بھیا آپ کے بیٹے کا انجینئرنگ میجر کے عہدے پر فائز ہونا بہت ہی مبارک ہے خداوند کریم آپ کی طرح سب کی آنکھوں کو اودا کی طرف سے ٹھنڈا رکھے آمین۔ محترم مغل پسند فرمانے پر آپ کا بے حد شکر گزار ہوں آپ پرچے پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ فرماتے ہیں جو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ انجم فاطمہ قاسمی صاحب اپنے نئی خط میں بھی کچھ نہ کچھ لکھ گئے۔ وہ دراصل معروف لکھاری ہیں جانے ایک ماہ میں کئی کہانیوں کی انشاپلکھی ہوئی ہوں گی۔ پھر بھی محفل میں تشریف لائے شکریہ۔ سید محمد عبداللہ شاہد صاحب نے اپنے بہنوئی کے انتقال پر ملال کی خبر سنا کر ماحول کو گواہ کر دیا۔ سید عبداللہ شاہد صاحب یہی مشیت ایزدی ہے اس سے بڑا جو دنیا میں کوئی

نہیں کہ ہر ذی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ خدا نے ہر آدمی کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور سب پرساندگان کو صبر جمیل اور اس پر اجر عظیم عطا فرمائے آمین۔ آپ نے جس طرح میری شاعری پر اپنی رائے دی ہے اس کے لیے صدمنوں ہوں اس طرح اگر محنت رنگ لائے تو یقیناً ہمت بڑھتی ہے اور مزید اچھا لکھنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اپنی قیمتی آراء سے نوازتے رہا کریں۔ میرے گزشتہ خط میں آپ کا ذکر نہیں ہوا۔ ایسا نادانستہ طور پر ہوا۔ اس سے آپ کا دل دکھایا اس کے لیے دل کی گہرائیوں سے حذرت خواہ ہوں۔ میں کسی بھی انسان کا دل دکھانا بہت بڑا گناہ سمجھتا ہوں۔ باقی میرے عزیز ترین دوست سید عبداللہ شاہد مجھ سے سہواً جو خطا ہوئی اسے معاف فرما دیں شکریہ۔ فقیر محمد بخش صاحب رازگاہ صاحب اپنے مخصوص انداز کا خط لے رونق افروز ہوئے میرے اندازے کے مطابق وہ نئے افق کے تمام قارئین سے بے حد پیار کرنے والے انسان ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت تندرستی اور عمر دراز عطا فرمائے آمین۔ اقرا میں محترم طاہر قریشی صاحب نے جس پیارے انداز میں توکل اور رضا با لکھنا کو پیاری پیاری احادیث کی روشنی میں بیان فرمایا ہے وہ دل میں اتر گئی ہے۔ خداوند کریم ہمیں اپنے پیارے حبیب کی پیاری پیاری احادیث پر عمل پیرا ہونے کی توفیق بخشے تاکہ آخرت کا کچھ تو شر تو ہمارے لیے ہو۔ روحانی مسائل کا پروگرام بہت ہی پیارا اور خلق خدا کی بھلائی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ حافظ شمیم احمد صاحب کو عزم و حوصلہ اور ہمت عطا فرمائے اور اس پروگرام کو جاری رکھنے کے لیے استقامت بخشے آمین۔ خوشبوئے سخن دن بدن نکھرتا جا رہا ہے۔ یہ جناب عراسر صاحب کی محنت شاقہ کا ثمر ہے اس بار کا تب صاحب نے بھی کوئی غلطی نہیں کی۔ اس ماہ کے انتخاب میں اپنی ارشاد کی نظم اور پیرایہ عیدہ صاحب کی عورت کہانی سید عبداللہ شاہد کا گیت خوب رہیں غزلوں میں مضم علی آغا عصمت اقبال عین سیح جمال قدیر انام محمد انکم جاوید جناب واجد کینودی اور صلاح الدین صاحب کی غزلیں خوب ہیں۔ جناب وسیم اختر کو شاعری میں ابھی کافی محنت کی ضرورت ہے۔ جناب مجاہد ناز عباسی صاحب اس بار کلام پہلے سے بہت بہتر تھا۔ شاعری میں سخت محنت درکار ہوتی ہے۔ محترم محمد بخش صاحب رازگاہ صاحب کی شاعری ہم سب قارئین کے لیے لکھی گئی محسوس ہوتی تھی۔ محمد شفاعت حسین کی منتخب غزل بہت خوب تھی۔ بس اصل شاعر کے نام کی کمی تھی۔ ذوق آگئی کا سارا انتخاب خوب تھا۔ باقی گردش کی قطع بہت خوب رہی۔ محترم شہناز بانو کو دلی مبارکباد۔ محترم عمران صاحب اب آتا ہوں ایک اہم مسئلہ کی طرف کچھ عرصہ سے اٹنے افق کے دو معزز قارئین میں کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اور وہ گفتگو کے ذریعے ایک دوسرے پر جویش مارتے رہتے ہیں۔ میری مراد محترم مقبول احمد جاوید صدیقی صاحب اور سید محمد عبداللہ شاہد سے ہے۔ بنیادی طور پر بات معمولی نوعیت کی ہوئی ہوگی جو آگے بڑھ گئی۔ اگرچہ سید عبداللہ شاہد نے محترم شہناز بانو صاحبہ کے سمجھانے پر سیز فرائز کیا ہوا ہے مگر جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ دیکھیں ہم سب نے اپنی اپنی ہیں جو محترم و مکرم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب کی سربراہی میں ہیں۔ اس میں چھوٹے بچے ہیں اور بڑے بھی۔ چھوٹوں کو بڑوں کی تعظیم کرنی چاہیے اور بڑوں کو چھوٹوں پر شفقت کرنی چاہیے بھی ایک اچھا معاشرہ جنم لیتا ہے پھر لکھاری تو عام ڈوگر سے بہت کم ہوتا ہے۔ اس کی باقی صفات اسے علاوہ اسے وسیع القلب ہونا چاہیے بروابط علیہ اور منکر ابو اراج ہونا چاہیے۔ اس کا دل حسد کینہ اور بغض سے پاک ہونا چاہیے تب وہ ایک اچھا لکھاری ہو سکتا ہے۔ بات کو طویل نہیں کروں گا میری دونوں معزز بھائیوں سے دست بستہ گزارش ہے کہ وہ اپنی ساری رنجشیں بھلا کر دل صاف کریں اور قلمی طور پر بغل گیر ہوں کہ اللہ تعالیٰ صلح جو لوگوں کو پسند فرماتا ہے۔ خدا نے ذوالجلال اس عمل پر دونوں کو بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ یہ بات میں نے پورے مان سے کہی ہے امید ہے دونوں برادر میرا مان نہیں توڑیں گے۔

شجاع جعفری..... تلہ گنگ۔ اسلام علیہ کم! میں آپ کا جریدہ ”نئے افق“ کئی عمر سے پڑھ رہا ہوں۔ اس کے تمام راز و میرے بیٹے میں اور بہت اچھا لگتے ہیں۔ کیا میں بھی آپ کے جریدے میں لکھ سکتا ہوں۔ جواب ضرور دیجیے گا اللہ نے نئے افق کو مزید ترقی عطا فرمائے گا آمین۔

سرور شاد، زویہ شاد..... منجن آباد۔ 4 سال کے بعد ہمارے گھر بنایا ہوا ہے۔ ہم اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے آپ سب کو خوشخبری اس لیے سنا رہا ہوں کہ آپ بھی ہماری خوشی میں شریک ہوں۔



اقلہ

ترتیب: ظاہر قریشی

توکل اور رضا بالقضا۔

(تشریح) اللہ کے فیصلہ اور اس کی تقدیر سے بعض اوقات بندہ پر ایسے حالات آتے ہیں جو اس کی طبیعت اور چاہت کے خلاف ہوتے ہیں ایسے موقع پر بندہ کی سعادت اور نیک بختی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو عظیم کل اور حکیم مطلق اور رؤف یا العباد یقین کرتے ہوئے اس کے فیصلہ پر راضی رہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔ ”.....“ (ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو برا سمجھو اور حقیقت اور انجام کے لحاظ سے اس میں تمہارے لیے بہتری ہو اور اسی طرح ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور چاہو اور حقیقت اور انجام کے لحاظ سے اس میں تمہارے لیے برائی اور خرابی ہو، علم حقیقی صرف اللہ کو ہے اور تم بے خبر ہو۔)

دوسری بات اس حدیث میں یہ فرمائی گئی ہے کہ بندہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے برابر یہ دعا کرتا رہے کہ اس کے نزدیک بندہ کے لیے جو چیز ہو اسی کا اس کے لیے فیصلہ کیا جائے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ بندہ کا اپنے لیے اللہ تعالیٰ سے خیر نہ مانگنا بندہ کی بڑی بد نصیبی اور بد بختی ہے۔ اسی طرح یہ بھی بد بختی اور بد نصیبی ہے کہ بندہ اللہ کی قضاء و قدر اور اس کے فیصلوں سے ناخوش اور ناراض ہو۔

ظاہر ہے کہ ”رضا بالقضا“ کا یہ مقام بندہ کو جب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی ان صفات کمال و جمال پر پورا پورا ایمان و یقین حاصل ہو جو قرآن مجید نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائی ہیں اور پھر اس معرفت اور اس ایمان و یقین کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی محبت اس کے دل میں رچ بس گئی ہو..... ایمان و محبت کے اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد بندہ کے دل کی صدایہ ہوتی ہے۔ زندہ کنی عطائے تو دور بخشی فدائے تو..... دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اخلاص وللمہیت اور نام و نمود!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانی دنیا کو اخلاق حسنہ کی جو تعلیم و ہدایت ملی ہے اس عاجز کے نزدیک اس کی تکمیل اخلاص وللمہیت کی تعلیم سے ہوتی ہے یعنی اخلاص وللمہیت کتاب اخلاق کا آخری پیمانی سبق اور روحانی و اخلاقی بلندی کا آخری زینہ ہے۔

اس اخلاص وللمہیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر اچھا کام یا کسی کے ساتھ اچھا برتاؤ صرف اس لیے اور اس نیت سے کیا جائے کہ ہمارا خالق و پروردگار ہم سے راضی ہو ہم پر رحمت فرمائے اور اس کی ناراضی اور غضب سے ہم محفوظ رہیں..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ تمام اچھے اعمال و اخلاق کی روح اور جان یہی اخلاص نیت ہے۔ اگر بظاہر اچھے سے اچھے اعمال اخلاق سے خالی ہوں اور ان کا مقصد رضاء الہی نہ ہو بلکہ نام و نمود یا اور کوئی ایسا ہی جذبہ ان کا محرک اور باعث ہو تو اللہ کے نزدیک ان کو کوئی قیمت نہیں اور ان پر کوئی ثواب ملنے والا نہیں..... اسی کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے

کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کا ثواب جو اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کا اصل صلہ اور نتیجہ ہے اور جو انسانوں کا اصل مطلوب و مقصود ہونا چاہئے وہ صرف اعمال و اخلاق پر نہیں ملتا بلکہ جب ملتا ہے جبکہ ان اعمال و اخلاق سے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور آخری ثواب کا ارادہ بھی کیا گیا ہو اور وہی ان کے لیے اصل محرک ہو..... اور ایسا ہی ہونا بھی چاہئے اپنے معاملات میں خود ہمارا بھی یہی اصول ہے..... فرض کیجئے کوئی شخص آپ کی بڑی خدمت کرتا ہے آپ کو ہر طرح آرام پہنچانے اور خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن پھر کسی ذریعہ سے آپ کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے آپ کے ساتھ کوئی خلوص نہیں ہے بلکہ اس کا یہ برتاؤ اپنی فلاح ذاتی غرض کے لیے ہے یا آپ کے کسی دوست یا عزیز قریب سے وہ اپنا کوئی کام نکالنا چاہتا ہے اور صرف اس کے دکھاوے کے لیے آپ کے ساتھ اس کا یہ برتاؤ ہے تو پھر آپ کے دل میں اس کی اور اس کے اس برتاؤ کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ بس یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کا ہے فرق اتنا ہے کہ ہم دوسروں کے دلوں کا حال نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ سب کے دلوں اور ان کی نیتوں کا حال جانتا ہے پس اس کے جن بندوں کا یہ حال ہے کہ وہ اس کی خوشنودی اور رحمت کی طلب میں اچھے اعمال کرتے ہیں وہ ان کے ان اعمال کو قبول کر کے ان سے راضی ہوتا اور ان پر رحمتیں نازل کرتا ہے اور آخرت جو دارالجزا ہے اس میں اس کی اس رضا اور رحمت کا پورا ظہور ہوگا..... اور جو لوگ اچھے اعمال و اخلاق کا مظاہرہ دنیا والوں کی داد و تحسین اور نیک نامی و شہرت طلبی کے لیے یا ایسے ہی دوسرے اغراض و مقاصد کے لیے کرتے ہیں ان کو یہ دوسرے مقاصد چاہے دنیا میں حاصل ہو جائیں لیکن وہ اللہ کی رضا اور رحمت سے محروم رہیں گے اور ان کی اس محرومی کا پورا پورا ظہور بھی آخرت ہی میں ہوگا۔

اس باب میں اصل بنیاد تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث۔ ”انما الاعمال بالنیات“ الحدیث:- ہے اس سلسلہ کی دوسری چند حدیثیں یہاں درج کی جا رہی ہیں اور ان ہی حدیثوں پر یہ جلد دو ختم ہو رہی ہے۔

(۲۴۹)

(ترجمہ) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:- اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا، لیکن تمہارے دلوں اور تمہارے عملوں کو دیکھتا ہے۔“

(صحیح مسلم)

(بشکر یہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانی)



جدلیاتی تجزیہ ہے کہ اگر کسی قوم کو غلام بنانا ہے تو اس سے اس کی زبان اور تاریخ چھین لو وہ قوم خود بخود جہالت کے اندھیروں میں گم ہو جائے گی اس کی زندہ مثال ہمارا ملک ہے۔ جہاں ذریعہ تعلیم زبردستی انگریزی بنایا جا رہا ہے یوں ہماری 85 فیصد سے زائد آبادی جو دیہات میں بستی ہے اور مقامی زبانیں یا پھر زیادہ سے زیادہ اردو زبان بولتی ہے تعلیم سے دور ہو کر ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ اس کے برعکس ترکی، انڈیا، چین، جاپان، روس اور دیگر ممالک نے اپنی زبانوں کو فروغ دے کر ترقی کی منزلوں پر منزلیں طے کر کے خلاؤں کو تسخیر کرنا شروع کر دیا ہے۔

زیر نظر کہانی دہلی کے کرخنداروں کی زبان میں ہے اس میں جو چاشنی اور حلاوت ہے اسے انسان صرف محسوس کر سکتا ہے یہ ہمارا المیہ ہے کہ آج کی نسل مقامی بولیوں سے بے بہرہ اور ناواقف ہے۔ ہم نے اپنی تہذیب کو زندہ رکھنے کی ایک کوشش کے طور پر محترم مشتاق احمد قریشی سے زبردستی یہ تحریر لکھوائی ہے آپ اس مٹی ہوئی تہذیب کے ایک نمائندہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم نے ان سے ضد کی تھی درخواست نہیں کہ وہ اس باغ و بہار تہذیب سے پاکستان کی نئی نسل کو روشناس کرائیں تاکہ انہیں علم ہو سکے کہ ہمارے بزرگ کس حال اور رنگ میں زندگی گزارتے رہے ہیں۔ مشتاق احمد قریشی نے افق گروپ آف پبلی کیشنز کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور آج ان کا تمام تر وقت اور توانائیاں دینی کتب خاص طور پر آیات قرآنی کی تفاسیر پر صرف ہوتا ہے۔ امید ہے وہ نئی نسل کے لیے ہر ماہ چند صفحات لکھنے کی کوشش ضرور کریں گے۔

ادارہ

چچا چرائی

مشتاق احمد قریشی

اپنی بولی ٹھولی نہیں بھولے۔ بھائی کریم الزماں کا دہلی میں سرمہ دانی بنانے کا کارخانہ ہے۔ پہلے چھوٹے ہی انہوں نے ایک موٹی سی ماں کی گالی کا نعم البدل اے ماں کے گھوٹے اب تک کیا کر ریا تھا۔ اتنی دیر سے فون ملا ریا ہوں۔ بات کرنے کی کوشش کر ریا ہوں ابے پاکستانیوں کی ٹیم کرکٹ کھیلنے کو ہماری طرف آئی تھی تو سالے تمہیں موت آئی تھی کہ تم ہمیں آئے آ جاتے تو مزہ آ جاتا اب تم کرکٹ دیکھتے اور ہم تمہیں دیکھتے اب تم پاکستانیوں نے اپنے ان..... پھوں کو کیا کھلا کر بھیجا ہے کہ ہمارے والوں کے سارے جنسز مٹر ٹھپ ہو کر رہ گئے مجھے دو ہزار کی ڈز لگ گئی میں نے بھی پاکستان کے ہارنے پر رقم لگا دی

تھی وہ سالہا ہندوینیہ کا لونڈا پاکستان کے ہارنے اور انڈیا کے جیتنے پر ایک کے پندرہ دے ریا تھا اور پاکستان کی جیت پر پانچ کا بھاؤ لگا ریا تھا اس لیے سب نے ہی ایک کے پندرہ پر پیسہ لگا دیا اور سب کا سکہ ڈوب گیا پیسے کا لونڈا بڑا ہشیار نکلا۔ اب کے دیکھو پاکستان والوں کی ریڑھ اگر انڈیا والوں نے نہ لگائی تو میں تو ان کے منہ پر تھوک دوں گا آخ تھو۔ اس آواز کے ساتھ ہی ایسا محسوس ہوا کہ کرخندار نے واقعی ابھی سے اپنے تصور میں ہندوستانی ٹیم پر تھوک دیا ہو ویسے بھی کرخندار کو دو ہزار روپے نقد کی چوٹ پڑ چکی تھی۔ نہ جانے ایسے کتنے لوگ ہوں گے جن کی رقم سٹے کی نذر ہو گئی ہوگی اور مزید ہونے کے لیے ان کی جیبوں میں تڑپ رہی ہوگی۔ کیونکہ ابھی کی بیچ ہونا ہیں ابھی ہم اتنا ہی سوچ پائے تھے کہ دوسری جانب سے ایک گرج دار کرکٹ دار ہم گالی سننے کو ملی ابے سن ریا ہے کہ ہمیں میں فضول میں بک بک کیے جا ریا ہوں۔ ابے اب بھی موقع ہے جا سنگ ساتھ چل کر کرکٹ کا میچ دیکھ لیں گے اور ان حرامی سٹے بازوں کو پیسا دینے کی جگہ کرکٹ والوں کو ہی دے دیں گے اور میچ کا میچ بھی اپنی آنکھوں سے سالے دیکھ لیں گے دیے یہ سالے انڈین کھلاڑی بھی بڑے اپنی اماں کے خصم ہیں یہ بھی سالے سٹے کھیلے ہیں اور سٹے والوں سے بڑا بڑا مال بٹورتے ہیں۔ وہ الگ منافع ہوتا ہے خوب چٹونا لگاتے ہیں دونوں طرف سے مال پیٹتے



نوشاد عادل

ایک آشفہ سر کا احوال، حالات اور قانون نے اسے اپنی سگی بہن کا قابل قرار دے دیا تھا اور وہ قاتلوں کی تلاش کے لیے قانون سے چھٹا پھر رہا تھا۔ اس کے ایک طرف کھائی تھی تو دوسری طرف موت اور اس کے مقابلے میں اس کے پاس سوائے عزم کے اور کچھ نہ تھا۔

قدم قدم ہنگامے لمحہ لمحہ موت کی آہٹ کے لیے ایک پرچس طویل نادل

کسی کے زور زور سے ہانپنے کی آواز آرہی تھی۔ اپنے کتوں کے ساتھ اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ اس کوئی بہت ہی تیزی سے ہانپنے جا رہا تھا اور آواز دور سے دھیرے دھیرے نزدیک آتی سنا دیے رہی تھی پھر اس ہانپتی آواز کے پیچھے کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی سنا دیے گئی۔ اور جیسے جیسے اس ہانپنے کی آواز زیادہ نزدیک آتی گئی تو کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی قریب سنا دیے گئی تھی اور اب تو قدموں کے دوڑنے کی آوازیں بھی سنا دیے رہی تھیں۔

وہ ایک بہت ہی گھنا جنگل تھا جس کے بیچ کوئی بہت ہی تیزی کے ساتھ دوڑے جا رہا تھا اور کتے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ ان کتوں کے گلے میں پٹے تھے اور چین بھی اور اس چین کے دوسرے سرے پر پولیس والے تھے، جنہیں کتے کھینچے جا رہے تھے۔ کتے اتنے جوش میں تھے کہ ان پولیس والوں سے سنبھالے نہیں سنبھل رہے تھے۔ ان میں سے کئی سپاہی کتوں کو سنبھالنے کے چکر میں زمین پر گر بھی چکے تھے ان کے گرنے پر کتے رکنے کی بجائے انہیں کھینچے ہی چلے جا رہے تھے۔ منظر کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے سپاہی کوئی چور ہے اور کتا اسے پکڑ کر تھانے لے جا رہا ہو۔

اس گھنے جنگل کے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گزرتے ہوئے، اونچی پٹی زمین کے فاصلے طے کرتے ہوئے ایک نوجوان بھاگے جا رہا تھا اور پولیس

یہ جنگل کوئی دوسوا کیلڑ زمین پر پھیلا ہوا تھا۔ اب اتنے بڑے اور گھنے جنگل میں کتنی دیر تک کوئی دوڑ سکتا ہے بھلا۔ پھر کچھ دیر بعد ایک ہیلی کاپٹر کی آواز بھی سنا دیے گئی کچھ دوری پر۔ جولو جوان دوڑ رہا تھا۔ وہ پسینہ پسینہ تو ہو ہی چکا تھا۔ اس نے اپنا سر اوپر کی طرف اٹھا کر ہیلی کاپٹر کی آواز کی طرف نظر دوڑائی، مگر درختوں کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آیا۔ پھر بھی ہیلی کاپٹر کی آواز ہر لمحے قریب سے قریب تر ہو رہی تھی۔ نوجوان کچھ گھبرا گیا اور خود سے بڑبڑا کر مخاطب ہونے لگا۔ ”گلتا ہے اب بچنا مشکل ہے۔“ وہ ایک اونچائی سے نیچے کی طرف دوڑ رہا تھا اس وقت جب ہیلی کاپٹر اچانک اس کی پشت سے نمودار ہو کر تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا اور کوئی آدھے میل تک جا کر دوبارہ مڑ کر اس کی طرف پلٹا۔ وہ نوجوان رک گیا اور آگے پیچھے دیکھنے کے بعد اچانک اس نے چھلانگ لگا دی۔ اس کے سامنے ایک بہت ہی بڑی ندی تھی اور اس نے اتنی اونچائی سے چھلانگ لگائی جیسے اس کا ارادہ خود کشی کرنے کا ہو۔ تب ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے اپنے ہیڈ سیٹ میں کہا۔ ”وہ ندی میں چھلانگ لگا چکا ہے اور میرے لیے اسے دیکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ کیونکہ درختوں کی وجہ سے ندی کی سیدھ میں ہیلی کاپٹر اڑانا ناممکن اور خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔“

پائلٹ کی بات سن کے کتوں کو پینڈل کرنے والے سپاہیوں کے لیڈر نے زور سے چلا کر آواز لگائی ”کتوں کو چھوڑ دیا جائے۔“ وہ نوجوان اس ندی کے گہرے اور خطرناک انداز سے بہتے پانی میں گرنے سے پہلے ایک پیڑ کی شاخوں پر گر کر اور اونچائی سے گرنے اور اپنے وزن کی وجہ سے ان شاخوں کو توڑتا ہوا ایک کے بعد ایک شاخ کو توڑتے اور اپنے جسم پر کئی زخم لیتے ہوئے

آخر پانی میں جا کر اور تیزی سے اتنی گہرائی میں اتر گیا کہ اوپر سے نظر آنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ کتے غراتے ہوئے اس کے پسینے کی بو کو سونگھتے ہوئے وہاں تک پہنچ گئے جہاں سے وہ پانی میں کودا تھا۔ ان میں سے ایک جرمن شپہر ڈو تو وہیں رک گیا جبکہ ڈو برین اندھا دھند کو بڑے اور روٹ ویلرز کے ساتھ موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اور جرمن شپہر ڈو کے علاوہ ایک بھی کتا نہیں بچا جو ندی کی طرف دیکھتے ہوئے بھونکے جا رہا تھا۔ جب پولیس کے سپاہی وہاں پہنچے تو وہ اپنے قیمتی کتے گنوا چکے تھے۔ وہ لاچار ایک دوسرے کی جانب دیکھتے ہوئے کتوں کی طرح ہی ہانپ رہے تھے۔

وہ نوجوان جو جان کی پروا کیے بغیر ندی میں کود پڑا تھا، اس کا نام وقاص تھا۔ اینوں کے لیے وہ کی۔ مضبوط ہینڈسم، طاقتور، نیک، ایمان دار لڑکا..... مگر ہوا کیا..... پولیس اس کے پیچھے کیوں بڑی تھی اور وہ بھی کتوں اور ہیلی کاپٹر کی مدد لے کر..... آخر اس نے ایسا کیا کیا تھا..... کیا جرم کیا تھا اس نے؟

☆☆☆

پولیس اسٹیشن میں ڈی ایس پی چنگیزی اپنے آفیسروں کو ڈانٹ کر اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک ایک کے سامنے کھڑے ہو کر سرخ ہوئی آنکھوں سے کچھ نہ کچھ کہے جا رہا تھا اور سب آفیسر سر جھکائے اسکول کے بچوں کی طرح زمین تک رہے تھے۔

پھر ڈی ایس پی اونچی آواز میں سب سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیا کیا جائے تم لوگوں کا.....؟ اچار ڈالا جائے..... تم سب نکلے ہو..... ایک آدی نوٹیں سنبھال پائے تم لوگ..... کیسے بھاگ گیا وہ.....؟ اس کے ہاتھوں میں پتھری کیوں نہیں پہنائی گئی تھی؟“

مصاحبات

☆ ملک ترکی کے عوام بانی اسلامی جمہوریہ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کو ملک پاکستان کا اترک سمجھتے ہیں۔

☆ مشہور پختون لیڈر خان عبدالغفار خان نے 1988ء میں اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔

☆ 18 مئی 1989ء کو ملک برما کا نام بدل کر ”میا نمار“ رکھا گیا تھا۔

☆ تھامس ہنفرس امریکا کے تیسرے صدر تھے۔

☆ جاپان کی کرنسی ”ین“ کہلاتی ہے۔

☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام ملک عراق میں پیدا ہوئے تھے۔

☆ مولانا ظفر علی خان کے والد مولوی سراج الدین نے روزنامہ زمین دار جاری کیا تھا۔

☆ اردو زبان کے ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض کے مجموعہ کلام کا نام ”نقش فریادی“ ہے۔

☆ مشہور مورخ مولانا یحییٰ نعمانی ہندوستان کے مشہور شہر اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔

☆ اردو کے مشہور ناول نگار اور ادیب عبدالحلیم شرر 1860ء میں پیدا ہوئے تھے۔

☆ جاپان کے بادشاہ کی رہائش گاہ کا نام کیو جی Kyog ہے۔

☆ اردو میں تمبر نگاری کا آغاز رسالہ ”تہذیب الاخلاق“ سے ہوا تھا۔

☆ بچہ Scorpion کا ڈنک اگر شراب کے ایک قطرے سے بھی چھو جائے تو بچہ فوراً مر جاتا ہے۔

☆ فارسی زبان کے عظیم شاعر حافظ شیرازی کا اصل نام شمس الدین محمد ہے۔

☆ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے موجودہ وزیر داخلہ رحمان ملک ہیں۔

☆ ایران کا پرانا نام ”فارس“ تھا۔

☆ جزیرہ مالدیپ کا دارالحکومت مالے ہے۔

☆ عوامی جمہوریہ چین کا شہر شہر عدنی ہے۔

☆ پروفیسر ڈاکٹر سید واجد گیلانی کراچی

آیا۔ وہ وقت جس مقام پر ہوا وہاں صرف پرندے ہی آسکتے تھے کسی اور کا آنا یا نیلی کا پٹر کا یہاں پرواز کرنا ناممکن ہی تھا۔

وکی کو شعور کی طرف آتے ہی بانیں کندھے پر درو کی ایک لہری محسوس ہوئی۔ اس نے دیکھا ایک شاخ کی لکڑی ٹوٹ کر اس کے کندھے میں پیوست ہو چکی تھی اور کافی گوشت لٹک آیا تھا۔ خون بھی کافی بہہ چکا تھا اور اسے حد سے زیادہ فقاہت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس حالت میں بھی وکی کو پتا تھا کہ ہمت ہارنے کا مطلب خود کو ہارنا ہے۔ اس لیے وہ تمام زور لگا کر آہٹار کے ایک طرف سے آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ اسے اور نیچے چلا جانا چاہیے تاکہ کسی کو وہاں اس کی موجودگی کا شک بھی نہ ہو اور کوئی اسے ڈھونڈنے بھی نہ آ پائے۔ پہاڑی سے تین سو فٹ اور پھر یہاں سے سو فٹ نیچے آہٹار ہو کوئی سوچے گا کہ مر ہی گیا ہوگا۔

دو گھنٹے کی جدوجہد کے بعد وکی نیچا پہنچا، جہاں آہٹار دوسری ندی میں گر رہا تھا۔ اس طرف اتنا گھٹنا جنگل نہیں تھا، بلکہ دوسری طرف صاف صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ وکی ندی سے باہر نکلا اور ایک ہاتھ کو کندھے پر دباتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ کہتے ہیں ناکہ جب جان پر بن آئے تو ہر مشکل کا سامنا کرنے کے لیے عجیب سی طاقت آ جاتی ہے۔ وہی حال وکی کا تھا اس وقت۔ وہ کسی بھی قیمت پر زندہ رہنا چاہتا تھا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے وہ خود کو بہت زیادہ کمزور ہوتا پارہا تھا۔ اب اس کی آنکھوں کے سامنے رہ رہ کر اندھیرا چھانے لگا تھا۔ پھر بھی وہ آگے بڑھے جارہا تھا ایک انجانی منزل کی طرف۔

☆☆☆

اسے اس حالت میں چلتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹا ہو

کونئی خاص ٹینشن بھی نہیں تھی اس وقت تو میں بے فکر ہو کر کال اٹینڈ کرنے لگا۔ جب میں فون بند کر کے واپس مڑا تو دیکھا کہ سیٹ پر کوئی نہیں تھا اور رمضان وکی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ وہاں ایک لڑکا بائیک پر کسی خاتون کو اتار رہا تھا۔ وکی نے اس لڑکے کو زور سے دھکا دیا اور لڑکے کے گرنے پر وکی نے بائیک سنبھالی اور تیز رفتاری کے ساتھ وہاں سے نکل گیا۔

خان بولا۔ ”سلطان اس کی تین رپورٹس بناؤ۔ مکمل اور تفصیلی اور تین کا پیاں بنانا۔ ایک مجھے دینا ایک ڈی ایس بی صاحب کو اور ایک ڈی آئی جی صاحب کو بھی میل کر دینا۔ اوکے؟“

”اوکے سر۔ مگر اس بینک ڈیکیتی کا کیا ہوا؟“ سلطان نے پوچھا۔

”اطلاع بھولی تھی۔“ خان نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

وکی ندی میں تقریباً تین سو فٹ نیچے کودا تھا۔ اور وہ جگہ کچھ ایسی تھی کہ اوپر سے ایک کھائی کی طرح نظر آتی تھی اور ندی درختوں کے جھنڈ میں چھپ سی گئی تھی۔ کودتے وقت وکی نے بھی نہیں دیکھا تھا کہ ندی ہے یا نہیں۔ وہ تو بس خود کو پولیس کے جنگل سے بچانے کے لیے بے خطر کود پڑا تھا۔

پانی کا بہاؤ اسے بہت تیزی کے ساتھ اس جگہ سے کافی دور تک لے گیا اور وکی نے خود کو ایک آہٹار کے پاس پتھروں کے درمیان اُدھ مواسا پایا۔ بڑی مشکلوں سے ان کیلے پتھروں پر چھلکتے ہوئے بار بار گر کر پھر اٹھتے ہوئے وہ کنارے تک آیا، جہاں سے وہ جھانک کر دیکھنے لگا کہ آہٹار کتنی نیچے گر رہا ہے۔

پھر وہ جہاں سے کودا تھا اس طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر گھنے درختوں کی وجہ سے کچھ نظر نہیں

کے ساتھ کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ اکثر ہاتھوں میں تو اس بات پر جھگڑا بھی ہو جاتا تھا کہ انیسٹر خان کے ساتھ میں کام کروں گا اور بغض اوقات تو کچھ ماتحت اس کے ساتھ کام کرنے کے لیے سفارش تک لگوا لیتے تھے۔

انیسٹر خان نے پوری بات جاننے کے لیے سب کچھ شروع سے بتانے کے لیے کہا تو ایک سپاہی نے کہا۔ ”سر..... لاگ اب سے نکلنے وقت تو آپ نے دیکھا ہی تھا کہ اس کے ہاتھوں میں جھکڑی نہیں تھی اور آپ ہی کی نگرانی میں اسے گاڑی میں بٹھایا گیا تھا۔“

خان نے اس کو روکتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو میں جانتا ہوں۔ مجھے وہ بتاؤ جو میں نہیں جانتا۔ وہ نہیں جس کا میں خود گواہ ہوں۔“

پھر خان سلطان کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”جب کورٹ سے نکلے تب تو تم وکی کے ساتھ تھے۔ میں نا.....؟ اس کے بعد کیا ہوا یہ بتاؤ۔ اس وقت کون کون تمہارے ساتھ تھا۔ سب کچھ تفصیل سے بتاؤ۔“

فاسٹ فاسٹ۔

”کورٹ سے نکلنے سے کچھ پہلے ہی آپ کے پاس بینک ڈیکیتی کی کال آئی تھی تو آپ وہاں چلے گئے تھے۔“ سلطان نے کہا۔ ”اس کے کوئی پندرہ منٹ بعد ہم سب کورٹ سے نکلے کچھ لوگ تو آپ کے ساتھ چلے گئے تھے جبکہ اس وقت میرے ساتھ صرف تین سپاہی تھے۔ ہم جب گاڑی میں بیٹھنے لگے تو مجھے موبائل پر گھر سے کال آئی۔ آپ کو تو ہماری گاڑی کی حالت کا پتا ہی ہے کہ کتنا شور مچا رہے۔ موبائل پر کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا تو میں کال ریسور کرنے کے لیے گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ اس وقت وکی میرے ساتھ چھپلی سیٹ پر تھا اور رمضان دوسری طرف ایسی

چکا تھا اور اب اسے ٹھنڈا لے لے لی۔ اس کے دونوں پیر کانپ رہے تھے اور دانت بجنے لگے تھے۔ اس کے سینے اور پیٹھ میں درد کی شدت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا اور اس کے لیے قدم آگے بڑھانا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرنے ہی والا تھا کہ اچانک غصہ نہیں کہاں سے ایک گھڑسوار نمودار ہوا مگر یہ گھڑسوار کوئی مرد نہیں بلکہ کوئی خاتون تھی۔ اس نے وہی کے ڈمگمگاتے قدموں کو دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔ اور تیزی سے اس کی مدد کے لیے آگے بڑھی تھی۔ شکاری لباس میں ملبوس وہ خاتون جلدی سے گھوڑے سے اتری۔ اس کے شانے سے بندوق لٹک رہی تھی۔ مردانہ لباس والی اس خاتون نے کسی مرد کی طرح ہی وہی کو کندھے پر اٹھا کر گھوڑے پر بٹھایا۔ چالیس سال کی اس خاتون کے نقوش قدرے سخت گیر تھے۔ اس کے چہرے پر مختلف نشانات تھے۔ اس نے گھوڑا دوڑا لیا اور تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگی۔ پیچھے بیٹھا ہوا وہی دیکھتا تو بھی بائیں جھول رہا تھا۔ یہ دیکھ کر خاتون نے گھوڑا روکا اور اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں وہی گرنے کا جائے اس نے رسی سے وہی کو اپنے جسم سے باندھ لیا اور دوبارہ گھوڑا دوڑانے لگی۔

☆☆☆

وکی کو ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک جھوپڑی کے اندر چار پائی پر پایا۔ اس جھوپڑی میں کئی چھوٹے چھوٹے ننک دھڑنگ بچے بھی تھے۔ ان کی کمر پر ہرے پتوں کو ایک رسی سے باندھ کر ستر پوشی کا کام لیا گیا تھا۔ وکی نے ہاتھ لگا کر دیکھا کہ اس کے کندھے سے لکڑی کا ٹکڑا نکال لیا گیا تھا اور کچھ جڑی بوٹیوں کو پیس کر مرہم کی طرح اس کے زخم پر لپ کر دیا گیا تھا۔ اسے اپنی زبان پر بھی کڑوا ہٹ محسوس ہو رہی تھی جس سے وہ جان گیا کہ اسے کوئی نہایت تیز جوشاندہ

نئے افق 30

پتی بڑی۔ وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا اور
 لوکی مسکراتے ہوئے اسے پلائی جا رہی تھی۔ پھر تھوڑی
 دیر بعد وہ کیوچکر سٹانے لگے۔

☆☆☆

انیکسٹرخان اس دن گھر پر ہی تھا جب اس کی پھوٹی بہن فرحین بی وی کے سامنے میٹھی سیریل دیکھ رہی تھی اور خان کی بیوی سب کو چائے دے رہی تھی کہ اچانک بی وی پر نیوز اپ ڈیٹ شروع ہوئی۔ لیڈی نیوز رپورٹر کہہ رہی تھی۔

”یہی وہ جگہ ہے جہاں سے وقاص جہاں عرف کی چھلانگ لگا کر لپتا ہو گیا تھا اور پولیس کے مطابق ان کے آٹھ کتے بھی اس کے پیچھے چھلانگ لگاتے ہوئے اپنی جان سے گئے۔“

فرحین دوبارہ منہ بنائے خان سے مخاطب ہوئی۔
”کمال ہے بھائی۔ میں نے آپ سے اتنی التجا کی کہ
وکی کو کورٹ لے جانے سے پہلے مجھ سے ملوادیں تو
آپ نے کہا تھا کہ کورٹ کے بعد مل لینا۔ مگر اب تو وہ
فرار ہو گیا ہے۔ کیسے ملوں گی میں اس سے.....؟ اپنی

اپہ دنیا کی کسی بھی خطے میں مقیم ہوں

پہلے سے افق

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زور سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے ہر کونے میں 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر، منی گرام، ڈیٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہیں۔ مقامی افراد دفتر میں نقد ادائیگی کر کے کر سکتے ہیں۔

رابطہ: طاہر احمد قریشی..... 0300-8264242

نئے افق گروپ آف یبلی کمیشنز کمرہ نمبر: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔

فون نمبر: +922-35620771/2 فیکس: +922-5620773 Email: circulationngp@gmail.com

دوستوں کو کیا بتاؤں گی.....؟ میں اپنے موبائل میں اس کی فوٹو سیو کر لیتی اور ایک فوٹو اس کے ساتھ بنوائی۔ ”پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔ ”اچھا ہوا بھاگ گیا۔ نہیں تو پتہ نہیں کورٹ کیا فیصلہ کرنی اس بے تصور کے لئے۔“

خان اپنی معصوم بہن کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اسے کوئی سرا مل گیا ہو۔ وہ کچھ لمحے بوہنی فرحین کو دیکھتا رہا پھر اپنے موبائل سے سب انسپکٹر سلطان کا نمبر ڈائل کیا۔ فرحین اپنے بھائی کی طرف ہی متوجہ تھی اور خان بھی اسے دیکھتے ہوئے ہی فون پر بات کر رہا تھا اور فرحین سب سن رہی تھی۔

”اس وقت پولیس اسٹیشن میں ہو.....؟ ہوں کیا تم نے میڈیا والوں کو اس جگہ کا پتا بتایا تھا نہیں تو پھر وہ لوگ کیسے پہنچے وہاں.....؟ اچھا اچھا۔ ہیلی کاپٹر اسکوڈ والوں کا کام ہے۔ تو ہیلی کاپٹر سے اب میڈیا والے سفر کر رہے ہیں جبروں کے لئے۔ واہ کیا بات ہے۔ اوکے میں آدھے گھنٹے بعد تم سے بات کرتا ہوں۔ ابھی ایک بات کا پتہ چلا ہے۔“

یہ کہہ کر خان اپنی بہن کے قریب گیا اور پوچھا۔ ”فرحین ذرا میری میموری بہت کر ریفریش کرو کہ وہ کی کی بہن تمہاری کس دوست کی قریبی دوست تھی؟“

فرحین مزے لیتی ہوئے بولی۔ ارے بھائی آپ پولیس والے ہو کر چھوٹی چھوٹی باتیں بھول جاتے ہیں۔ ریشماں کی فرینڈ تھی۔ یہ دیکھو ریشماں۔ وہی اور صاحبہ کی فوٹو ایک ساتھ۔ یہ میں نے ریشماں کے موبائل سے لی ہے۔“

خان موبائل پر اس تصویر کو دیکھ رہا تھا تب اس کی بیوی موبائل میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ”آپ کو یاد ہے کوئی ایک مہینہ پہلے فرحین نے کہا تھا کہ ایک فنانس میں وہی اور صاحبہ آئے تھے اور یہ کتنی خوش ہو

رہی تھی اس دن۔“

خان نے خیالوں میں کھوئے ہوئے ہی سر ہلایا اور فرحین کو موبائل لوٹاتے ہوئے کہا۔ ”ذرا اس تصویر کو میرے موبائل پر سیو کرو۔“

فرحین نے موبائل لیتے ہوئے کہا۔ ”اپنا بلو تو تھو

آن کیجئے بھائی۔“ پھر خان جلدی سے اٹھا اور فرحین کا ہاتھ پکڑ کر اسے تقریباً کھینچ کر اٹھاتا ہوا بولا۔ ”ابھی اسی وقت مجھے ریشماں کے گھر لے چلو۔ مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔ چلو۔ جلدی چلو۔“

فرحین اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ”بھائی میں اسے فون کر کے بتا دوں کہ ہم اس کے گھر آ رہے ہیں۔“

مگر خان نے اسے سختی سے منع کر دیا اور گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔

☆☆☆

ریشماں کے گھر پر سب لاؤنج میں بیٹھے تھے اور ریشماں کے بیان کے بعد سب بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ ریشماں اپنی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو روک رہی تھی۔

”وقاص جہاں پر جو الزام لگایا گیا ہے میں اس پر بالکل بھی یقین نہیں کر سکتا۔“ ریشماں کے والد نے کہا۔ ”دونوں بھائی بہن ہماری ریشماں کے کتنے اچھے دوست تھے۔ اور صاحبہ تو اکثر ہمارے یہاں آیا کرتی تھی۔ کوئی بات ہوئی تو ہم کو ضرور پتہ چلتا۔ سب افواہیں ہیں اور سراسر جھوٹے الزامات لگائے گئے ہیں۔ خان صاحب۔ یہ آپ کا کام ہے کہ جھوٹ کو سامنے لائیں آخر آپ کی پولیس کر کیا رہی ہے؟ ایک معصوم انسان کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا اور اب شاید فرار ہونے کے جرم میں اس پر اور بھی سختی کی

جائے گی۔ یہ بھی کوئی انصاف ہے۔“

خان نے ان کی بات کا جواب دینے کے دوران فرحین کا ہاتھ پکڑا اور یہ کہتے ہوئے باہر کی جانب چلا۔ ”جناب۔ مجھے بھی پتہ ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ مگر فیصلہ سنانا جج کا کام ہے اور ابھی تو پروویزنل چارج ہے اس پر اس لیے بنا تھکڑی کے کورٹ لے جایا گیا تھا۔ ابھی تک کیس بنائی نہیں اور وہ فرار ہو گیا۔ پولیس نے ابھی تک پوری چھان بین بھی نہیں کی ہے۔ فرانزک لیب سے ابھی تک پوری رپورٹس موصول نہیں ہوئی ہیں اور میڈیکل رپورٹس آتی بھی ابھی باقی ہیں۔ کون سب میتو پولیٹ کر رہا ہے یہ کوئی نہیں سمجھ پا رہا ہے۔ وہی نے جو بیان دیا تھا وہ ہمیں تو حیح لگا مگر اس میں کچھ کمی ہے۔ کچھ باتیں ایسی ہیں جو اس نے ہمیں نہیں بتائیں۔ مگر کیوں..... یہ ہم نہیں سمجھ سکے۔ اسی لیے اس پر بھی شک کیا جا رہا ہے۔“

وہ سب باہر خان کی گاڑی تک آ چکے تھے۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے خان ریشماں سے مخاطب ہوا۔ ”تم کچھ دیر بعد پولیس اسٹیشن آ سکتی ہو۔ تمہارا بیان لینا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ایک گھنٹے بعد آ جاؤں گی۔“ ریشماں نے جواب دیا۔

☆☆☆

گھر لوٹے وقت خان نے سلطان کو فون کر کے بتایا کہ ”ریشماں وہاں آئے گی مگر جب تک میں نہ آؤں کوئی اس کا بیان نہیں لے گا۔ اگر مجھے پہنچنے میں دیر ہو جائے تو ریشماں کو انتظار کرنے کا کہہ دینا۔“

سلطان نے فون رکھتے ہوئے اپنا سر کھجایا اور پھر فون اٹھا کر کسی کا نمبر ڈائل کیا اور ایک کونے میں جا کر موبائل کان سے لگا لیا۔

☆☆☆

کچھ لفظ موقیوں کی طرح لڑی در لڑی جب آدمی کی نادانی ایسے کام میں ہو جو اس کی طبیعت کے موافق ہو تو اس گمراہی کا زائل ہونا شواہ ہے۔

(شیخ سعدی)

قلعے کے کنکروں پر روٹے نہ مارو۔ ہو سکتا ہے کہ قلعے کے اندر سے تجھ پر پتھر پڑیں۔

(شیخ سعدی)

پانی سے آگ بجھ سکتی ہے چھتری سے دھوپ رک سکتی ہے لکڑی سے دوسرے جانور کو قابو میں کیا جاسکتا ہے ہر بیماری کے لیے ایک دوا ہے۔ ہر گناہ کی تلافی کے لیے کوئی طریقہ ہے لیکن احمقوں کی حماقت کسی طرح دور نہیں ہو سکتی۔

(فریڈکلن)

جب دو آدمی کسی مسئلے پر بحث کے بغیر متفق ہو جائیں تو ثابت ہوتا کہ دونوں بے وقوف ہیں۔

(برنارڈ شاہ)

میری زندگی میں حسد کسی کے لیے بھی نہیں محبت سب کے لیے۔

(لنکن)

ہمارے بچے ہمارے ماں باپ ہیں۔

(ورڈز ورثہ)

خیر و شر کا احساس یعنی ضمیر پر انسان کے اندر خدا کی جانب سے ہوتا ہے۔

بزدل انسان اپنی طبعی موت سے پہلے ہی بارموتا ہے جب کہ بہادر انسان موت کا ذائقہ صرف ایک ہی بار چکھتا ہے۔

(شیکسپیر)

تم کچھ لوگوں کو ہر وقت بے وقوف بنا سکتے ہو اور سب لوگوں کو کچھ وقت لیکن تم سب لوگوں کو ہر وقت بے وقوف نہیں بنا سکتے۔

(لنکن)

جنگلی لوگ وہی کا ہر طرح سے خیال رکھ رہے تھے۔ اور وہی اٹھ کر اس جھوپڑے کے باہر چل پھر رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف اسی قبیلے کے لوگ اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے گھوم رہے تھے۔ وہی چہرے سے ہی پریشان اور دھکی نظر آ رہا تھا۔ ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھی سرداری اس کی اندرونی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہی اب خود کو کسی قدر بہتر حالت میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کے کندھے کا زخم بھرے لگا تھا جس کی وجہ سے درد کی شدت بھی کم ہو گئی تھی۔ جبکہ بخار بھی اتر چکا تھا۔ اپنی حالت کے پیش نظر اب وہی وہاں سے جانے کی سوچ رہا تھا۔ وہ ٹیلے پر بیٹھی سرداری سے مخاطب ہوا۔

”مجھے واپس جانا ہے۔ مجھے بہت ضروری کام کرنے ہیں۔“

وہی ہاتھوں کے اشارے سے اسے اپنا مطلب سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا اور لوگ اس کی یہ کوشش دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ کچھ جوان لڑکے اور لڑکیاں اسے گھورتے ہوئے دائرے کی شکل میں گھوم رہی تھیں۔ وہی صحیح معنوں میں ایک بھرپور مرد تھا یہی وجہ تھی کہ لڑکیاں اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ سرداری شاید وہی کا اشارہ اور باتیں سمجھ گئی تھی۔

اس لیے وہ نیچے اتری اور وہی کو ایک گھوڑے پر بیٹھنے کو کہا اور خود اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئی اور وہی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ لڑکے اور لڑکیاں کچھ دور تک اس کے گھوڑے کے پیچھے بھاگتے ہوئے آئے اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے رہے۔ کچھ دور نکلنے کے بعد ایک موڑ پر وہی نے چار پہلوانوں کو دیکھا جو سرداری کے گزرنے پر اس کے آگے احتراماً جھک گئے تھے۔ ہتھیاروں سے لیس وہ پہلوان اس علاقے کے محافظ لگ رہے تھے۔ پھر کچھ فاصلے پر ایسے ہی اور بھی

پہلوان دکھائی دیے۔ ان کے پاس جو ہتھیار تھے وہ سب جنگلی ہتھیار تھے۔ نہ کوئی بندوق تھی نہ گولی۔ تقریباً ایک گھنٹہ گھوڑوں کو دوڑانے کے بعد سرداری رکی اور وہی کو رکنے کا اشارہ کر کے ایک جگہ پہنچ کر عجیب سی چی لگائی۔ اس کی چیچ کے سنگل پردوں گھوڑے سوار نمودار ہوئے اور سرداری کو جھک کر ادب سے سلام کیا۔ سرداری نے ان میں سے ایک کو اشارہ کر کے وہی کے پاس آنے کو کہا۔ وہ گھڑ سوار اشارہ پا کر اپنا گھوڑا وہی کے گھوڑے کے برابر میں لے آیا۔

”کون ہوتم اور تمہیں کہاں جانا ہے؟“ وہی سے مخاطب ہوا۔

وہی نے اس آدمی کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شکر ہے کہ کوئی تو میری زبان بولنے والا ملا۔ میں تو سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیسے سب کو اپنی بات سمجھاؤں۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے کہ ہمارے ملک کے اس گھنے جنگل میں ایسے لوگ بھی رہتے ہیں۔“

وہ آدمی وہی کی باتوں کا اثر لیے بغیر خرشت آواز میں بولا۔ ”تم سے جو پوچھا جائے اس کا جواب دو۔ نہیں تو جان سے مار دیئے جاؤ گے۔“

”میں پولیس سے بھاگا ہوا ایک مجرم ہوں۔“ وہی نے کہا۔ ”لیکن میرے اوپر لگایا جانے والا الزام سراسر غلط ہے۔ میں بہت امیر ہوں اور تم لوگوں کو بہت پیسے دے سکتا ہوں۔ تم لوگوں کی مدد کر سکتا ہوں۔ ضرورت کا ہر سامان دلوا سکتا ہوں۔ مگر مجھے بہت ہی ضروری کام ہے۔ پلیز مجھے جانے دیا جائے۔ میں واپس آ کر تم لوگوں کو بہت انعام دوں گا۔“

وہی کی بات سن کر وہ آدمی اپنی زبان میں سرداری کو سب کچھ بتانے لگا۔ سرداری ہنس کر اسی لالچنی زبان میں کچھ کہہ کر واپس جانے لگی۔ باقی محافظوں نے وہی کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔

”ہم اس جگہ تک تمہارا ساتھ دیں گے جہاں جنگل کے بیچ سے ٹرین گزرتی ہے۔ وہاں سے تمہیں اکیلے آگے جانا ہوگا۔ یا تو ٹرین پر چڑھ کر یا جسے بھی تم جانا چاہو۔ یہاں واپس تو کوئی نہیں آتا لیکن اگر تم آنا چاہو تو آ سکتے ہو۔ لیکن اگر پولیس وغیرہ کے ساتھ آئے تو جنگل میں داخل ہوتے ہی مار دیئے جاؤ گے۔“

”آپ لوگوں نے میری اتنی مدد کی ہے۔ تو میں کسی دوسرے کو آپ لوگوں کے بارے میں کیوں بتاؤں گا۔“ وہی بولا۔ ”ویسے کیا آپ لوگ ہمیشہ سے یہاں رہتے ہیں۔ اور آپ کے قبیلے کے باقی لوگ ہماری زبان کیوں نہیں بولتے؟“

شب خون شروع ہی سے وہ مجھے اچھا لگا پھر احساس ہوا کہ میرے دل نے بغاوت کر دی اور مجھے اس سے پیار ہو گیا!

اس کی آنکھوں میں بھی الفت کے دیپ جگمگانے لگے اور پھر بہت تیزی سے ہم نے محبت کی منزلیں طے کیں ہوئے عہد و پیمان!

کھائیں جیسے مرنے کی قسمیں بھی پھر اچانک ہی قیامت برپا ہو گئی اس نے نگاہیں پھیر لیں اور مجھ سے شروع کر دی بے رحمی برتنا!

وہ بدل گیا موسموں کی طرح وہ چھوڑ گیا ساتھ اجنبیوں کی طرح، میں دم خوردہ گئی دیکھتی کہ یہ کیا ہو گیا ہماری محبت کے اونچے مینار پر تیز بیلہ!

کب کیسے اور کس نے شب خون مار دیا (تزیلہ باہمی، جھنگ صدر)

ان باتوں کے دوران وہ کافی دور تک نکل آئے تھے اور اب ریل کی پٹری نظر آنے لگی تھی۔ اس محافظ نے سوکھے بال سے بنی ایک چھوٹی سی بانسری نما چیز کو کھدیتے ہوئے کہا۔ ”جب بھی واپس آؤ تو اس کو زور سے بجانا۔ ایسے۔“ اس نے بانسری بجا کر دکھائی اس سے بہت گہری اور دور تک سنائی دینے والی آواز آئی جو جنگل کے دوسرے کونے تک سنائی دی ہوگی۔ بالکل کسی پرندے کی آواز کی مانند تھی۔

وہی نے کہا۔ ”دیکھو میں ایسے بھی سیٹی بجا کر تم لوگوں کو اپنے آنے کی خبر دے سکتا ہوں۔“ اور وہی نے دو انگلیاں اپنی زبان کے نیچے کر کے زور سے

سیٹی بجائی تو وہ لوگ ہنس پڑے۔

وکی نے ہانسی اپنی جیب میں رکھ لی اور نیچے اتر کر گھوڑا ان کے حوالے کر دیا۔ اتفاق سے اسی وقت ایک ٹرین آتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وکی اس طرف بڑھ گیا۔ پھر کسی نہ کسی طرح وکی ٹرین پر سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا کیونکہ محافظ بھی واپسی کے لیے مڑ گئے۔

☆☆☆

(بارہ گھنٹے بعد)

وکی کسی انجان شہر کے ایک ٹیلی فون بوتھ سے فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ ”مدر صاحب کیا پولیس آپ کے پاس آئی تھی؟“

”کون؟“ دوسری طرف سے سوالیہ انداز میں پوچھا گیا۔

”آپ ذرا آہستہ سے بات کریں اور بتائیں کہ وہاں پولیس آئی تھی کیا؟“

وکی بیٹا..... تم ہی ہونا..... کہاں ہو بیٹا؟“

”اف ہو۔ مدر صاحب۔ میرا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ذرا جلدی بات کریں۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ جواب دیجئے کہ پولیس آئی تھی کیا؟“

”نہیں بیٹا۔ پولیس تو نہیں آئی تھی۔ البتہ انسپٹر خان کا فون آیا تھا اور شاید آج یا کل وہ اس طرف ضرور آئے گا۔“

”مدر صاحب۔ میری بات بات غور سے سنیں اور کوئی غلطی مت کرنا۔ جیسا میں کہوں بالکل ویسا ہی کرنا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا بولو۔“

”کہیں آپ کی فون کال ٹیپ تو نہیں ہو رہی؟“

”نہیں بیٹا۔ ابھی تک تو نہیں۔ مگر خان کے آنے کے بعد ہو بھی سکتی ہیں۔“

”انکل مجھے دو ان رجسٹرڈ کم کارڈ نئے موبائل کے ساتھ چاہئیں۔ اور پانچ لاکھ روپے بھی۔ جتنی

جلدی ہو سکے۔“

”سب ہو جائے گا بیٹا۔“

”بہت ہوشیاری برتنے کی ضرورت ہے۔ کہیں پولیس نے آپ پر نظر رکھی ہوئی ہو تو مصیبت ہو جائے گی۔ اور میرا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔ میں پتہ بتا رہا ہوں۔ آپ فوراً وہاں پہنچنے کی کوشش کریں۔“

”سنو بیٹا۔ میں تو اپنی طرف سے پوری ہوشیاری سے کام کروں گا۔ مگر ایک بات ہے۔ جب میں تمہاری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچوں گا اور اگر میں کار سے نکلتے وقت اپنا چشمہ نکال کر رومال سے پوچھوں گا تب سمجھ لینا کہ کوئی براہلم ہے اور تم مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا اور اگر کوئی براہلم نہیں ہوئی تو میں چشمہ نہیں نکالوں گا، سمجھ گئے بیٹا؟“

”واہ مدر انکل۔ آپ تو جاسوسی فلموں کے ہیرو بننے جا رہے ہیں۔ ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔“

”میں آرمی میں رہا ہوں بیٹا۔ ایسی کئی ٹرس کا پتہ ہے مجھے۔“

او کے انکل۔ آپ ٹھیک تین بجے پہنچنے کی کوشش کرنا۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا۔ کچھ منٹ اوپر نیچے ہو سکتے ہیں۔ سب سے اہم بات چشمہ نکالنا اور رومال سے پوچھنا ہوگی یا دھکنا کہ خطرہ ہے۔“

”تھینکس انکل۔ مجھے بڑی بے صبری سے آپ کا انتظار رہے گا۔“

”مگر سنو۔ تم بالکل چھپ کر رہنا۔ میڈیا اور اخبار والوں نے تمہارا حلیہ کافی اچھا لایا ہے۔ سب کو تمہاری تصویر کا پتا ہے۔ بس اپنا چہرہ چھپا کر کھنا۔ سوکھو میٹر کی دوری پر ہو۔ تو کیا ہوا۔ وہاں کے لوگ بھی تو توئی دی دیکھتے ہی ہوں گے نا؟“

”آپ فکر نہ کریں۔ میں پوری طرح ہوشیار ہوں۔“

بائے انکل۔“

☆☆☆

پریشانی سب انسپٹر سلطان کے چہرے سے ہویدا تھی۔ وہ پولیس اسٹیشن میں بے چینی سے ادھر ادھر ٹپکتے ہوئے کبھی کبھی کسی کو تو کبھی کسی کو فون کر رہا تھا اور بار بار باہر کی جانب دیکھ کر جا رہا تھا۔ اسے شاید ریشماں کے آنے کا شدت سے انتظار تھا۔

”کہیں وہ لڑکی خان کی موجودی میں نہ ٹپک پڑے۔“ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ”اللہ کرے وہ خان کے آنے سے پہلے آجائے۔“

اس کی بے چینی اسے ٹکنے نہیں دے رہی تھی اور وہ پولیس اسٹیشن کے اندر باہر ہو رہا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد خان کی گاڑی آتی ہوئی دکھائی دی اور سلطان کا چہرہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اس کا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا اور ٹھیک اسی وقت ایک دوسری کار آ کر رکی جس میں سے ریشماں اتری اور اپنے سامنے سلطان کو کھڑا دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”ارے سلطان صاحب آپ بھی اسی تھانے میں ہیں۔ تب تو خان صاحب کا کام آسان ہو جائے گا۔“

سلطان نے مڑ کر دیکھا جہاں خان اپنی گاڑی پارک کر رہا تھا۔ پھر اس نے گھبرا کر ریشماں کو دیکھا اور ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے شش کہہ کر خاموش کر دیا اور جلدی سے اس کو ایک طرف لے جا کر سرگوشی میں اس کے ساتھ کچھ بات کرنے لگا۔ ریشماں حیرت سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اور اس کی بات تمام ہونے پر مسکراتے ہوئے بولی۔

”اچھا۔ میں سمجھ گئی۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں ایسا ظاہر کروں گی جیسے آپ سے پہلی بار مل رہی ہوں۔ آپ اندر جائیں۔“

انسپٹر خان اپنی کار پارک کرنے کے بعد ایک

غم ہجرال میں سلگ رہے ہو.....!

تم سے یہ کہنا ہے

کہ.....!!!

کبھی زینت کے سفر کو طے کرتے ہوئے اگر تم یہ محسوس کرو.....

کہ تم نے کیا کچھ کھویا اور کیا پایا ہے

تو ممکن ہے بہت آسان ہو جائے گی زندگی

تمہاری

مجھے کھو کر جاناں تم نے.....!

بہاروں کا ہاتھ تھا تھا تھا

بہاریں جو بھی مجھ سے منسلک تھیں

خوشبو میں جو بھی میرا پتہ دیتی تھیں

مگر اب تم اور یہ بہاریں خوشبو میں

تم کو کسی اور کا پتہ دیتی ہیں

اور اکثر تم اداس ہو جاتے ہو.....!!!

ہجرات میں کہیں کھو جاتے ہو

مجھے کھو کر بتاؤ جاناں کیا؟؟؟

تم نے واقعی زندگی پالی ہے

یا پھر اب تک بھوک رہے ہو

غم ہجرال میں سلگ رہے ہو.....!

(نوزیہ سحر کائنات، کراچی)

دوسرے دروازے سے پولیس اسٹیشن میں داخل ہوا۔ تب تک سامنے سے سلطان بھی اندر آ گیا۔ اور اس کے بعد ریشماں نے خان کے آفس کے دروازے پر دستک دے کر اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ خان فوراً اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا اور آگے بڑھ کر ریشماں کا استقبال کیا۔

ریشماں بیٹھ گئی تو خان نے سلطان کو بلوا کر دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا۔ ریشماں اور سلطان ایک دوسرے سے اجنبیوں کی طرح ملے۔

خان نے سلطان کو ہدایت کی کہ ریشماں کا بیان ریکارڈ کیا جائے تب تک کسی کو بھی اندر نہ آنے دیا جائے۔

ریشماں صاحبہ کی گہری دوست تھی جو ایک ہی کالج میں پڑھتی تھیں۔ صاحبہ وقاص جمالی کی بہن تھی۔ صاحبہ اکثر ریشماں کے گھر ملنے کے لیے آیا کرتی تھی اور ظاہر ہے لانے لے جانے کا فریضہ وقاص جمالی کو ہی ادا کرنا پڑتا تھا اس لیے وہ بھی ریشماں کے گھر والوں سے کافی گل مل گیا تھا۔ وہ اسے کام کی وجہ سے کئی بار راتوں کو دیر تک باہر ہٹا پڑتا تھا ایسی صورت میں صاحبہ ریشماں کے گھر ہی سوجانی تھی۔ مگر جب وہ فارغ ہوتا تھا تو صاحبہ اپنے بھائی سے ایک پل کے لیے بھی دور نہیں رہتی تھی۔

ریشماں تقریباً ایک گھنٹے تک انسپکٹر خان اور سلطان کے سامنے اپنا بیان ریکارڈ کرواتی رہی۔ خان کی پوری توجہ ریشماں کی طرف تھی اور بیچ بیچ میں وہ اسے ٹوکتا بھی جا رہا تھا اپنے مطلب کی بات حاصل کرنے کے لیے۔

”وقاص جمالی سے تمہاری دوستی کس حد تک تھی۔ کیا وہ تمہارا بواوے فریضہ بھی تھا۔“ خان نے چھتا ہوا سوال کیا۔

ریشماں ہنس پڑی۔ ”ارے نہیں خان صاحب۔ وہ تو مجھے بھی اپنی بہن کی طرح پیار کرتا تھا۔“

ریشماں کے جانے کے بعد خان نے سلطان سے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے۔ اس نے سب سچ کہا ہے؟“

”مجھے تو سب سو فیصد سچ لگا۔ کتنی سیدھی سادی لڑکی ہے یار۔ اسے جو معلوم تھا اس نے سب صاف صاف بتایا۔“ سلطان نے فوراً جواب دیا۔

خان نے سر ہلاتے ہوئے ریکارڈ کی ہوئی ٹیپ اپنی جیب میں رکھی اور آفس سے نکل گیا۔

گھر پہنچ کر اپنے بندے کے سرے میں انسپکٹر خان یار بار ٹیپ ریولر سنڈ کر کے ریشماں کا بیان سن رہا تھا۔ جیسے وہ کچھ جاننے کی کوشش کر رہا ہو یا ریشماں کے بیان میں کچھ تلاش کر رہا ہو۔

☆☆☆

وکی نے جس جگہ مدر صاحبہ کو ملنے کا کہا تھا وہ وہاں ایسی جگہ چھپ کر کھڑا تھا جہاں سے وہ آنے والی کار کو بآسانی دیکھ سکتا تھا اور مدر صاحبہ کو علم نہیں تھا کہ وہ کی کہاں کھڑا ہوگا۔ وکی بہت زور سے تھا اور چہرے کو چھپانے کے لیے رومال کو ایسے رکھا ہوا تھا جیسے اس کے دانت میں درد ہو۔ انتظار کرنے سے اسے ہمیشہ کوفت ہوتی تھی۔ مگر اس وقت انتظار کرنا اس کی مجبوری تھی۔ کافی دیر بعد اسے مدر صاحبہ کی سرسبز آتی ہوئی دکھائی دی۔ وکی کا دل زوروں سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ ایک کونے میں چھپ کر کار کے ڈرائیور کو فوکس کرنے لگا۔ وہ دعا کر رہا تھا کہ مدر صاحبہ چشمہ کو رومال سے نہ صاف کریں۔

وکی کی نظریں کار کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر دروازہ کھلا اور ایک پیر باہر زمین پر آیا۔ پھر نہایت آہستہ کے ساتھ مدر صاحبہ کار سے باہر نکل آئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ وکی کچھ دیر مدر صاحبہ کے چشمہ اتارنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر پانچ منٹ کے بعد وہ کار کی طرف چلے لگا۔ اس کے دل میں ایک خوف تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

مدر صاحبہ نے جیسے ہی وکی کو دیکھا تو اپنی بائیں ہتھیلیا دیں اور وکی اپنے قدموں کی رفتار تیز کرتے ہوئے ان کے گلے سے لگ گیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ایک باپ کافی عرصے بعد اپنے بیٹے کو سینے سے لگا رہا ہو۔ مدر صاحبہ کی عمر ساٹھ برس کے قریب تھی اور وہ اس عمر میں بھی کافی چاق و چوبند دکھائی دیتے تھے۔

وکی ان کے سینے سے لگتے ہی رو پڑا۔ مدر صاحبہ وکی کی پیٹھ پیٹتے جاتے ہوئے بولے۔ ”رومت۔ رومت۔ ابھی تو تمہیں ہمت سے کام لینا ہے۔ تم نے فرار ہونے کا جو فیصلہ کیا ہے اور جس مقصد سے فرار ہوئے ہو اس مقصد کو پورا کرنا ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور رہوں گا۔ میں تو کیا پورا انشاف اس وقت تمہارے ساتھ ہے۔“

دونوں کار میں بیٹھے اور مدر صاحبہ نے کار ایک جگہ پارکنگ میں لگا دی جہاں دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ اس نے موبائل کی جو دو ان رجسٹرڈ سمیں منگوائی تھیں اس میں سے ایک وکی نے خود رکھ لی اور دوسری مدر صاحبہ کو دی، تاکہ وہ ضرورت پڑنے پر ان سے رابطہ کر سکے۔

”انکل۔ جلد ہی آفس کے فون ٹیپ ہونے لگیں گے۔ اس لیے اس سم پر ہی بات کر سکتے ہیں۔“ مدر صاحبہ نے پانچ لاکھ سے بھرا ہوا بیگ وکی کو دیتے ہوئے پوچھا۔ ”بیٹا رات کو کہاں ٹھہرو گے؟“ ”سب سے پہلے تو میں ایک موٹر سائیکل لوں گا۔ پھر جنگل میں جا کر اپنے کام کی تکمیل کے اطمینان سے پلاٹنگ کروں گا۔“ وکی نے کہا۔

وکی کے والد کا بہت بڑا اور کئی شہروں بلکہ کئی ملکوں تک پھیلا ہوا برنس تھا جسے مدر صاحبہ منیجر کی حیثیت سے سنبھالتے تھے۔ برنس ٹور سے واپس آتے ہوئے طیارے کے ایک حادثے میں ماں باپ کی وفات کے بعد اب وکی ہی اس سارے برنس کا مالک تھا تب اس کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی۔ مدر صاحبہ اس کے پاپا کے بہت وفادار منیجر تھے۔ اور منہاج جمالی کی موت کے بعد مدر صاحبہ نے ہی وکی کو برنس کے بارے میں سب کچھ سمجھایا اور اسے اپنے والد کی طرح مکمل برنس مین بنایا تھا۔

غزل

گھر نہیں تھا گاؤں میں جس کا بڑا اس نے رکھا دل کا دروازہ بڑا دیکھتے ہی دیکھتے دن پھر گئے ہو گیا مزدور کا بچہ بڑا بے وفا لوگوں میں ہم شامل نہیں رکھ دیا الزام کیوں اتنا بڑا اتنا چھوٹا تو نہیں یہ حادثہ پیار میں ہم کو ملا ڈھوکا بڑا تجھ کو دیکھا تو ہوئی غم آنکھ بھی چین بھی دل کو میرے آیا بڑا تنگ سی گلیوں میں لٹ جاتے ہیں لوگ دیکھ کر چلنا کوئی رستہ بڑا پڑھ لے خود دکھتی ہوئی آنکھوں کا روگ آدی رکھتا ہے وہ رتبہ بڑا ٹل گئی اس کو مصیبت دیکھ کر جس نے رکھا حوصلہ اپنا بڑا شاعری اس کی نرالی ہے مگر کاش وہ انسان بھی ہوتا بڑا کیسے اندازہ لگاتے چھاؤں میں ہم نے دیکھا دھوپ میں سایہ بڑا نالتا عطر نہیں کوئی سوال ہے وہی تو آسمان والا بڑا (رانا حنیف عاطر..... جھنڈو)

وکی خوب صورت تھا۔ ہینڈسم تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ایک کامیاب برنس مین تھا اور ابھی تک کنوارہ تھا۔ اس لیے وہ حلقے کی خواتین اور خاص طور سے لڑکیوں میں کافی پاپولر تھا۔ کئی لڑکیاں تو باقاعدہ اسے ٹریپ کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ جب کبھی بھی پارٹیوں ڈسکو یا ناٹ لائف کے لیے وکی

باہر جاتا تو بیک وقت کئی لڑکیاں اسے گھیرے رہتی تھیں۔ وہ سوشل سطح پر بھی کافی مقبول تھا اور اسی مقبولیت کی وجہ سے میڈیا والے بھی اس کا پیچھا کرتے رہتے تھے۔ یوں کہہ لیں کہ وہ کسی فلمی سپر اسٹار کی طرح ہی مشہور تھا۔ سگریٹ اور ڈرنک کے علاوہ وہ کسی اور اخلاقی برائی نہیں تھی۔ اسے لڑکیوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور صاحب اس کی لاڈلی چھوٹی بہن تھی۔ جس میں اس کی جان تھی۔ وہ خود ہر قسم سہہ سکتا تھا، مگر صاحب کی آنکھ میں ایک آنسو بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

وکی اور مدثر صاحب کا میں بیٹھے ہی ساری باتیں کر رہے تھے۔

”بیٹا تم کتنے دنوں تک ایسے چھپتے پھر وگے؟ ایک نہ ایک دن تو وہ لوگ تمہیں ٹریس کر ہی لیں گے۔ تم کافی مقبول شخصیت ہو، اس لیے جہاں بھی رہو گے کوئی نہ کوئی تو تمہیں پہچان ہی لے گا۔ ویسے تم نے اپنا کام تو اپنے شہر میں ہی پورا کرنا ہے نا؟“

وکی مدثر صاحب کی باتیں سنتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ اچانک کہا۔ ”اٹکل آپ کو ریفیق حیات یاد ہے؟“

”ریفیق حیات۔“ مدثر صاحب نے یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”کون وہی ڈرامے والا۔ ہاں کیوں؟“

”ہاں وہی۔“ وکی بولا۔ ”مجھے اس سے ملنا ہوگا، وہی ہے جو مجھے ایک نیا روپ دے سکتا ہے، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے بھی بدل کے اپنے شہر میں رہنا ہوگا تاکہ کوئی مجھے پہچان نہ سکے اور ریفیق حیات تو اپنا ہی آدمی ہے۔ ہم نے اس پر جتنے احسان کیے ہیں وہ ضرور میری مدد کرے گا اور کسی کو کچھ بتائے گا بھی نہیں۔“

ریفیق حیات ایک میک اپ مین تھا اور کیا کمال کا میک اپ کرتا تھا۔ وہ اپنے فن میں اتنا ماہر تھا کہ ایک بار

اس نے ایک وزیر کا میک اپ کیا جسے ایک پبلک پارٹی میں جانا تھا اور وہاں کوئی بھی اسے پہچان نہیں سکا تھا۔

”مگر بیٹا تمہاری یہ ادنیٰ قامت تمہیں دھوکہ دے سکتی ہے۔ پولیس تم کو تمہارے قد سے بھی تلاش کرے گی۔“

”مجھے بدل کر چہرہ تو بدل لو گے لیکن اپنے قد کا کیا کرو گے۔ صرف اسی وجہ سے بھی تم شک کے دائرے میں آ سکتے ہو۔“

”اٹکل آپ فکر نہ کریں۔“ وکی نے کہا۔ ”میں آپ کے سامنے آؤں گا تو آپ بھی مجھے پہچان نہیں پائیں گے، اپنا بھیجیں میں خود منتخب کروں گا اور ریفیق حیات سے جو میں بننا چاہتا ہوں وہی بنواؤں گا۔“

”تمہارے پاس اس کا نمبر ہے؟“ مدثر صاحب نے پوچھا۔

”نہیں۔ آپ جاتے ہی پہلی فرصت میں وہ نمبر مجھے بھیج دیں گے۔“ وکی بولا۔

”ٹھیک ہے۔ تمہارے لیے اس ان رجسٹرڈ سم سے پہلا کام یہی کرتا ہوں۔“ مدثر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر مدثر صاحب نے وکی کو گلے سے لگایا اور نرم آنکھیں لیے رخصت ہو گئے۔ وکی پانچ لاکھ والا بیگ لیے ایک طرف چل دیا۔

☆☆☆

وکی نے اس شہر میں موٹر سائیکل ریوٹ پر دینے والوں سے رابطہ کیا اور آخر میں اپنی پسند کی ایک ہائی اسپید موٹر سائیکل ایک مہینے کے لیے ریوٹ پر لے لی۔ اپنی شناخت ظاہر نہ کرنے کے لیے اس نے ریوٹ والوں کو منہ مانگی قیمت ادا کی۔ پھر اس نے کچھ کپڑے اور ضروری سامان کی خریداری کی۔

اب وکی کی بانیٹک تیز رفتاری سے اسی جنگل کی طرف بھاگی چلی جا رہی تھی۔ ہائی وے پر کافی آگے

جانے کے بعد اس نے بانیٹک کے پیچھے اتار دی اور ریوے لائن کے ساتھ بڑھنے لگا۔ پھر تھوڑی تلاش کے بعد وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں سرداری کے محافظوں نے اسے چھوڑا تھا۔ سورن ڈھلنے کو تھا اور جنگل میں اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

وکی نے جیب سے بانسری نکال کر دو تین بار بجائی اور اسے محافظوں کے گھوڑوں کی ناپیں سنائی دینے لگیں۔ وہ ایسے خوش ہونے لگا جیسے اپنے گھر واپس آ گیا ہو۔

☆☆☆

انسپکٹر خان ریشمال کی ریکارڈ کی ہوئی آواز کو بار بار سن رہا تھا اور کہیں کہیں ریوائنڈ کر رہا تھا پھر ایک جگہ اسے کچھ محسوس ہوا اور وہ چار بار ریوائنڈ کر کے ٹیپ کے اس حصے کو سننے لگا۔

”صاحبہ ہمیشہ کتنی بھی کر دو کی بہت ٹھنڈے مزاج کا انسان ہے۔ اسے بھی غصہ آتا ہی نہیں۔ وہ ٹھنڈے دماغ اور نرم دل کا مالک ہے۔ وہ کبھی کسی قسم کے لڑائی جھگڑے میں پڑنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اگر کسی سے کوئی رنجش ہوتی بھی تو بات کر کے رفع دفع کر دیتا تھا۔ بحث کرنا اسے پسند نہیں تھا۔ جھگڑا کرنا تو دور کی بات ہے وہ تو کبھی کسی پر چلاتا بھی نہیں تھا۔ آپ اس کے اسٹاف سے پوچھ لیں سب اس کو کتنا پسند اور پیار کرتے ہیں۔ وہ اپنی کمپنی کو بہت اچھے طریقے سے چلا رہا ہے۔ اس کا دماغ بہت تیز ہے اور وہ پلاننگ کرنے میں تو ماسٹر ہے۔“

”اس کا دماغ بہت تیز ہے اور وہ پلاننگ کرنے میں تو ماسٹر ہے۔“ اس جملے کو خان نے بار بار سنا اور پھر خود ہی بڑبڑانے لگا۔

”اگر وہ پلاننگ کرنے میں ماسٹر ہے تو اس وقت بھی وہ کچھ نہ کچھ تو پلان کر رہا ہوگا۔“ اگر وہ زندہ بچ

دائرے

ہم دنوں کے اندازے اس طرح بھی کرتے ہیں ملنے جلنے والوں سے بے وجہ بھی ڈرتے ہیں مطمئن بھی رہتے ہیں بے عجب سی الجھن بھی ڈھلتی ہیں دیواریں ناچتا ہے آنگن بھی چل رہے ہیں مدت سے راستہ نہیں کوئی رابطہ ہے ہزلوں سے رابطہ نہیں کوئی دھوپ سے شکایت ہے چاندنی سے کیا کہیے ہر کسی سے کہتے ہیں ہر کسی سے کیا کہیے یہ بھی اک بہانہ ہے کس طرف نہیں جاتے اس طرف بھی جانا ہے جس طرف نہیں جاتے آج جیسی لگتی ہے جسم کی یہ برقابی دھندلے کے بتاتی ہے بر فضاے مہتابی سوچتی ہیں یہ آنکھیں منظروں میں منظر کو ڈھونڈتی ہو جیسے موج اپنے ہی سمندر کو ریت پر بنے پیکر کھیل رہی لیکروں کے پانیوں کے اندر ہیں خواب کچھ جزیروں کے کوئی پھانس جیسی چیز ذہن میں جھلکتی ہے روشنی کے اندر سے تیرگی جھلکتی ہے پر سکون باطن میں اضطراب جیسا ہے ارتکاز بھی جیسے انتشار جیسا ہے دائروں کے اندر بھی دائرے ہی پنہاں ہیں جسم ہے کسراکت ہے اور سارے رقصاں ہیں خامشی میں گم صم ہے عرض حال کی صورت ہے عروج پر اپنے ہرزوال کی صورت کیا خیال کیا مضمون سب کے سب ہیں لایعنی حرف حرف بے حرمت لفظ لفظ بے معنی

(شاعر احمد صغیر صدیقی، انتخاب: عبد القیوم رخاں..... ضلع کوہاٹ)

گیا ہوگا تو اس وقت کیا کر رہا ہوگا؟ کہاں ہوگا؟“
خان یہ سوچتے ہوئے اسے لاؤنج میں ٹہل رہا تھا کہ
اس کے موبائل پر بیل بجنے لگی۔

”کیا اب آپ کے گھر کو پولیس اسٹیشن کا درجہ
دے دیا گیا ہے؟“ دوسری جانب سے ڈی
ایس پی چنگیزی کی چلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”سنا
ہے کہ آپ کسی کے ریکارڈ کیے گئے بیان کو اپنے
ساتھ لے گئے ہیں۔ میں پوچھ سکتا ہوں کہ کیوں؟“
خان نے اپنے غصے کو قابو میں رکھتے ہوئے
جواب دیا۔ ”میں اسی کیس پر کام کر رہا ہوں۔“

”کام کر رہے ہو تو یہ کام پولیس اسٹیشن میں آ کر
بھی ہو سکتا تھا۔ وہ ریکارڈ کیا گیا ٹیپ فوراً میرے
پاس لاؤ۔ یہ میرا حکم ہے۔ سناتم نے مسٹر خان؟“
چنگیزی نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

”کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو“ خان غصے سے
چلایا۔ ”رشتہ خور کہیں کا۔ رشتہ دے کر اور میرا حق
مار کر ڈی ایس پی بنا ہے کمینہ۔ نکلے کو اتار جاتا کچھ نہیں
ہے اور چلا ہے مجھے سکھانے۔“

خان کی بیوی اس کے پیچھے کھڑی تھی اور فرحین
ڈری ہوئی ایک درازے کے پٹ کے پیچھے کھڑی
کانپ رہی تھی۔ وہ دونوں اچھی طرح جانتی تھیں کہ
جب خان غصے میں آتا تھا تو بے قابو ہو جاتا تھا۔ اسی
تیز مزاجی کی وجہ سے اسے ڈپارٹمنٹ میں بہت سی
مشکلوں کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا اپنے کیریئر میں۔ وہ
اٹھارہ سال سے پولیس فورس میں تھا اور اس سے
جونیئر لوگ ترقی پا کر آگے بڑھ چکے تھے اور وہ
انسپیکٹر ہی بنا رہا تھا۔ وہ کبھی کسی تھانے میں ٹک کر
نہیں رہا تھا۔ جب بھی وہ کسی اہم کیس کو سلجھانے
کے قریب ہوتا تو ہر بار اس کا کسی نہ کسی بہانے سے
تبادلہ کر دیا جاتا تھا۔ اور کیس کی کامیابی کا کریڈٹ

نئے آفیسروں کو دے دیا جاتا جس کے بعد انہیں ترقی
تو ملنا ہی تھی۔ اس کے ساتھ ایسا کی بار ہوا تھا۔ چنگیزی
نے اس کے ساتھ ہی پولیس فورس جوائن کی تھی اور
جب خان قتل کے ایک کیس کو سلجھانے میں کامیاب
ہوا اور پورٹ دینی تھی تو اس وقت چنگیزی نے جلدی
سے کسی ایم این اے سے کہلو کر خان کو اس کیس
سے ہٹا کر وہ کیس خود لے لیا۔ اس کیس کے بعد
چنگیزی کی ترقی ہوئی اور خان کا تبادلہ۔ کام کیا خان
نے اور انعام ملا چنگیزی کو۔ تب سے خان چنگیزی
سے شدید نفرت کرتا تھا۔ اور جب سے خان اس کے
نیچے کام کرنے آیا تھا چنگیزی جان بوجھ کر اس کو نیچا
دکھانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

خان کی بیوی اسے بہلا کر اور حوصلہ دے کر اس کا
غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگی اور فرحین بھی
ڈرتے ڈرتے بڑے بھائی کے پاس آئی۔

”بس بھیا..... اب غصہ تھوک دیں۔ اس میں
نقصان کسی اور کا نہیں، صرف آپ کا ہے۔“
خان ہمیشہ ان دونوں کے لیے ہی خاموش ہو جایا
کرتا تھا۔ اور اپنی تقدیر کا لکھا سمجھ کر اپنے ساتھ ہوتی
نا انصافی کو قبول کر لیتا تھا۔

☆☆☆

آدھے گھنٹے بعد خان پولیس اسٹیشن میں تھا اس
وقت تک چنگیزی جا چکا تھا۔ سلطان نے اسے دیکھتے
ہی کہا۔ ”آپ کیوں آگئے؟ آپ کو معلوم ہے کہ وہ
صرف آپ کو ڈسٹرب کرنے کے لیے ایسا کرتا ہے۔
یہ کوئی پہلی بار تو نہیں کیا ہے اس نے۔ وہ آپ سے اور
کیا کہہ سکتا تھا کیونکہ اس کو پتہ ہے کہ آپ اس سے
بہتر پولیس آفیسر ہیں۔ وہ آپ کو الجھانے کے لیے اپنا
رعب جماتا ہے۔ اگر آپ اس ریکارڈ ڈیٹیب سے کچھ
پتہ کر سکتے ہیں تو کریں۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ کسی کال

گرل کے ساتھ عیش کرنے گیا ہوگا جیسا وہ کرتا رہتا
ہے۔ اب تک تو اس نے بول بھی کھول لی ہوگی۔“
یہ سن کر خان دانت پیس کر رہ گیا اور اپنی سیٹ
پر جا کر سلطان کو اپنا پروگرام بتایا۔

☆☆☆

خان اور سلطان وکی کی کمپنی پہنچے تو مدثر صاحب
نے اپنے آفس میں ان کا استقبال کیا۔ آفس بہت
عالیشان تھا اور ہر چیز سے نفاست اور امارت نکلتی تھی۔
وہ ایک گھنٹے تک مدثر صاحب کا بیان لیتے رہے۔ پھر
اس کے بعد خان نے کئی دوسرے ملازموں سے بھی
بیانات لے کر ریکارڈ کئے۔ کمپنی میں کئی خواتین بھی کام
کر رہی تھیں۔ ان سب سے بھی بیان لیا گیا۔ ہر ایک کا
بھی بیان تھا کہ وکی صاحب بہت اچھے خیالات کے
مالک ہیں۔ وہ سب انہیں بے انتہا پسند اور پیار کرتے
ہیں کیونکہ وہ بھی سب ملازموں سے بہت پیار کرتے
ہیں۔ اور جیسا کہ ریشمان نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ
ویسے ہی سب نے یہ بیان دیا کہ ان میں سے کسی نے
کبھی وکی کو غصہ کرتے نہیں دیکھا۔ وہ بہت ہنس مکھ
اور خوش مزاج انسان تھا۔ اپنا دماغ ہمیشہ ٹھنڈا رکھتا تھا۔
اس کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ جمی رہتی تھی۔ بڑے
سے بڑا فیصلہ لیتے وقت بھی اس کے ماتھے پر کوئی شکن
نظر نہیں آتی تھی۔ ہر ملازم کا یہی بیان تھا۔

جب صاحب کے بارے میں پوچھا گیا تو بتایا گیا
کہ وہ کبھی بکھرا ہی کالج کے بعد اپنے بھائی سے ملنے
آفس آتی تھی وہ بھی زیادہ تر ریشمان کے ساتھ۔ اور
دونوں کافی وقت تک یہیں رہتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ
ایکلی بھی آجاتی تھی اور آفس بند ہونے کے بعد بھائی
کے ساتھ ہی گھر جاتی تھی۔

ان کے تعلقات کے بارے میں سب نے یہی
کہا کہ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بہت پیار

غزل

جسے بار بار ملے تھے تم وہ میرے سوا کوئی اور تھا
میرے دل کی تاب نظر کہاں، تیرہیں دیکھتا کوئی اور تھا
میں خوردہ راہ غم چلا اس کے ساتھ قدم قدم
میرے ہمسفر نہیں جانتے، میرا راستہ کوئی اور تھا
گل تازہ یہ تیرا رنگ دلوں ہوا سب سے بڑھ کر تیرا وعدہ
کسی اور نے چن لیا، تجھے چاہتا کوئی اور تھا
سب ہی بے ربط ہے سروا ہوئے نہ ملے نہ تجھ سے جدا ہوئے
نہ الگ تھا تیرا جہاں بھی نہ میرا خدا کوئی اور تھا
کھلا ہمدردی پر راز کب کے میں ایک عمر سے جان بلب
تجھے روز ملتے تھے لوگ سب، مگر میرا آشنا کوئی اور تھا
کبھی روشنی مجھے عطا کی، کبھی سائے ساتھ لگا دیے
کبھی سب چراغ بجھا دیے وہ تمہی تھے یا کوئی اور تھا
(پسند۔ رابعہ حسن صابر لنگاہ۔ لاہور موڈ پرانا خانیوال)

کرتے تھے۔ خاص طور سے وکی تو اپنی بہن پر جان
چھڑکتا تھا۔

جب خان یہ بیان لے رہا تھا تو سلطان خاموشی
سے سب سن رہا تھا۔ اس کی نظریں خان کے چہرے
پر جمی ہوئی تھیں۔ اس وقت سلطان کے چہرے پر غم
اور دکھ کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔

پھر خان نے مدثر صاحب کی اجازت سے سلطان
کی موجودگی میں سب ملازمین کو ایک بڑے ہال میں
جمع کیا اور سب سے کچھ مشترکہ سوالات کئے۔ تب
بھی سب نے وکی کے لیے مثبت خیالات کا ہی اظہار
کیا۔ پھر خان کے ایک سوال پر سلطان کے چہرے کا
رنگ بدلنے لگا۔

”تو آپ سب لوگ وکی پر لگائے گئے الزام کو سراسر
جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں اس کے پیچھے کسی اور
وجہ کی کیا اور کا تھا ہو سکتا ہے۔“

”ہاں بالکل یہی بات ہے صاحب۔ آپ وہی صاحب کو تلاش کریں آپ کو کوچ کا پتہ ضرور چلے گا۔“

اب خان نے آخری اور اہم سوال کیا۔ ”کیا کیس شروع ہونے کے بعد یا فرار ہونے کے بعد وہی نے آپ میں سے کسی سے کوئی رابطہ کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو سچ بتادے ورنہ اسے بھی مجرم سمجھا جائے گا اور کیس میں اس کو بھی شامل کر لیا جائے گا۔“

زیادہ تر لوگوں نے نہیں میں جواب دیا۔ ایک ملازم نے کہا۔ ”صاحب ہم سب تو چاہتے ہیں کہ وہی صاحب ہم سے رابطہ کریں تاکہ ہمیں پتہ چلے کہ وہ خیر خیریت سے ہیں۔ وہ ہمارے لیے پتی دھوپ میں سائے کی طرح ہیں۔ ہمیں اپنا سائبان واپس چاہئے صاحب۔ ان کی بدولت ہم ہر قسم کی پریشانی سے آزاد ہیں۔ ہم تو ترس رہے ہیں ان سے رابطہ کرنے اور ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے۔“

یہ سن کر خان کی آنکھیں نم ہو گئیں اور سلطان سے کہا۔ ”چلو سلطان۔“

عمارت کے مین گیٹ پر خان سیکورٹی گارڈ کے پاس رک گیا۔ ”تم کیا کہتے ہوئے وہی صاحب کے بارے میں؟“

”کیا کہوں سر۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟ ویسے یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ صاحبہ جی تو ایم ایم ہیں۔ ہی۔۔۔۔۔ ہی۔“

اس بات پر سلطان نے غصے سے گارڈ کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا مگر خان نے سلطان کا ہاتھ روک کر گارڈ سے کہا۔

”تم انسان ہو یا جانور؟“

☆☆☆☆

خان اور سلطان پولیس اسٹیشن لوٹ آئے۔ اپنے روم میں خان اس گارڈ کی بات پر غور کر رہا تھا کہ اس

نے ایسا کیوں کہا۔۔۔۔۔ کیا اس کو کچھ پتہ تھا؟ کیا وہ کچھ جانتا تھا؟ کیا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا؟ سلطان نے اس کو مارنا کیوں چاہا؟ سلطان وہی کی اتنی طرف داری کیوں کرتا ہے؟ کیا سلطان بھی کچھ جانتا ہے مگر اس نے اپنی زبان بند رکھی ہوئی ہے؟

خان اپنے دماغ پر زور دیتے ہوئے اس دن کو یاد کرنے لگا جب وہی کو رٹ سے فرار ہوا تھا۔ اس وقت تو سلطان ہی تھا وہی کے ساتھ۔ خان کو یاد آیا کہ سلطان نے کہا تھا کہ اس کو گھر سے ایک کال آئی تھی جس وقت وہی گاڑی سے اتر کر بھاگا تھا۔

خان کا دماغ نہایت تیز رفتاری سے آگے کی گتھیاں سلجھا رہا تھا۔ اس نے اپنے موبائل کی بیٹری ڈیڈ ہونے کا بہانہ کر کے سلطان سے فرجین کو ایک ایس ایم ایس کرنے کے لیے فون مانگا اور اس کا موبائل اپنی ڈیسک کے نیچے کر کے اس کا کال رجسٹر چیک کرنے لگا۔ جبکہ سلطان سمجھ رہا تھا کہ وہ ایس ایم ایس لکھ رہا ہے۔

خان کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں کیونکہ کال رجسٹر کے مطابق اس دن کال سلطان کے گھر نہیں بلکہ کسی نامعلوم پرائیویٹ نمبر پر کی گئی تھی۔ خان نے ایک نظر اٹھا کر سلطان کو دیکھا۔ پھر ایک ایس ایم ایس کیا فرجین کو کہ اس کے موبائل کی بیٹری ڈاؤن ہے اس لیے وہ فون یا ایس ایم ایس نہ کرے۔

خان نے سلطان کا موبائل لوٹا دیا۔ اب وہ اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ سلطان نے کیوں جھوٹ بولا تھا کہ اس کے گھر سے فون آیا تھا۔ کوئی فون آیا نہیں تھا بلکہ اس نے خود کہیں کال کی تھی مگر کس کو اور کیوں؟ نمبر کیوں نہیں ہے؟ پرائیویٹ کیوں لکھا ہوا ہے؟ یہ کیا ماجرا ہے۔ خان اب سلطان پر بھی شک کرنے لگا۔

☆☆☆☆

میڈیا والے اس بات کو اچھا لیتے ہوئے بہت شور مچا رہے تھے۔ ان کی تقیتش پولیس سے بھی آگے جا رہی تھی۔ کئی ٹی وی چینل نے وہی کے ملازموں سے بھی پوچھنا چھکی اور کئی کامیاب براہ راست بھی نشر کیا گیا۔ میڈیا والوں کو بھی ملازموں کا وہی بیان تھا جو انہوں نے پولیس کو دیا تھا۔ یعنی ہر کسی نے وہی کے لیے مثبت بیان ہی دیا تھا۔ مگر جس طرح سے رپورٹرز سوال کر رہے تھے وہ سوال وہی کے خلاف ہوتے تھے اور اس پر چارج لگانے والی بات کہا جاتی تھی۔

کمپنی کے سیکورٹی گارڈ کا بیان ٹی وی پر کئی بار دکھایا گیا۔ اور رہ کر دکھایا جا رہا تھا کیونکہ اس کا جواب بہت متنازع تھا۔ اس کے جواب کو لے کر کئی اینکرز پوری بات جانے بغیر ہی اپنی اپنی رائے تھوپنے لگے تھے اور کئی لوگ اب اس گارڈ کی بات کو بھی اہمیت دینے لگے تھے۔

رپورٹرز نے خان اور سلطان سے بھی کئی بار بیان لینا چاہا مگر دونوں نے ”نومنس“ کہہ کر ان سے جان چھڑائی۔ مگر جب ڈی ایس پی چنگیزی سے رپورٹرز نے سوال کیے تو اس نے بال سنوار کر کیمیرے کے سامنے ایکشن سے کہا۔

”پولیس اپنا کام کر رہی ہے۔ وہی جہاں بھی ہوگا اسے جلد گرفتار کر لیا جائے گا اور اسے اس کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔ یہ کیس انسپکٹر خان کے پاس ہے اور مجھے امید ہے وہ بہت جلد اس کیس کو مثبت انجام تک لائے گا۔“

”مگر سر۔ وہی کا تو کوئی اتا پتہ ہی نہیں ہے۔ کیا کوئی اس کی مدد کر رہا ہے یا کسی طرح سے اس کو امیر ہونے کا فائدہ پہنچایا جا رہا ہے۔“ ایک رپورٹر نے بال کی کھال نکالتے ہوئے کہا۔

رنگ بدلتی

اس نے کہا تھا مجھوں نے قافلے لٹنے لگے ہیں دیکھو

دو پرچی جدا ہونے لگے ہیں درختوں پر بیٹھے

دو پرندے اڑنے لگے ہیں شوق و چہل زندگی میں

صحرا درآئے لگا ہے دیکھو

جدا ہو کے بھی مجھے ہی چاہتا، مجھے ہی سوچنا تم میں اپنی ہرج

تیری یاد سے آباد کروں گا ہر شام تیرے نام کروں گا

منقسم ہو جائے میرا وجود پھر بھی میرے دل پہ تیری حکمرانی رہے گی

میرے من کی صرف تو رانی رہے گی میں دو قدم بھی نہ چل سکوں گا

ساتھ تیرے کہ مجبور یوں کا اک طوق ہے میرے گلے میں

جسے میں خود سے الگ نہ کر پاؤں گا خونی رشتوں کا بھرم نہ توڑ پاؤں گا

سوچا ناں میری محبت پہ شک نہ کرنا

میں تیرا ہوں تیرا ہی رہوں گا آؤ نا

تقدیر کے فیصلے پر سر جھکا دیں ہم اپنی خوشیاں دوسروں کے نام کر دیں ہم

وہ امید و بیم کی نظر سے تک رہا تھا مجھے اور میں سوچ رہی تھی

ابھی تو اس حسین وادی میں قدم ہی رکھا تھا پھر کیسے یکبارگی

طوفان جدائی نے آن گھیرا ہے (زویہ شاذ۔ منجن آباد)

”آپ یہ سوال انسپکٹر خان سے کریں۔“ ڈی ایس جی نے غصے سے کہا۔
کچھ رپورٹرز اس جنگل کے مناظر دکھاتے ہوئے پولیس پر سخت تنقید کرتے ہوئے سوال کر رہے تھے کہ وہ کیا تو کہاں گیا اور اس کو ڈھونڈا کیوں نہیں جا رہا۔ اگر وہ ہندی میں گر کر مر چکا ہے تو اس کی لاش میڈیا کے سامنے لائی جائے۔ غرض کہ ہر طرف اسی کیس کے چرچے تھے۔

رپورٹ کا سہارا لے رہے تھے جو کی کے خلاف تھی۔ اور اس حادثے کے بعد جو تصویریں حاصل ہوئی تھیں وہ بھی سراسر وہی کو مجرم ثابت کرتی تھیں۔ ادھر کچھ لوگ یہ نقطہ بھی اشارے تھے کہ فارتسک اور میڈیکل رپورٹس کو بدلا بھی تو جاسکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہی کو پھنسانے کے لیے رپورٹس تیار کرنے والوں کو ہی خرید لیا گیا ہو۔

☆☆☆☆

خان سلطان کی موبائل کال والی بات پر اپنا دماغ کھپا رہا تھا۔ اس سے مزید برداشت نہیں ہوا تو کچھ وقت کے بعد اس نے سلطان کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ احتیاطاً اس نے ہتھکڑی بھی ساتھ لے لی تھی کہ ہو سکتا ہے شک کی بنا پر سلطان کو گرفتار کرنا پڑ جائے۔ مگر اس سے پہلے وہ اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے سلطان کو ایک موقع دینا چاہتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ دور سمندر کے کنارے گیا اور گاڑی سے نکل کر دونوں کنارے پر بنی دیوار پر بیٹھ گئے۔ سلطان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے یہاں لانے سے خان کا کیا مقصد ہے؟ ”دیکھو سلطان۔ تم میرے ایک اچھے ماتحت ہی نہیں بلکہ بہت اچھے دوست بھی ہو۔ میرے ساتھ اتنے دن کام کر کے تم نے بہت اچھا رزلٹ دیا ہے۔ اور میں تمہاری فرض شناسی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو بہت اچھی طرح سمجھنے لگا ہوں۔“ خان نے بات کا آغا کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اب جو ہو رہا ہے وہ مجھے قطعاً پسند نہیں۔ اور میری توقع کے بالکل برخلاف ہے۔ میں اپنا فرض نبھاتے ہوئے تمہیں شک کی بنا پر گرفتار بھی کر سکتا ہوں۔ مگر دوستی کے ناتے میں تم کو ایک موقع دینا چاہتا ہوں کہ تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو تاکہ میں تمہاری کوئی مدد بھی کر سکوں۔“

وہی کو فرار ہوئے جا رہے تھے اور چاروں طرف پھیل چکی ہوئی تھی۔ پچھلے چھ دنوں میں سب سے زیادہ وہی کی خبر کو ہی عوام اور میڈیا نے زیادہ اہمیت دی تھی اور چینلز اسے ہاٹ ٹیک کی طرح کیش کر کے اپنی رینٹنگ بڑھانے میں مصروف تھے۔ ہر روز ہر کوئی یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہی گرفتار ہوا یا نہیں اس پر جو الزام لگا ہے وہ سچ ہے یا جھوٹ۔ کیا واقعی اس نے ایسا کیا ہے.....؟ کیا وہ ایسا کر سکتا ہے.....؟ کیا اس لیے کہ وہ امیر ہے تو اس کے لیے سب جائز ہے؟ کیا اس کے لیے الگ اور عام آدمی کے لیے الگ قانون ہے؟ ایسے کئی سوالات تھے جو چینلز اخباروں اور عام چوپالوں میں اٹھائے جا رہے تھے۔ اور وہی کی گرفتاری پر تو کچھ ستم ظریفوں نے تو سڑ بھی لگانا شروع کر دیا تھا۔

وہ رپورٹرز جو کی کو پہلے سے جانتے تھے وہ اپنے چینلز پر وہی کا مثبت روپ پیش کر رہے تھے اس کی اچھائیاں بیان کر رہے تھے۔ یعنی اب چینلز کے درمیان بھی ایک قسم کا ٹائرا چل پڑا تھا۔ کچھ وہی کو غلط اور کچھ سچ ثابت کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اس وقت وہی کی مشہوری کسی فلمی ہیرو، کرکٹ یا سیاستدان سے بھی زیادہ تھی۔

وہی کے خلاف بات کرنے والے چینلز فارتسک

جائزہ لے رہا تھا اور ایک بہترین پولیس آفیسر کی طرح چہرہ شناس بھی تھا۔ خان کی بات سن کر سلطان کے چہرے کے تاثرات اتنے زیادہ بدل چکے تھے کہ بات بالکل صاف ہو چکی تھی کہ اسے وہی کے کیس کے بارے میں بہت کچھ پتہ ہے۔

”اپنا رپورٹ اور کیپ میرے حوالے کر دو۔“ خان نے خشک لہجے میں کہا۔
سلطان نے بلاچوں چرائی اپنا رپورٹ اور کیپ خان کو دیتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کو مجھ پر شک کیسے ہوا؟“ ”تمہارے موبائل سے اب سب صاف صاف بتا دو کہ اس دن کیا ہوا تھا جب وہی فرار ہوا تھا؟ مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ وہ تمہارے ہوتے ہوئے بھاگ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس بات پر میں بہت حیران بھی ہوا تھا۔ سلطان۔“ خان نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ”اس دن تم نے کسی کی کال ریسیو نہیں کی تھی۔ اب یہ تم بتاؤ گے کہ اس دن تم نے کس کو کال کی تھی؟“

شام کا وقت تھا اور سامنے سمندر کی جانب سے قدرے سرد ہوا چل رہی تھی اس کے باوجود سلطان کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھا اور نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”میں اس وقت اس لڑکے سے بات کر رہا تھا جس کو موٹر سائیکل سے خاتون کو اتارنا تھا اور وہی کو اس کی موٹر سائیکل لے کر بھاگتا تھا۔“

یہ سن کر خان نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔ وہ سلطان کے پسینے سے تر چہرے کو ٹھوکتا ہوا بولا۔ ”کیوں.....؟ کیوں سلطان۔ کیوں.....؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟“ یہ کہہ کر خان نے ہتھکڑی نکالی اور سلطان کے دونوں ہاتھوں میں پھنسا دی۔ پھر خان اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر ریت پر چلتے چلتے کئی جگہ لائیں چلا کر ریت ہوا میں اچھالی۔ اس وقت وہ غصے

لفظ لفظ مونی

○ دکھ جب پردے میں ہونا تب تک دکھ ہی رہتا ہے اور جب بے نقاب ہو جاتا ہے تو اس کا دوسرا نام کھ ہو جاتا ہے۔
○ دکھ جتنا گہرا آپ کے وجود میں اترتا ہے اتنا ہی زیادہ آپ کے اندر خوشی نائے کی جگہ بناتا ہے۔
○ جس وقت اپنے آپ کو خوش دیکھو اس وقت غور کرنا آپ کے خوش ہونے اور خوشی پیدا کرنے کی جگہ بھی وہی ہے جہاں سے کچھ عرصے پہلے درد اٹھا تھا۔

(حجاب عباس، بھٹ شاہ)

میں بھی تھا اور نروس بھی۔ اسے شاید آج تک ایسی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔
سلطان نے اپنے ہاتھوں میں لگی ہتھکڑی کو دیکھا اور اٹھ کے خان کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”آئی ایم سوری خان۔ مگر وہی اور صاحبہ کے بارے میں جتنا میں جانتا ہوں۔ پولیس فورس میں کوئی بھی نہیں جانتا۔“
اس وقت خان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے جب غصے کی حالت میں اس نے سلطان کے گالوں پر دوز و در طمانحے رسید کیے اور اونچی آواز میں چلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ ٹیس میزے لیے کتنا اہم تھا۔ یہ بات تمہارے علاوہ کون جان سکتا ہے۔ پچھلے مین کیسز میں ہم ناکام رہے تھے۔ اور اس بات کو لے کر وہ جنگیزی میرا کتنا مذاق اڑاتا تھا صرف مجھے نیچا دکھانے کے لئے۔ یہ تمہارے علاوہ کس کو پتہ ہے پھر تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا سلطان کیوں؟ تم نے مجھے دھوکہ کیوں دیا؟ اب میں سب کو کیا منہ دکھاؤں گا کہ میرے اپنے ماتحت نے ہی مجھے ناکام بنانے میں حصہ لیا۔ تم کو سلاخوں کے پیچھے دھکیل کر میں کیسے سب کے سامنے تمہاری تعریفیں کیا کروں گا۔ تم نے میرے

اعتماد میری دوستی کا خون کیا ہے سلطان۔ اوروں کو اس بات کا کیا جواب دوں گا میں۔“

چلا کر یہ کہتے ہوئے خان گھٹنوں کے بل ریت پر بیٹھ گیا اور رونے لگا۔

اپنے سینکڑوں یوں روتے دیکھ کر سلطان بھی رو پڑا اور آہستہ سے اس کے پاس بیٹھ کر اپنے بندھے ہاتھوں سے اس کا سر تھپتھپایا۔ پھر اپنے ہاتھوں کا گھیرا اس کے سر سے گزار کر اس کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں تم کو سب کچھ سچ سچ بتا دیتا ہوں۔ پھر تم بتانا کہ میں کی کو فرار کرانے کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔“

خان اب بھی غصے میں تھا۔ اس نے سلطان کو دھکا دے کر خود سے دور کیا۔ ”تمہارے حلف کا کیا ہوا؟ تم پولیس آفیسر ہو۔ تم کو کسی بھی حال میں کسی کو ایسی چھوٹ نہیں دینی چاہئے۔ چاہے وہ کوئی اپنا سا گاہی کیوں نہ ہو۔“ خان نے چلاتے ہوئے کہا۔

”بھول گیا تھا میں اپنا حلف۔“ سلطان بھی چلا اٹھا۔ ”بھول گیا تھا کہ میں پولیس آفیسر ہوں۔ میرا دماغ سن ہو گیا تھا جب میں نے صاحبہ کی لاش دیکھی تھی۔ پاگل ہو گیا تھا میں۔“

یہ سن کر خان نے سلطان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ”میرے گھر میں ایئر کنڈیشن نہیں ہے۔ ایک پرانی وی ہے جو ٹھیک سے چلتا بھی نہیں ہے۔ فرحین کو دو سال ہو گئے ہیں مجھ سے موبائل مانگتے ہوئے جو میں اسے نہیں دے پا رہا ہوں۔ میری کاری حالت دیکھ ہی رہے ہو کہ کھٹار اسی ہے۔ میں کوئی گھریلو ملازم انورڈ نہیں کر سکتا۔ اپنی بیوی کوئی ساڑھی دلائے ایک زمانہ بیت گیا ہے۔ گھر کے ٹیلی فون بل بجلی کے بل گیس کے بل اور بچن کا مہینہ بھر کا سامان خریدنے کے بعد میری تنخواہ میں سے کچھ بھی نہیں

بچتا۔ یہ تم بھی جانتے ہو کہ اگر میں چاہتا تو کئی دوسرے پولیس والوں کی طرح لاکھوں کروڑوں میں کھیل سکتا تھا۔ مگر آج کے دور میں ایمانداری کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے۔ تمہیں وہ رشید خیل والا کیس یاد ہے؟ کیس کو رفع دفع کرنے کے وہ ہمیں ایک کروڑ روپے دینے کو تیار تھا۔ یاد ہے سلطان؟ اور اگر میں چاہتا تو بڑی آسانی سے سارا کیس رفع دفع کر سکتا تھا۔ میں نے اس کے ایک کروڑ روپے پر لاش مار دی مگر اس کیمنے چنگیزی نے ایک کروڑ کھا کر کیس ختم کر ادیا۔ کیا میں وہ سب نہیں کر سکتا تھا؟ آج میرے پاس بھی کھٹارے کی بجائے امپورٹڈ کار ہوتی۔ شاندار بنگلہ ہوتا۔ میری بیوی کے پاس ایک سے ایک لباس ہوتا۔ میری بہن لیٹس سیل فون لے کر گھوم رہی ہوتی۔ گھر میں ایل ای ڈی ٹی وی اور ایئر کنڈیشن ہوتا۔ ایسے کتنے ہی کیس تھے جن سے میں کروڑوں کما سکتا تھا۔ تم بھی تو میری طرح ایماندار تھے۔ پھر تم کو اس امیر زادے نے کتنے میں خرید لیا کیا بولی لگائی تمہاری ایمانداری کی..... بتاؤ؟“

دونوں ریت پر ہی بیٹھ گئے تھے۔ سورج تقریباً سمندر میں ڈوب چکا تھا اور اس کی سرخ کرنیں خان اور سلطان کے چہرے پر بھی سرخی بکھیر رہی تھیں۔ خود پر رشوت لینے کا الزام سن کر سلطان نے بندھے ہاتھوں سے اپنے سر کو زور سے دبا کر روتے ہوئے کہا۔ ”خان! میرے بھائی..... میں نے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں لی کسی سے۔ یہ بات تمہارے لیے نئی ہوگی کہ صاحبہ میری ہونے والی منگیتر تھی۔ ہماری ایک مہینے بعد منگنی ہونے والی تھی۔ اس کی لاش دیکھ کر میرے دل پر کیا گزری ہوگی، کیا تم اس کا اندازہ کر سکتے ہو؟ تم ہی بتاؤ میں کیا کرتا۔ پانچ ماہ پہلے صاحبہ اور میری دوستی ہوئی اور یہ دوستی چاہت میں بدل گئی۔

اس نے مجھے وہی سے ملوایا۔ وہ واقعی بہت اچھا انسان ہے۔ اس نے میرے اور صاحبہ کی چاہت کے درمیان دولت کی دیوار کو نہیں آنے دیا بلکہ اپنی بہن کی پسند کو دل سے تسلیم کیا۔ اس پر جواز نام لگے وہ بالکل جھوٹ غلط اور بے بنیاد ہے۔ صاحبہ کو وہی نے بہت لاڈ اور پیار سے پالا ہے۔ وہ ایک بھائی ہی نہیں صاحبہ کے لیے باپ کی طرح تھا۔ اور یہ بات اس نے مجھ سے بھی کئی گہری کہ صاحبہ اس کے لیے بیٹی کی طرح ہے۔ وہ کبھی ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ وہ انسان نہیں ہزاروں لوگوں کے لیے مسیحا کا درجہ رکھتا ہے۔ نہایت نیک اور سچا انسان۔ ایسے انسان اب کہاں پائے جاتے ہیں بار۔ ان پانچ مہینوں میں جتنا میں نے اس کو سمجھا ہے کسی اور کو اس کی طرح نہیں پایا۔ یقین کرو دوست اس پر لگائے گئے تمام الزام جھوٹے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے سلطان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اس کی باتیں سن کر خان کو ایک جھک سا لگا۔ وہ حیرت سے سلطان کو تنکے جا رہا تھا۔ پھر کچھ دیر تک دونوں بنا کچھ بولے ریت پر ایسے ہی بیٹھے رہے۔ بالکل خاموش۔ صرف ساحل سے ٹکرائی سمندر کی موجوں کا شور تھا۔ اور شاید ایسا ہی شور ان دونوں کے دلوں میں بھی بچا ہوا تھا۔ دونوں بے خیالی میں سورج کو سمندر میں ڈوبتا دیکھتے رہے۔ پھر خان نے اپنی جیب سے چابی نکالی اور سلطان کے ہاتھ زور سے دے دی۔

”مجھے شروع سے سب بتاؤ۔ اس وقت سے جب صاحبہ کے قتل کا فون آیا تھا اور ہم دونوں وہاں پہنچے تھے۔ وہیں سے شروع کرو۔ مجھے اب کچھ یاد آ رہا ہے کہ تم نے صاحبہ کا ہاتھ تھامنا تھا۔ اور یہ بھی یاد آ رہا ہے کہ تمہارے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ اس وقت تم بہت نروس ہو رہے تھے۔ اور تم مجھ سے کچھ

چھپانے کی کوشش کر رہے تھے اوہ اس وقت اس بات پر میرا دھیان کیوں نہیں گیا۔ تمہاری حالت دیکھ کر میں نے تم سے خیریت پوچھی تھی تو تم نے سر ہلا کر اوکے کہہ دیا تھا اور میں سمجھا کہ شاید ایک لاش کو سامنے دیکھ کر تمہاری یہ حالت ہو رہی ہے۔ مجھے کیا یہ بتا تھا کہ وہ تمہاری ہونے والی منگیتر کی لاش تھی۔ اب تفصیل سے سب سنا دو۔ تم نے وہی سے کب بات کی..... کب اس کے بھاگنے کا پلان بنا۔ سب کچھ۔“

سلطان نے بولنا شروع کیا اور خان ریت پر بیٹھا ڈوبے سورج کی دھیمی روشنی میں سلطان کے چہرے پر نظریں جمائے سنتا جا رہا تھا۔

”جس وقت ہم نے وہی کو حوالات میں بند کیا تھا۔ اس وقت وہ کس حالت میں تھا یہ تو تمہیں یاد ہی ہوگا نا..... وہ ایک ادھ مرے انسان کی طرح تھا۔ ایک پل کے لیے تو اس کو گولی مارنے کا دل ہو گیا تھا۔ میرا جب ہم نے اس کو اس کے گھر سے گرفتار کیا تھا۔ مگر تمہاری اور دوسرے اسٹاف کی موجودگی میں بڑی مشکل سے میں نے خود کو روکا اور کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا۔ ہاں حوالات میں اسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بند کیا تھا۔ یاد ہے نا؟ جب تم نے تفتیش شروع کی تو وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ یہ بھی یاد ہوگا تم کو جب چنگیزی نے بھی اس سے سوال کیے تھے بھی اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ یا تو وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا یا شاید گہرے صدمے کی حالت میں تھا۔ یاد ہے نا خان؟“

”تم بولتے جاؤ۔ میں سن رہا ہوں۔“ خان نے کہا۔

”اس وقت میں صاحبہ کی لاش کے پاس جانا چاہتا تھا۔ اس کو دیکھنا چاہتا تھا مگر مجھے پولیس اسٹیشن میں چھوڑ کر تم خود وہاں چلے گئے تھے۔ تم کو ہسپتال

ہدایت اور اصلاح کا روشن چراغ
ملک مفردینی و اصلاحی رسالہ

الاسلام

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

ممتاز مفکر و دانشور مشتاق احمد قریشی کی زیر ادارت

قیمت: 20 روپے

دینی مسائل کا حل: مولانا سعید احمد جلال پوری

روحانی مسائل: حافظ شبیر احمد

اسلام اخوت بھائی پارے اور تہذیب شاہکی کا مذہب ہے۔

اے دین کو اتار اور تھما ہر مسلمان پر فرض میں ہے۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، ہمیں اسے صحیح سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اس پر عمل کر کے ہی آخرت میں سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔

قارئین کی مشکلات کو مد نظر رکھتے ہوئے اسلام میں چھاپے سلسلہ شروع کیا ہے جن سے عام لوگوں کو دینی مسائل سمجھنے میں آسانی ہو سکے گی۔

دنیا کے اسلام کے تمام مسالک متعلق

علماء کرام کی نگارشات اور آراء پر مشتمل

مذہب گچھ جگ چک چالان اور پڑھنا چاہتے ہیں

پتا: کمرہ نمبر 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

فون: 35260771/2 ٹیکس: 35260773

alislamkhi@gmail.com

اپنے بھائی کے ساتھ اکیلے رہنا چاہتی تھی کیوں کہ ان دنوں کی اپنی مصروفیت کی وجہ سے اسے بہت کم وقت دے پا رہا تھا۔ اس لیے صاحب نے آفس کے اسٹاف یا کسی رشتے دار کو بھی مدد نہیں کیا تھا۔

”پھر کیا ہوا؟“

وکی نے بتایا کہ سب کچھ بہت اچانک ہو گیا۔ ایک پل میں سب کچھ بدل کر رہ گیا۔ اچانک جیسے اچانک ایک گاڑی کسی سے ٹکرائی ہے اور ایک سیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی اچانک ایک پل میں کیا سے کیا ہو گیا۔ وکی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اتنی جلدی اتنا کچھ ہو گیا۔ سب کچھ جاننے کے بعد میں نے وکی کو فرار کرانے کے لیے منصوبہ بنایا۔

اس کی درخواست پر میں نے اسے فون کرنے کی اجازت دی اور اس نے مڈر صاحب کو فون کر کے کہا کہ کسی وکیل کو ہائر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور کمپنی کے کسی بھی فرد کو پولیس اسٹیشن نہ آنے دیا جائے۔ وہ اسی پارٹی والے لایس میں تھا۔ کورٹ جانے سے پہلے میں نے اس کی رقم بھی اسے واپس کر دی تھی۔ میں نے ٹونی کو فون کر کے اس دن کورٹ کے پاس آنے کو کہا۔ اسی ٹونی نے تم کو فون کر کے بینک ڈیپوٹ کی جھوٹی اطلاع دی تھی تا کہ تمہارے جانے کے بعد ہم وکی کو بھگا سکیں۔ تم کو یاد ہوگا کہ جب تم وکی کو کورٹ کے اندر لے گئے تھے تو میں باہر ہی رک گیا تھا وہ اس لیے کہ میں ٹونی کو ساری بات سمجھا سکوں۔ کورٹ سے واپسی پر میں نے ٹونی کو بس ایک مس کال دی تھی جس سے وہ سمجھ گیا کہ اسے کیا کرنا ہے اور اس نے فوراً ہی تم کو جھوٹا فون کر دیا تمہارے جانے کے بعد میں نے گاڑی سے اتر کر ٹونی کو پوری لوکیشن سمجھائی کہ میرے ساتھ کون کون سے اور وکی کس طرف بیٹھا ہے تاکہ وہ اسی طرف موٹر سائیکل لے آئے جس پر بیٹھ کر وکی کو فرار

طرف ڈھونڈ رہے تھے۔ اس وقت وکی گھر پر نہیں تھا۔ پھر صاحب نے آفس فون کر کے وکی سے پوچھا کہ اس نے گلابی پیپر کلپ کہاں دیکھا ہے۔ تب مجھے حیرت ہوئی کہ وکی نے ایک سینڈ ضائع کیے بغیر جواب دیا کہ ایک مہینہ پہلے صاحب نے اس پیپر کلپ کو گاڑی کے گلو بکس میں رکھا تھا۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد رہتی ہیں اس کو۔ اگر کوئی ایک سوئی بھی اس کے سامنے نہیں رکھ دے اور ایک سال کے بعد اس کو ڈھونڈے تو وکی کو یاد رہتا ہے کہ وہ سوئی کہاں رکھی تھی۔ یہ اس کی میموری کا کمال ہے۔ یہ طے ہے کہ وہ کوئی بات نہیں بھولتا۔ اب اس کو کیا یاد تھا یا وہ کیا جانتا تھا یہ تو اس نے نہیں بتایا مگر مجھ سے کہا کہ وہ اصلی مجرم کو ہمارے سامنے لے آئے گا۔ اس نے کہا کہ وہ نہیں چاہتا کہ پولیس اس مجرم کو پکڑے وہ خود اسے پکڑ کر ہمارے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا وہ میرا مان رکھے گا اور اس مجرم کو میرے حوالے کرے گا۔

سلطان تھوڑی دیر خاموش رہا اور اپنی سانس بحال کر کے دوبارہ گویا ہوا۔

”تمہیں پتہ ہے خان کہ اس دن اس کا برتھ ڈے تھا اور اس دن شام میں میری ڈیوٹی تھی تو میں نے دن میں مل کر اسے وش کیا تھا۔ صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ شام کو وہ وکی کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں جائے گی جہاں اس نے وکی کے اعزاز میں ایک سرپرائز پارٹی منعقد کی ہوئی ہے۔ صاحب نے وہاں سے مجھے پولیس اسٹیشن پر فون بھی کیا تھا اور میری ان دونوں سے بات بھی ہوئی تھی۔ رات کے تقریباً آٹھ بجے کا وقت تھا شاید دونوں بہت خوش تھے۔“

”اس پارٹی میں اور کون کون تھا؟“ خان نے بیچ میں پوچھا۔

”کوئی نہیں۔ پرائیویٹ پارٹی تھی۔ اور صاحب

سے پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی لینی تھی۔“ سلطان نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تب میں نے اکیلے میں وکی سے بات کی۔ تمہاری غیر موجودگی میں اس وقت میں انچارج تھا۔ رات کا وقت تھا اور دو حوالداروں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے ان کو باہر چوکیداری کے لیے بھیج کر لاک اپ میں جا کر وکی سے بات کی۔ میرا خیال تھا کہ اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تو مجھے بھی کوئی جواب نہیں دے گا۔ مگر وہ بولا تھا خان۔ وہ چلا کر بولا تھا کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔ اس نے اپنی مری ہوئی بہن کی قسم کھا کر مجھ سے کہا کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔ ہم دونوں کافی دیر ایک دوسرے کی ہانپوں میں صاحب کو یاد کر کے روتے رہے اور اسی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ وہ بہت دھمی دکھائی دے رہا تھا حالانکہ وہ ایسا انسان تھا کہ مشکل سے مشکل حالات کا بھی نہایت سکون سے سامنا کرتا تھا۔ مگر اس وقت وہ ٹوٹا پھوٹا انسان لگ رہا تھا۔ بہن کی موت نے جیسے اس کے اندر سے بھی روح نکشید کر لی تھی۔ وہ ڈسٹرب تھا مگر اس کا دماغ کام کر رہا تھا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا یہ تو پتہ نہیں۔ بس اس نے اتنا کہا کہ میں اسے یہاں سے باہر نکلنے کا موقع دوں۔ وہ کام تمام کر کے واپس اندر آ جائے گا۔“

سلطان نے بولتے ہوئے خان کی طرف دیکھا جو ریت پر بے مقصد انگلیاں پھرا رہا تھا۔ پھر وہ دوبارہ بولنے لگا۔

”وکی حیرت انگیز یادداشت کا مالک ہے۔ وہ ایک بار کسی کو دیکھ لے تو پچاس سال بعد بھی اس کو نہیں بھولے گا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں اسے یاد رہتی ہیں۔ تم اس کی کمپنی کے لوگوں سے پتہ کر سکتے ہو کہ وہ ایک معجزاتی دماغ رکھتا ہے۔ ایک بار مگر میں صاحب کی گلابی رنگ کی پیپر کلپ کھو گئی تھی اور ہم دونوں مل کر چاروں

ہونا تھا۔ اس سے پہلے میں نے وہی کو بتا دیا تھا کہ جس موٹر سائیکل سے ایک لڑکا کسی خاتون کو اتار رہا ہوگا اسے اسی موٹر سائیکل کو استعمال کرنا ہے۔ میں نے مڑ کر وہی کی طرف دیکھا تھا کہ اسے سارا پلان یاد ہے یا نہیں تو اس نے انگوٹھے سے اوکے کا سگنل دیا تھا۔ اس کے بعد سب کچھ پلان کے مطابق ہو گیا اور ٹوٹی بھی ایک ٹیکسی میں بیٹھ وہاں سے نکل گیا۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر فون پر باتیں کرنے کا بہانہ کر رہا تھا تاکہ وہی کو فرار ہونے کا موقع مل سکے۔ بس خان یہ ہے ساری بات۔“

خان نہایت محل کے ساتھ اس کی لمبی چوڑی داستان سن رہا تھا پھر کچھ غصہ بھری مسکراہٹ کے ساتھ کھڑا ہوا اور ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں کو دیکھتے ہوئے سلطان سے پوچھا۔

”اب وہی کہاں ہے؟“

”پتہ نہیں۔“

”سلطان تمہیں سب پتہ ہے۔ مجھے بتاؤ کہ اس وقت وہی کہاں ہے؟“

”نہیں خان۔ واقعی میں نہیں جانتا۔ مگر اتنا مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہے۔“

”ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے میں آخری بار تم سے پوچھ رہا ہوں کہ اس وقت وہی کہاں ہے؟“

خان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”میرا یقین کرو خان۔ واقعی میں نہیں جانتا۔“

”میں نے تمہارا بیان ریکارڈ کر لیا ہے۔ یہ دیکھو۔“ خان نے اوپر والی جیب سے وائس ریکارڈر نکال کے سلطان کو دکھاتے ہوئے کہا۔

”آپ جیسے قابل پولیس انسپکٹر سے ایسی ہی امید کی جاسکتی ہے سر۔“

”کیا وہی نے تم سے کوئی رابطہ نہیں کیا؟“

”نہیں سر۔ بالکل نہیں۔“

خان نے اس کی پیٹھ پر دھب مارتے ہوئے کہا۔ ”کیا پس سر۔ نو سر کی رٹ لگا رکھی ہے۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ تم نے مجھے کس پجوشن میں پھنسا دیا ہے؟ اب میں تمہیں لاک اپ کروں گا اور تم ڈس مس۔ وہ کیا بات ہے ایک دوست نے اپنے دوست کو جیل کروا کے اپنا رتبہ بلند کر لیا۔ واہ۔ سب تالیاں بجائیں گے اور میں.....؟ میں کیا کروں گا سلطان.....؟ کیا یہ سب کر کے میں چین سے جی سکوں گا؟ تم نے مجھے کیا چنگیز کی سمجھ رکھا ہے۔“ خان نے سلطان کے دونوں کندھے جھنجھوڑتے ہوئے چلا کر ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔

سلطان نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے سر جھکا لیا۔

”اب جو میں کہوں گا۔ تم نے وہ کرنا ہے۔ اوکے“

چلو میرے ساتھ۔“

وہاں سے وہ دونوں پولیس میڈل آفیسر کے دفتر پہنچے۔ جو خان کا بہت گہرا دوست تھا۔ خان نے اس سے کچھ باتیں کیں اور ایک لفافہ لے کر سلطان کے ساتھ پولیس اسٹیشن آ گیا۔

پھر اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اردلی سے کہا۔ ”سب انسپکٹر سلطان کو فوراً میرے پاس بھیجو۔“

چند ہی منٹ میں سلطان خان کے سامنے کھڑا سیلوٹ کر رہا تھا۔

خان نے لفافہ سلطان کو دیتے ہوئے کہا۔ ”اس پر عمل کرو ابھی اور اسی وقت فوراً کوٹنگ۔“

سلطان نے لفافہ کھول کر پڑھا اور پھر سیلوٹ کرتے ہوئے روہانے لہجے میں بولا۔ ”لیس سر۔“

تب خان نے اس سے کہا۔ ”ایزی۔ پولیس ڈاکٹر کے مطابق تم بیمار ہو اور تمہیں ہیڈ ریسٹ کے لیے ایک مہینے کی چھٹی گرانٹ کی گئی ہے۔ اس مہینے

میں تم آفس نہیں آؤ گے اور اگر وہی نے تم سے کوئی رابطہ کیا تو تم صرف اور صرف مجھے بتاؤ گے۔ سمجھتے تم؟ اور اگر تم نے مجھ سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش کی تو میں بھول جاؤں گا کہ تم میرے دوست ہو۔ اور ایسا کرنے پر مجھے تمہیں سلاخوں کے پیچھے دھکیلتے ہوئے ذرا بھی افسوس نہیں ہوگا۔“

سلطان کو اس بات کا افسوس تو تھا کہ خان نے اسے اس کیس سے الگ کر دیا تھا۔ مگر وہ اس کا شکر گزار بھی تھا کہ سب کچھ رفع دفع کر دیا تھا ورنہ وہ اس وقت لاک اپ میں ہوتا۔

خان نے اپنے دوست پولیس ڈاکٹر سے کہہ کر سلطان کے لیے جعلی میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوایا تھا تاکہ وہ اس کیس میں شامل نہ رہے اور خان خود چھان بین جاری رکھے۔

خان نے ایک طرف دوتی نبھائی تو دوسری طرف اس نے ایک آفیسر کو اپنے کام میں غلط طریقے سے آگے بڑھنے سے بھی روک دیا۔

☆☆☆☆

ڈی ایس پی چنگیزی کو سلطان کی بیماری پر بہت تعجب ہوا اور اس نے خان سے کہا۔ ”مسٹر خان۔ اب تو شاید آپ کو کیس کے فالو اپ کے لیے کسی اور سب انسپکٹر کی ضرورت پڑے گی؟“

”نو سر۔ خان نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ مل کر بھی کیس حل کر لوں گا۔“

چنگیزی نے ہنستے ہوئے خان کا مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ مگر خان نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔

☆☆☆☆

وقاص جمالی اٹھارہ سال کا تھا جب طیارے کے ایک حادثے میں اس کے ماں باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ صاحبہ وہی سے چھ سال چھوٹی تھی یعنی وہ صرف

بارہ سال کی بچی تھی۔ مدر صاحب نے ان دونوں بہن بھائیوں کو سنبھالا اور تعلیم کے ساتھ ساتھ وہی کو برنس کے طور طریقے بھی سمجھاتے رہے۔ پاور آف اٹارنی مدر صاحب کے نام تھا مگر وہ نہایت ایمان داری کے ساتھ اپنا فرض نبھا رہے تھے۔ جب وہی اکیس سال کا ہوا تو مدر صاحب نے سارا برنس اس کے حوالے کر دیا۔ وہی اپنی بہن صاحبہ سے بہت پیار کرتا تھا اور باپ بن کر اس کی پرورش کی تھی اور صاحبہ کی ہر فرمائش کو پورا کرنا اس کا ایمان تھا۔

وہی اور صاحبہ کی ایک خوبی یہ تھی کہ دونوں کو کھانے پکانے کا بہت شوق تھا اس لیے انہوں نے چین کے لیے کبھی کوئی ملازم نہیں رکھا تھا۔ انہیں اپنے گھر کا کام خود کرنے میں زیادہ مزا آتا تھا۔ کھانا پکانا ان دونوں نے اپنی ماں سے سیکھا تھا کیونکہ وہ بچپن ہی سے چین میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتے رہتے تھے۔ صاحبہ جب کبھی ریشماں کے گھر والوں کی دعوت کرتی تو کھانا خود پکاتی تھی۔ اور بعض اوقات دونوں بہن بھائی مل کر مدر صاحب اور اشاف کے لوگوں کی بھی دعوت کیا کرتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ دونوں بہن بھائی کتنے ایکسپرٹ کک ہیں۔ اور جیسے جیسے صاحبہ بڑی ہوتی گئی کچن کی زیادہ تر ذمہ داریاں وہ سنبھالنے لگی۔ اب وہی آفس جاتے ہوئے گھر کا پکا ہوا کھانا ہی لے جایا کرتا تھا۔

مگر کبھی کبھی دونوں کسی ہوٹل میں بھی لنچ یا ڈنر کے لیے چلے جایا کرتے تھے۔ مدر صاحب اکثر ہنستے ہوئے انہیں کہا کرتے تھے۔ ”اگر دنیا میں سارے امیر تم جیسے ہونے لگے تو پھر نوکر نوکرانیاں بھوکے مرنے لگیں گے۔“

دونوں مدر صاحب کی اس بات پر خوب ہنستے تھے۔ غرض یہ کہ زندگی یونہی ہنستے کھیلتے گزر رہی تھی۔

صاحب بڑی ہوئی تو نہیں تھی مگر وہی کے لاڈ پیار نے اسے سر پر ضرور چڑھا رکھا تھا اور صاحبہ چھوٹی بہن ہوتے ہوئے بھی وہی کی تمام ضرورتوں کا ایسے خیال رکھتی تھی جیسے کوئی ماں اپنے بیٹے کا خیال رکھتی ہے۔ کبھی جب وہ آفس میں وہی سے ملنے جاتی تھی تو مدثر صاحب مذاق میں کہتے تھے۔ ”لگاؤ لگی تمہاری مہی۔“ ایسا بھی ہوتا تھا کہ صاحبہ کالج سے سیدھی آفس پہنچتی تھی اور وہی اسے رات گئے تک آفس میں مصروف رکھتا تھا۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ صاحبہ بھی بزنس کے تمام اصول سیکھ لے۔ وہی کی نگرانی اور مدثر صاحب کی رہنمائی میں صاحبہ آفس کے تقریباً تمام امور سیکھ چکی تھی اور اب تو اس نے کئی معاملات میں فیصلے لینا بھی شروع کر دیے تھے۔ بعض دفعہ کسی معاملے پر وہی بھی الجھ جاتا تھا تو صاحبہ سے ہی رائے لیتا تھا۔

اپنی بزنس اور سماجی سرگرمیوں کی وجہ سے دونوں بہن بھائی کافی مقبول ہو رہے تھے اور جب کسی فنکشن یا پارٹی میں پریس والے وہی کو پائی لائن کرتے تو تصویر میں صاحبہ بھی ضرور ہوتی تھی۔ یوں بزنس کمیونٹی اور نیوز چینل دیکھنے والوں کے لیے دونوں کا چہرہ بہت مانوس تھا۔

ریشماں، صاحبہ کی کلاس فیلو تھی اور اس کی وساطت سے وہ وہی کو بھی جانتی تھی۔ کیونکہ بھی صاحبہ ریشماں کے گھر چلی جاتی تھی تو بھی ریشماں، صاحبہ کے گھر آ جاتی تھی۔ ان کی ڈرائیوری کے فرائض ظاہر ہے وہی کو ہی ادا کرنے پڑتے تھے۔

زیادہ میل جول کی وجہ سے دونوں بہن بھائی ریشماں کے گھر والوں سے بھی کھل مل گئے تھے۔ ریشماں کے ماں باپ بھی دونوں کو بہت پیار کرتے تھے اور ان سے ہمیشہ اپنی اولاد کی طرح سلوک کرتے تھے۔

یوں بھی ہوتا تھا کہ بعض اوقات وہی کو بزنس کے سلسلے میں بیرون ملک جانا پڑتا تھا کئی کئی دنوں کے لیے اس دوران صاحبہ ریشماں کے گھر ہی ٹھہرتی تھی۔

دولت امارت اور بے فکری میں پروان چڑھی صاحبہ پر جو بن خوب ابھر کر آیا تھا اور دن بدن اس کی خوب صورتی میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ خوش لباس بھی تھی اور اپنی چال ڈھال اور چہرے مہرے سے وہ کوئی باؤل دکھائی دیتی تھی۔ کالج یا جب وہ کہیں باہر جاتی تھی تو لڑکے اس کے ارد گرد پروانوں کی طرح منڈلاتے رہتے تھے لیکن کسی میں حد سے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اگر کبھی کوئی غیر اخلاقی جملہ کس بھی دیتا تو وہ درگزر کر جاتی تھی۔ یہی بات وہ ریشماں کو بھی سمجھاتی تھی کہ خوب صورت لڑکی تب ہی خوب صورت کہلاتی ہے جب اسے کوئی لڑکا چھیڑے۔ اس لیے سنو اور نکل لو۔ وہ دونوں آپس میں مختلف لڑکوں کے بارے میں رائے زنی بھی کرتی تھیں کہ فلاں ایسا ہے۔ فلاں ویسا ہے۔ وہ ہینڈسم ہے۔ وہ تو غنڈا انا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک دن جب صاحبہ اور ریشماں ایسے ہی کسی کے بارے میں بات کر رہی تھیں تو وہی نے گزرتے ہوئے سن لیا اور بال سنوارتا ہوا ایکشن سے ان کے پاس آتا ہوا بولا۔

”کیا یہ لڑکیاں میرے بارے میں بات کر رہی ہیں؟“

”ارے جاؤ بھائی۔ تمہارے بارے میں کون بات کرے گا۔“ صاحبہ نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ”ہم تو سلمان خان کی بات کر رہے ہیں۔“ وہی بولا۔ ”اگر کوئی بوائے فرینڈ وغیرہ ہو تو پہلے سے بتا دینا کیونکہ اس کا آگے جانا اور جو دینی پڑے گی۔“ ”ہاں جی۔ صاحبہ کو جو لڑکا پسند آئے گا۔ وہ تو آٹو

میٹ کر ڈپٹی بن جائے گا۔“ ریشماں نے کہا۔ وہی، صاحبہ سے بولا۔ ”ڈیڑ بہنا۔ اگر کوئی بوائے فرینڈ پسند کرنا ہو تو ذرا دیکھ بھال کے ہوشیاری سے کرنا۔ نہیں ایسا نہ ہو کہ وہ صرف تمہاری جائیداد کے چکر میں تمہیں پھانس رہا ہو۔ ہی..... ہی۔“

”بھیا! مجھے کوئی لڑکا تو ڈکا پسند نہیں ہے۔ سب سڑک چھاپ مجنوں ہیں۔ صرف چھیڑ خانی کرتے رہتے ہیں۔ میرے لیے ذلہا تو آپ سلیکٹ کریں گے اور میں تو صرف منظوری یا نا منظوری دوں گی۔“ صاحبہ نے جواب دیا۔

”لو۔ میرا ایک اور کام بڑھا دیا تم نے۔ اب آج کے زمانے میں بہن کے لیے ذلہا بھی مجھے ہی تلاش کرنا ہے۔ کیسی پرانے خیالات کی بہن پائی ہے میں نے۔ دھت۔“

صاحبہ اور ریشماں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ مگر ان دونوں کے حد سے بڑھے ہوئے بے تکلف رشتے سے کچھ لوگ خوش نہیں تھے۔ وہ ہوتے ہیں نا جلتے والے۔ خواہ خواہ تہمت لگانے والے اس دنیا میں۔ جس طرح سے دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چلتے تھے یا جس گرجوشی سے صاحبہ اپنے بھائی کے گلے لگتی تھی وہ کئی میلی آنکھوں کو کھٹکتا تھا۔ کوئی یہ نہیں سوچتا تھا کہ چھوٹی عمر سے وہی نے صاحبہ کی ذمہ داری سنبھال لی تھی اس لیے صاحبہ اس کے ساتھ ہی خود کو محفوظ تصور کرتی تھی اور جب وہ باہر نکلتی تھیں تو تھیں تو وہ ہر وقت اپنے بھائی سے لگی رہتی تھی۔ ایسی ہی کئی اور باتیں تھیں جن کی وجہ سے لوگ چہ گویاں کرتے رہتے تھے۔ عوامی جگہ ہو یا آفس۔ ان دونوں بہن بھائیوں کی یہی بے تکلفی برقرار رہتی تھی۔ آفس میں تو سب جانتے تھے کہ صاحبہ کی کئی بیٹی کی طرح ہے اس لیے وہاں ایسی کوئی

سرسوئی سنائی نہیں دیتی تھی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی پارٹی میں جب صاحبہ دیکھتی کہ کچھ لڑکیاں اس کے بھائی میں دلچسپی لے رہی ہیں پالڑے کے خود اس پر لائن مارنے کی کوشش میں ہیں تو وہ انہیں جلانے کے لیے وہی کی بانہوں میں سمٹ جاتی تھی۔ یہ بات خود صاحبہ نے ریشماں سے بھی کہی تھی کہ وہ ایسا مستی میں کرتی ہے یہ دیکھنے کے لیے لڑکیوں کا کیا رد عمل ہوتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ کمپنی کے سیکورٹی گارڈ نے پولیس اور میڈیا کو ایسا جواب دیا تھا کہ بڑے لوگوں کے بڑے شوق ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ تو صاف صاف کہتے تھے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ یہ نہیں سوچتے تھے کہ ان کا دل ہی کالا ہے جو ایک بہن بھائی کے پاک پیار کی روشنی ان کی آنکھوں سے اوجھل ہے۔

مگر اس دنیا میں ایسے بھی بہت سے لوگ ہیں جنہیں کوئی کام دھام نہیں ہوتا سوائے دوسروں کی کچی زندگی میں دخل اندازی کرنے کے۔ کئی لوگوں نے تو چھپ چھپ کر ان دونوں بہن بھائیوں کی تصویریں لینے کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ یہ سوچتے تھے کہ ایک نہ ایک دن ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر دنیا والوں کو دکھادیں گے کہ ان دونوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ ایسے لوگوں میں کچھ خواتین بھی تھیں اور زیادہ تر ایسی خواتین جنہیں وہی زیادہ لفٹ نہیں کرواتا تھا۔ وہ بھی آپس میں باتیں کیا کرتی تھیں کہ آخرو کی شادی کیوں نہیں کر لیتا.....؟ پچیس سال کا ہو گیا ہے۔ امیر ہے۔ گھر میں جوان بہن ہے۔ اس کو تو اب شادی کر لینی چاہئے۔ اس وقت ایک زیادہ ہی دل جلی لڑکی نے جواب دیا۔ ”ارے گھر میں بیوی کس لیے ہوتی ہے۔ بستر گرم کرنے کے لیے نا اور جب صاحبہ جیسی جوان اور گرم بہن گھر میں موجود ہے تو

بیوی کی کیا ضرورت ہے وہی کو۔“

حلقہء احباب میں سب سے زیادہ کریدا جانے والا موضوع ہی صاحبہ اور وہی کے تعلقات تھے۔ ایسی ہی غلط فہمی کی وجہ سے جہاں کہیں بھی دونوں موجود ہوتے تو لڑکے لڑکیوں کا ہجوم لگ جاتا تھا۔

ایک بار دونوں دونوں بہن بھائی کسی پارٹی کے دوران صوفے پر بیٹھے تھے اور لاشعوری طور پر وہی کا ایک ہاتھ صاحبہ کے گھٹنے پر تھا۔ فلیش چمکے اور دوسرے دن یہ تصویر اخبار کی زینت بن چکی تھی۔ اگرچہ کوئی ایسی ویسی بات نہیں لکھی گئی تھی۔ لیکن میلے دل والوں کو اس میں بھی میل نظر آیا اور تصویر پر معنی خیز تبصرے ہونے لگے۔

پھر وہ دن آیا جب وہی کا ہاتھ ڈپے تھا۔ صاحبہ بہت ہی خوش تھی اور ایکسائینڈر بھی بہت تھی کیونکہ اس نے اپنے بھائی کی سالگرہ کو یادگار بنانے کے لیے بہت کچھ پلان کر رکھا تھا۔

اس نے ریشمال کو بتا دیا تھا کہ وہ اپنے بھائی کی سالگرہ خاص طریقے سے منانا چاہتی ہے۔ تو ریشمال نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ کسی بڑے ریسٹورنٹ میں وہی کے لیے برتھ ڈے ڈنر کا اہتمام کرے اور ہوٹل منیجر کو بتادے کہ یہ سب وہی کی سالگرہ کے حوالے سے انتظامات کرنے ہیں۔

”میں بھیا کے ساتھ بالکل اکیلے وقت گزارنا چاہتی ہوں۔ اس پارٹی میں کوئی بھی نہیں ہوگا۔ سوائے میرے اور بھیا کے۔“ صاحبہ نے خوشی کہا۔

ریشمال نے شرارتی لہجے میں پوچھا۔ ”کیا تمہارا پیارا سب انسپکٹر بھی نہیں؟“

ریشمال سلطان سے مل چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ صاحبہ کی سلطان سے پہلی شناسائی ایک فنکشن کے دوران ہوئی تھی جہاں اسے کار سے نکلنے پر لوگوں کی

دھکم پیل سے بچانے کے لیے سلطان آگے بڑھا تھا اور اپنی حفاظت میں اسے اس تک پہنچایا تھا۔ یہ ایک کان کنکشن تھا۔ جہاں فرحین بھی موجود تھی جہاں اس نے پہلی بار وہی کی تقریر سنی تھی اور بہت متاثر ہوئی تھی اس کے خیالات سے۔ فرحین متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی مگر کانج کی وجہ سے اس کی ریشمال سے دوستی تھی اور ریشمال کی وجہ سے وہ صاحبہ کو بھی جانتی تھی۔ مگر اس دن سے وہ وہی کی پرستار بن گئی تھی۔ بہت سارے طالب علموں کے جبرمٹ میں فرحین بھی وہی کا آؤگراف لینے میں کامیاب ہو گئی تھی اگرچہ وہی کے ساتھ تصویر بھی بنوانا چاہتی تھی مگر یہ ممکن نہیں ہو سکا تھا بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے۔

اس روز صاحبہ کی نظروں کا مرکز سلطان تھا اور وہ رہ رہ کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ عام پولیس والوں کے برعکس وہ بہت پینڈرم اور متناسب بدن کا مالک تھا اور پولیس کی وردی اس کے جسم پر بہت بیچ رہی تھی۔ صاحبہ بار بار ریشمال کو کہنی مار کر اسے سلطان کو دیکھنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ اس طرح اس ایک بات سے صاحبہ اور سلطان کی لواستوری کا آغاز ہوا۔

اس کے بعد گاہے بگاہے ان کی ملاقاتیں ہونے لگیں اور یہ ملاقاتیں محبت میں بدلتی گئیں لیکن سلطان ایک ذمہ دار پولیس آفیسر تھا اور اس کی ڈیوٹی ایسی تھی کہ وہ پیار محبت کے لیے بہت کم وقت نکال پاتا تھا۔ وہ زیادہ تر ایس ایم ایس یا موبائل پر ہی بات کر لیا کرتے تھے۔

اور جب ایک کھلے کی دوری بھی سلطان کو کھلنے لگی تو تقریباً تین مہینے پہلے وہ ہمت کر کے جمالی ہاؤس پہنچ گیا اور وہی کے سامنے اپنی اور صاحبہ کی محبت کا اظہار کر دیا۔ وہی نے صاحبہ کی طرف دیکھا اور اپنی بہن کی آنکھوں میں سلطان کے لیے جذبات کو سمجھتے ہوئے معاشرتی اونچ نیچ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے

دونوں کا رشتہ قبول کر لیا۔

اب جب بھی سلطان کو موقع ملتا وہ جمالی ہاؤس پہنچ جاتا اور جب بھی جاتا صاحبہ کے لیے کوئی نہ کوئی تھہ ضرور لے جاتا تھا۔ اپنی بہن کی تڑپ دیکھتے ہوئے وہی نے طے کر لیا اور سلطان سے کہہ دیا کہ اگلے مہینے ان دونوں کی منگنی کر دی جائے گی۔ سلطان کے تو خوشی کے مارے پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ بھرپور طریقے سے اپنی منگنی کی تیاری میں لگ گیا۔ مگر ابھی تک اس نے اپنے کسی دوست یا ر کو اس بات سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عین وقت پر دھماکہ کر کے سب کو حیران کر دے کہ وہ صاحبہ جمالی کو حیت چکا ہے۔

ادھر صاحبہ نے بھی اپنی پسند کے مطابق ملبوسات، جیولری اور دیگر مصنوعات کا انتخاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہی بھی اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا شاپنگ کے دوران اور اسی بیچ وہی کی سالگرہ کا دن آ گیا۔ وہی نے بھی صاحبہ سے یہی کہا تھا کہ منگنی کے وقت ہی دنیا والوں کو پتہ چلنا چاہئے کہ صاحبہ کی منگنی سب انسپکٹر سلطان کے ساتھ طے پاگئی ہے تب تک یہ بات خفیہ رہنی چاہئے۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب صبح صاحبہ سے گلاب کا تھہہ پاکر وہی آفس چلا گیا اور جاتے جاتے صاحبہ نے اسے سختی سے تاکید کی تھی کہ چاہے آندھی طوفان آئے چاہے زلزلہ اسے کسی بھی حال میں شام پنج بجے گھر پہنچ جانا چاہئے کیونکہ اس شام وہ اپنے بھیا کی برتھ ڈے اکیلے اس کے ساتھ منانا چاہتی ہے اپنی شادی سے پہلے۔ صاحبہ کا کہنا تھا کہ اگلے سال وہ اس دن سلطان کے گھر ہوگی تو وہ اپنی مرضی سے اپنے بھیا کا برتھ ڈے نہیں منا پائے گی۔ وہی نے ہنستے ہوئے وعدہ کیا کہ وہ چار بجے ہی لوٹ آئے گا۔

دوپہر میں صاحبہ نے چوکیدار اور مالی کو دس ہزار روپے دیتے ہوئے کہا۔

”آج بھیا کی سالگرہ ہے۔ اس خوشی میں تم دونوں کا اپیشل بونس اور ایک دن کی چھٹی۔ آپ بھی جا کر آج کا دن اپنے گھر والوں کے ساتھ گزاریں۔ موج مستی کریں۔ بچوں کو گھمانے لے جائیں۔ مٹھائی کھلائیں۔“

صاحبہ نے شہر کے مضافات میں ایک خوب صورت مقام پر بنے ریسٹورنٹ میں بکنگ کروالی اور منیجر کو سمجھا دیا کہ شام سات بجے وہ اپنے بھیا کی سالگرہ کا جشن منائے گی اور سارے انتظامات اپنی مرضی کے تحت آؤ رکھے۔ منیجر نے ایک گوشہ ان کے لیے ریزرو کر لیا جو باقی نشستوں سے قدرے ہٹ کر تھا اور منیجر نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں ہم اسے اتنی خوب صورتی کے ساتھ سجادیں گے کہ آپ کو کوئی کمی نظر نہیں آئے گی۔ اس کے بعد صاحبہ خوشی خوشی گھر واپس آ گئی تھی۔

وہی شام چار بجے گھر واپس آ گیا تھا اور جب سے اس نے آفس سنبھالنا شروع کیا تھا تب سے وہ صاحبہ کو بہت کم وقت دے رہا تھا۔ اس لیے اب موقع ملتے ہی دونوں بہن بھائی خوب موج مستی کر رہے تھے اور شام سات بجے وہ تیار ہو کر ریسٹورنٹ پہنچ گئے۔ وہاں کا ہر انتظام صاحبہ کی مرضی کے عین مطابق ہی ہوا تھا۔ اور یہ سب دیکھ کر وہی حیرت انگیز خوشی کے ساتھ اپنی بہن کو دیکھ رہا تھا کہ اس کی سالگرہ کو یادگار بنانے کے لیے صاحبہ نے کیا کچھ کر لیا تھا۔ اب تک سب اچھا چل رہا تھا۔ کھانا پینا اعلیٰ معیار کا تھا۔ دھیمی موسیقی، کینڈل لائٹ کی مدھم روشنی۔ وہی خوش تھا اور صاحبہ اس بات سے خوش تھی کہ اس کی کوشش اس کے بھیا کو پسند آئی تھی۔

دونوں دنیا جہان کی باتیں کر رہے تھے اور ان باتوں میں رات کے آٹھ بج گئے تھے۔ صاحبہ نے اس رات بہت خوب صورت لباس پہنا ہوا تھا۔ ان سے کچھ دور ایک میز کے گرد پانچ آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی توجہ اپنے کھانے سے زیادہ صاحبہ پر تھی۔ ان میں سے ایک صاحبہ کو گھورتے ہوئے گندے گندے جملے کس رہا تھا جس سے اس کے ساتھی پوری طرح سے محفوظ ہو رہے تھے اور ان کی طلب میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ ان دونوں بہن بھائی کو جانتے تھے۔ مگر وہ بھی اسی گندی سوچ کے مالک تھے اور بھائی بہن کے تقدس بھرے رشتے پر ذومعنی جملے کر رہے تھے۔

”مگر یہ کیسے پتہ چلے گا کہ ان دونوں کے بیچ واقعی ایسے تعلقات ہیں یا لوگوں کی اڑائی ہوئی افواہیں۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”آج رات سب پتہ کر لیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔ تم سب تیار ہو کر نہیں؟“

سب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

ان شیطانوں کی باتوں سے بے خبر دونوں بہن بھائی اپنے طریقے سے بے فکر ہو کر سالگرہ کو انجوائے کر رہے تھے۔ رات کے کوئی ساڑھے دس بج رہے تھے جب وہی اور صاحبہ گھر جانے کے لیے ریستورنٹ سے باہر نکلے۔ پارکنگ تک جاتے ہوئے دونوں نے ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالی ہوئی تھیں۔

ایک طرف وہ پانچوں بھی موجود تھے۔ ”یہ بھائی بہن ہیں یا عاشق معشوق؟ آج تو ضرور کچھ ہوگا اور ہم چھپ کر ان کی فلم بنائیں گے۔ کیوں دوستو؟“

سب نے ہاں میں سر ہلایا اور وہی کے تعاقب کی تیاری کرنے لگے۔

کار میں بیٹھے ہوئے صاحبہ نے سلطان کو فون کر کے بتایا اب وہ گھر واپس جا رہے ہیں۔ اس دوران وہی کار ڈرائیو کرتا رہا۔ راستے میں صاحبہ نے وہی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”بھیا اب تمہیں بھی شادی کر لینی چاہیے کیونکہ میرے بعد تم اکیسے رہ جاؤ گے اور تمہارا خیال رکھنے والا کون ہوگا گھر میں۔“

اس کی بات پر وہی صرف مسکرا کر رہ گیا۔

”بھیا آج تو اپنا راز مجھے بتا ہی دو۔“

”راز۔ کون سا راز؟“ وہی نے حیرت سے پوچھا۔

”یہی کہ آخر تم اتنے کول کیسے رہتے ہو۔ اپنے دماغ کو اتنا ٹھنڈا کیسے رکھتے ہو۔ نہ کبھی کسی پر غصہ۔ تمہیں کبھی غصہ بھی آتا ہے یا نہیں۔ بتاؤ نا۔“

پرخصا یا سب آپ کو؟“

وہی نے مسکرا کر اپنے سر کو نامیں ہلایا اور پیار سے صاحبہ کے گال پر چٹکی بھری۔

”بچپن سے آج تک میں نے تم کو کبھی ناراض ہوتے دیکھا ہے نہ غصہ کرتے۔ تم ہمیشہ ٹھنڈے رہتے ہو۔ کسی بھی حالت میں تم اتنے پرسکون کیسے رہتے ہو۔ مٹی پاپا میں سے کون ایسا تھا؟“

وہی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں مٹی پر گیا ہوں۔ وہ بالکل ایسی تھیں۔ بالکل پرسکون۔ میں نے بھی مٹی کو غصہ یا ناراض ہوتے نہیں دیکھا۔ اور تم پاپا پر گئی ہو۔ کبھی بھی کتنا ٹینشن لے لیتی ہو اور کتنا غصہ کرتی ہو تم۔“

”اچھا ایک بات بتاؤ۔“ صاحبہ نے پوچھا۔ ”اگر کسی نے مجھے پھڑماتا تو کیا تب بھی تمہیں غصہ نہیں آئے گا۔ اس آدمی کو جانے دو گے؟“

”پہلے تو میں یہ جاننے کی کوشش کروں گا کہ اس

نے تمہیں تھپڑ کیوں مارا۔ ہو سکتا ہے کہ غلطی تمہاری ہی ہو۔“

اس بات پر صاحبہ نے وہی کو جھنجھوڑا اور پھر اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

وہ پانچوں تعاقب کے دوران یہ سب دیکھ رہے تھے کیونکہ ان کی ہیڈلائٹس کی روشنی وہی کی کار کے اندر پرانی تھیں۔

صاحبہ نے جس انداز سے وہی کے کندھے پر سر رکھا تھا اس سے وہ پانچوں غلطی کا شکار ہو گئے تھے کہ شاید دونوں چلتی کار میں بوس و کنار کر رہے ہیں۔ انہی باتوں کے دوران وہ دونوں کاریں آگے پیچھے جہاں باؤس پہنچ گئیں۔

گیٹ کے سامنے رک کر وہی صاحبہ کو دیکھنے لگا۔

”ہاں دو گے تو وہ گیٹ کھولے گا نا۔“ صاحبہ نے کہا۔

”کمال ہے۔ میں چار بجے واپس آیا تھا تب تم نے گیٹ کھولا تھا یہ کہتے ہوئے کہ تم نے ملازموں کو جھٹھی دے دی ہے میری سالگرہ کی خوشی میں۔“

تب صاحبہ جلدی سے اپنی زبان دانستوں میں دبائی ہوئی گیٹ کھولنے کے لیے کار سے نکلی۔ ”اوہ“ میں بھول گئی تھی۔ مگر مجھے پتہ ہے تم کچھ نہیں بھولتے میرے آقا۔“ اور وہ ہنستے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

پیچھے آنے والی کار نے اپنی بتیاں بجھا دی تھیں اور اب وہ دھیرے دھیرے آگے آ کر دس میٹر کی دوری پر رک کر دیکھنے لگے۔

صاحبہ کار کے آگے آئی تو کار کی ہیڈلائٹس کی وجہ سے اس کا بدن لباس میں جھلکنے لگا۔

”دیکھو۔“ ان میں سے ایک بولا۔ ”وہی بھی وہی دیکھ رہا ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ دیکھو۔“

اس دوران وہی کار کو گیٹ کے اندر لے جا چکا تھا۔ کار کو گیرج میں بند کرتے ہوئے اس نے صاحبہ سے کہا۔

میں نے ایک کمپنی سے بات کر لی ہے وہ ہمارے گیٹ کو ریموٹ کنٹرول سے چلنے والا بنا دیں گے۔ میں کار میں بیٹھے بیٹھے ہی ریموٹ سے گیٹ کھول لیا کروں گا۔ اور کچھ دنوں بعد گیرج کا دروازہ بھی ریموٹ سے کنٹرول ہوگا۔“

گھر کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے صاحبہ نے کہا۔ ”بھائی آپ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی نہیں بھولتے۔ آپ کے دماغ میں ایسی کون سی اسپیشل چیز ہے۔ آج تو بتا ہی دو۔“

”ارے میں کیا جانوں۔ میری یادداشت اچھی بلکہ بہت اچھی ہے۔ مگر کیسے اتنی اچھی ہے۔ مجھے کیا پتہ؟“ وہی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”ابھی ایک مہینہ پہلے آپ کو یاد تھا کہ میں نے اپنی چھوٹی سی گلابی پیپر کلب گاڑی کے گلوکس میں رکھی تھی۔ حالانکہ مجھے بالکل بھی یاد نہیں تھا۔ لگتا ہے بعد میں آپ کے دماغ کو میوزیم میں رکھنا پڑے گا۔ تاکہ سائنسدان ریسرچ کر سکیں کہ آخر ایسی کیا اسپیشل بات ہے آپ کے دماغ میں۔ یہی ہی اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ زندگی میں کسی آدمی کو ایک بار دیکھ لیں تو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ ہیں نا بھائی؟“

”جب میں چیزوں کو نہیں بھولتا۔“ وہی نے جواب دیا۔ ”تو آدمی کی شکل تو میں سو سال تک نہیں بھول سکتا۔“ یہ کہہ کر اس نے صاحبہ کے گال پر ایک بوسہ دیا اور دونوں گھر کے اندر چلے گئے۔

باقی آئندہ

ملکہ جہنم

طاہر قریشی

ایک نوشیزہ کا فسادہ، کچھ ظالموں نے اسے نہ صرف ہامال کیا بلکہ اس کی محبت کو بھی اس کے سامنے قتل کر دیا تھا۔ انتقام کی آگ میں سلگنے والی ایک روح کی روئاد، وہ اپنے دشمنوں کے لیے موت کا دوسرا روپ بن گئی تھی۔

مغرب سے درآمدہ ایک خوب صورت کہانی جسے آپ مدتوں فراموش نہیں کر سکیں گے

وہ خانہ بدوشوں کے ڈیرے میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال کے تاثرات تھے لیکن وہ تنہائی محسوس نہیں کر رہی تھی کیونکہ لوگوں کے ساتھ کرسمس کے ملے میں نہ جانے کا فیصلہ خود اس کا اپنا ہی تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ملے میں کیا ہوگا۔ لوگ رقص کریں گے گائیں گے اور کسی لڑکی کو بھلا پھسلا کر اسے اس کی متاع حیات سے محروم کر دیں گے۔

کرسمس کے موقع پر ہر سال وہ اسی طرح اکتاہٹ بے زاری اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جاتی تھی اور اس کی کنپٹیوں میں خون ٹھوکر میں مارنے لگتا تھا چنانچہ جب خانہ بدوش قبیلے کے سردار نے اسے بھی ملے میں ساتھ چلنے کو کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا تھا اور پھر وہ خانہ بدوشوں کو پیچھے بندروں اور کتوں سمیت ملے میں جانے کے لیے روانہ ہوتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔ جب وہ لوگ پہاڑ کے عقب میں گم ہو گئے تھے تو اس نے ایک طویل سانس لے کر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

ڈیرے میں اب خاموشی اور خنکی کا راج تھا کل شدید برفباری ہوئی تھی اور دور دور تک برف سفید ریت کی طرح پھیلی نظر آرہی تھی۔ برف کے نیچے کہیں کہیں سبز گھاس کے تنکے بھی نظر آرہے تھے

سال پہلے والا کرسمس بھی اچھی طرح یاد تھا۔ وہ سردی یا پھر اس کرسمس کے کرب کی وجہ سے کانپ گئی جس کی تلخ تکلیف وہ اور بد نما دیا دیں آج بھی اس کے ذہن میں موجود تھیں۔ وہ انہیں فراموش نہیں کر سکتی تھی۔

وہ خیالوں میں ڈوب گئی۔ ٹھیک چار سال قبل وہ البانیہ میں تھی۔ خانہ بدوشوں کے قافلے نے اک ایسے ہی پہاڑی علاقے میں ڈیرہ بنایا تھا اور کرسمس کے میلے میں حصہ لینے کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ ان دنوں وہ ہر وقت مسکراتی رہتی تھی۔ لوگوں نے اس کا نام ہی اسمائنگ گرل رکھ دیا تھا۔ وہ متبسم و شیزہ بھی اور اس کی اس مستقل مسکراہٹ کا سبب مارٹن تھا۔

”مارٹن.....!“ وہ ایک جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔ خون اس کی کنپٹیوں پر ٹھوکر میں مارنے لگا اس کے چہرے کی رنگت زرد ہو گئی۔ ہونٹ ترننے لگے۔ حلق میں کانٹوں جیسی چھین محسوس ہونے لگی۔ ”مارٹن“ اس نے ہونٹوں پر خشک زبان پھیر کر ایک طویل سانس لی اور ماضی کے تاریک جھروکے میں جھانکنے لگی۔

☆.....☆.....☆

وہ مارٹن کی دوبانی تھی۔ مارٹن عمر میں اس سے ایک سال چھوٹا تھا لیکن عمروں کے اس تضاد کی وجہ سے ان کی جاہت کبھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ وہ بھی اس سے محبت کرتا تھا۔ دونوں ڈیرے سے دور کسی درخت کی اوٹ میں بیٹھے مستقبل کے خواب دیکھتے رہتے تھے۔ مارٹن کا تعلق بھی خانہ بدوشوں ہی سے تھا لیکن وہ اپنی کی طرح اس زندگی سے نجات حاصل کر کے شہر میں آباد ہونا چاہتا تھا۔ دونوں ایک چھوٹی سی جنت بنانے کے خواب دیکھتے رہتے تھے

اگلی صبح جب وہ لٹی پٹی ڈیرے میں واپس آئی تو پادری مارٹن کی آخری رسوم ادا کر رہا تھا۔ پولیس بھی

موجود تھی۔ جارج اور اس کے ساتھیوں پر قتل عہد اور ان کا مقدمہ قائم ہو چکا تھا مگر وہ گرفتاری سے قبل ہی فرار ہو چکے تھے۔
اینی ٹوٹ کر بکھر گئی۔

اس کے سنے سنے ہی رہے۔ مارٹن کبھی واپس نہ آنے کے لیے چلا گیا اور پھر شوخ و شنگ اینی نے جب سنبھال لیا تو وہ بالکل ہی بدلی گئی تھی۔ اس نے زندہ رہنے کا فیصلہ کیا اور ہر مرد سے انتقام لینے کا عزم کر لیا۔

”مارٹن.....!“ اس نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زیر لب کہا مارٹن کو اس کی سیاہ زلفیں بہت پسند تھیں وہ کہتا تھا کہ تمہاری سیاہ آنکھوں میں زندگی کے دیپ روشن ہیں۔ تمہارے رخساروں میں سورج کی چمک ہے اور تم زندگی کا سورج ہو۔

سردی اور بڑھی تو وہ غار میں چلی آئی ایک جگہ الاؤ کے انگارے دبک رہے تھے اس نے ایک موم بتی تلاش کر کے روشن کی لیکن اندھیرا کم نہ ہوا۔ اس نے دوسری موم بتی بھی جلائی۔ پھر وہ اپنے سرد ہاتھ گرمانے کے لیے الاؤ کے قریب بیٹھ گئی۔ کچھ دیر

بعد اس نے غار کا جائزہ لیا۔ قریب ہی اسے لکڑیوں کا ڈھیر نظر آیا اور پھر کیتی بھی لگئی۔ فرش پر کبل اور کھالیں بکھری ہوئی تھیں اور ایک کونے میں سواکیہ کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ یہ خانہ بدوشوں کی مخصوص اور تیز ترین شراب تھی۔ جس کی عادت اسے مارٹن کی موت کے بعد پڑی تھی۔ تمام لوگ اس شراب کی تیزی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چھت کے ساتھ ایک کنڈے میں جھولتی ہوئی ران دیکھ کر اس کے منہ میں پانی پھیر آیا جیسی ہوئی نمکین ران سے بھی اسے بڑی رغبت تھی۔ چار سال پہلے وہ مارٹن کے

لیے بڑی مہارت سے رانیں بھونتی تھی۔ وہ مسکرانے لگی۔ رات بھر سونے اور پیٹ بھر کر کھانے کے بعد وہ صبح ہوتے ہی شکار کو جا سکتی تھی۔ شکار گوشت میں ایک کلب کا کلرک اس کا دوست تھا جس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے رقاصہ کی حیثیت سے ملازمت دلا دے گا۔

اینی بوں میں ایک سگریٹ دبا کر کچھ سوچنے لگی پھر اس نے تاش کے پتے نکالے اور اپنی قسمت کا حال دیکھنے لگی۔

اس نے پتے اچھی طرح پھینٹ کر دو گڈیوں میں تقسیم کیے اور پھر ان دو گڈیوں کی چار گڈیاں بنالیں آنکھیں بند کر کے ایک گڈی پر انگلی رکھی یہ اس کے بائیں ہاتھ سے تیسری اور دائیں ہاتھ سے دوسری تھی۔ اس نے پانچواں پتا نکالا۔
”حکم کا بادشاہ“ وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔

اس کی عمر بیس سال تھی لیکن وہ زمانے کی سختیاں جھیلنے جھیلنے تیس بیس سال کی لگنے لگی تھی پھر حکم کا بادشاہ دیکھتے ہی وہ بوڑھی لگنے لگی لیکن یہ تاثرات صرف ایک لمحے کے لیے برقرار رہے اور اس کے بعد وہ پہلے کی طرح بیس سال کی لگنے لگی۔

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے سر ایسی کتنی قوت ہے۔ مارٹن کی زندگی میں وہ ہر نیچر کی نازک تھی لیکن اس کی موت کے بعد شرابی جیسی خونخوار ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ستاروں کے حسن کے بجائے سختی اور عیاری آ گئی تھی۔ اس نے بڑے گلے کا بلاؤز پہن رکھا تھا اس کے ہاتھوں میں دھات کی رنگین چوڑیاں تھیں۔ پیروں میں پنڈلیوں تک لوہے کے کڑے تھے اور کان کی لوؤں میں سکے نمابندے جھول رہے تھے وہ حکم کے بادشاہ کو غور سے دیکھتی رہی اور پھر اس کے چہرے پر

سفاکی کے تاثرات نمودار ہونے لگے۔

حکم کا بادشاہ ایک مرتبہ نیو جرسی میں بھی سامنے آیا تھا اور اگلے ہی روز وہ جیل پہنچ گئی تھی۔ ایک مرتبہ سینٹ ہیلن میں بھی نکلا اور چوتھے روز اس کے ہاتھوں ایک شخص مارا گیا تھا اور ایک مرتبہ یہ پتا اس وقت نکلا تھا جب وہ مارٹن کے ساتھ تھی تو اگلے ہی روز مارٹن قتل ہو گیا تھا۔

اس نے حکم کے بادشاہ کو نظروں میں رکھتے ہوئے غار کی دیوار سے ٹیک لگالی۔ ”اب کیا چاہتے ہو؟“ اس نے حکم کے بادشاہ سے پوچھا۔ ”کیا مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کراؤ؟ لیکن سینٹ ہیلن میں جس شخص کو میں نے قتل کیا تھا وہ اسی سزا کا مستحق تھا کسی بچی کو اغوا کر کے اس کی آبرو سے کھیلنے والے کی یہی سزا ہو سکتی تھی۔ وہ بچی صرف نو سال کی تھی اور میری آنکھیں اس کو تڑپتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ میں خود پر قابو نہ رکھ سکی اور اس درندے کو قتل کر دیا۔“

معا اس نے بڑی حقارت سے حکم کے بادشاہ پر تھوک دیا تو اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ سردی بڑھ گئی ہے۔ اس نے اٹھ کر سواکیہ کی بوتل اٹھائی اور غنا غٹ لٹی گھونٹ لی گئی۔ شراب کسی تیز دھار چاقو یا شرارے کی طرح حلق اور سینے کو کاٹتی اور کھر پتی چلی گئی۔

”آہ کتنا سکون مل رہا ہے۔“ اس نے آستین سے ہونٹ پونچھتے ہوئے کہا۔ وہ بوتل رکھنے ہی والی تھی کہ چونک پڑی اس نے سماعت پر زور دیا اور پھر کسی بلی کی طرح تیزی سے لیکن بے آواز چل کر غار کے تاریک حصے میں چھپ گئی۔ یہ حصہ غار کے دروازے سے زیادہ دوں نہیں تھا۔
قدموں کی آہٹ قریب آ گئی تھی کوئی غار کی

طرف ہی آ رہا تھا۔ اس کی نظریں باہر اندھیرے میں آنے والے کو تلاش کرنے لگیں اور پھر وہ اسے نظر آ گیا۔

حکم کا بادشاہ۔ اس کا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔

”کیا اندر کوئی ہے؟“ آنے والے کی آواز غار میں گونچی اور پھر سنگی دیوار سے ٹکراتی ہوئی گم ہو گئی۔ یہ یقیناً کوئی اجنبی تھا مگر پولیس والا نہیں تھا۔

وہ بلا خوف و تردد سامنے آ گئی۔ ”کیا چاہتے ہو؟“ اس نے سپاٹ لہجے میں اجنبی سے پوچھا۔

”مجھے سردی لگ رہی ہے اور میں راستا بھول گیا ہوں کیا مجھے سر چھپانے کی جگہ مل سکتی ہے؟“ اینی نے بجھا ہوا سگریٹ سلگا لیا ماچس کی ہلکی سی روشنی میں اس نے اجنبی کے چہرے کی طرف دیکھا مگر پہچان نہیں سکی۔ اسے صرف اتنا اندازہ ہو سکا کہ اجنبی نے کوئی ایسا ماسک پہن رکھا ہے جس کی وجہ سے اس کی شکل بدلی ہوئی ہے۔ ”آ جاؤ اندر الاؤ جل رہا ہے۔“

اجنبی نے قدم آگے بڑھائے تو اینی یہ دیکھنے میں کامیاب ہو گئی کہ وہ لنگڑا رہا ہے۔ ”آہ..... ایک لنگڑا اس موسم میں اگر راستا بھول جائے تو۔“

”بڑا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔“ اجنبی نے شاید ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔ اینی نے الاؤ میں لکڑیوں کے چند ٹکڑے ڈال دیے اور پھر اجنبی کی طرف دیکھا۔ وہ دراز قد تھا اینی کو صرف اتنا ہی اندازہ ہو سکا کیونکہ اس کا چہرہ ربر کے ماسک سے چھپا ہوا تھا۔ ”تم نے نقاب کیوں لگا رکھی ہے۔“

”میرے چہرے پر بد نما دھبے ہیں اس لیے میں ہر وقت ماسک پہن رکھتا ہوں۔“ اجنبی کا لہجہ عجیب سا تھا۔ اس کی آنکھیں اینی پر مرکوز تھیں اور

اپنی کو یقین تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔

”اپنی قسمت دیکھ رہی تھیں؟“ اجنبی نے تاش کے پتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں اور میری قسمت میں حکم کا بادشاہ نکلا ہے جو شاید تم ہو۔“

”میں جانتا ہوں۔“

”کچھ پیو گے۔“

”میں شراب نہیں پیتا۔“

”تب پھر زندگی کی لطافتوں سے بھی ناواقف ہو۔“ اجنبی نے ایک گلاس میں سوا کینڈیلٹے ہوئے جواب دیا۔ ”ویسے خوش قسمت ہو کہ اس موسم میں تمہیں یہ غائل گئی۔“

”ہاں تمہاری تلاش میں مجھے بڑی ٹھوکریں کھانی پڑی ہیں۔“

اجنبی منجھل کر بیٹھ گئی اس کی آنکھیں جلنے لگیں اور ان میں غصیلی ناکن جیسی چمک پیدا ہو گئی۔ ”تم کون ہو اجنبی اور مجھے کیوں تلاش کر رہے تھے میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

”لیکن میں تم سے اچھی طرح واقف ہوں کئی بار تمہیں دیکھ بھی چکا ہوں۔“ اجنبی نے جواب دیا۔

”کہاں؟“ اس نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کئی مقامات پر..... کئی بار.....!“

”تم جھوٹے ہو۔“ وہ چیخ پڑی۔

”میں نے آخری بار تمہیں نیو جرمنی میں دیکھا تھا جہاں تم قسمت کا حال بتانے کے بہانے لوگوں کی جیبیں کاٹ رہی تھیں اور پھر اس رات تم نے دو افراد کے بونے ایک کی گھڑی ایک طلائی سگریٹ کیس اور پانچ سوڈا لراڑا لیے تھے۔“

”تم؟ تم پولیس میں ہو۔“ اس بار اجنبی کے لہجے میں خوف نہیں بلکہ غصہ تھا۔

”نہیں بلکہ میں تمہارا چاہنے والا ہوں تم جہاں بھی گئی ہو میں تمہارا سایہ بنا رہا ہوں۔ میں نے تمہیں واشنگٹن میں بھی دیکھا تھا چرچ کے باہر صحنہ سویرے تمہارے ساتھ ایک مرد بھی تھا جو تم سے محبت کرتا تھا تم نے اسے مجبور کیا کہ وہ چرچ میں جا کر طلائی ظروف چرائے اگلے روز تم نے وہ ظروف ایک یہودی کے ہاتھوں فروخت کر دیے مگر تمہارا عاشق جیل چلا گیا۔“

”مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔“ اجنبی نے دانت پیس کر کہا۔

”وہ بھی جارج اور اس کی ٹولی میں شامل لوگوں کی طرح درندہ تھا اور میں نے اس سے انتقام لیا تھا۔“

اجنبی کے ہاتھ حد الاؤ سے کچھ دور تھے۔ اچانک ہی سمٹ گئے وہ کچھ دیر ساکت رہا جیسے کچھ کہنے سے پہلے لفظوں کو تولنا چاہتا ہو۔ لیکن چند لمحوں کے بعد اس کی سپاٹ آواز غار میں پھر گونجنے لگی۔

”بخار سمٹ میں کیا ہوا تھا تم نے اس نو جوان بحری افسر کو کیوں چھوڑ دیا جو تمہاری رفاقت میں دیوانہ ہو رہا تھا؟“

میں نے اس کے گھر سے تمام قیمتی سامان چرا لیا کیونکہ اس پر میرا حق تھا۔ وہ میرا معاوضہ تھا۔ اسے مجھ سے محبت تھی لیکن میں اس سے محبت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بھی جارج کی طرح ایک مرد ہی تو تھا۔ قابل نفرت اور درندہ صفت۔“

”کیا تمہیں جارج سے نفرت ہے؟“ اجنبی نے ایک لمحے توقف کے بعد پوچھا۔ ”میں جانتا ہوں کہ اس نے تم سے بڑی زیادتی کی تھی۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ اجنبی نے تیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے سب کچھ معلوم ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اپنے خاندان بدوش شوہر سے بھی نفرت کرتی تھیں۔“

”وہ مر چکا ہے اور اس کے ساتھ میری نفرت بھی مر چکی ہے۔ اس نے میری مظلومیت سے فائدہ اٹھا کر شادی کر لی تھی۔ جبکہ میں قبیلے کے دباؤ کی وجہ سے احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھی۔“

”تمہارے شوہر کو تو پھانسی ہوئی تھی اور اس نے جس شخص کو قتل کیا تھا وہ.....!“

”وہ جارج کا ساتھی تھا جس کو میں نے دام الفت میں پھانس لیا تھا اور پھر جب اس نے مجھے بھگالے جانے کا ارادہ کیا تو میں نے سب کچھ اپنے شوہر کو بتا دیا۔ پھر ایک شب وہ آیا تو میرا شوہر خیمے کے باہر اس کا منتظر تھا اور تب وہی کچھ ہوا جس کی مجھے تمنا تھی۔“

”اور پھر تم چار پانچ مہینوں تک جنگل میں چھپی رہیں حتیٰ کہ تم نے اپنے شوہر کے بچے کو جنم دیا۔“

”وہ میرے مارٹن کا بچہ نہیں تھا۔“ اجنبی کے ہاتھ ایک لمحے کانپ اٹھے اور آواز بھر گئی۔

”میں سب کچھ جانتا ہوں تم نے اس بچے کو ایک کالج کے باہر رکھ دیا تھا اب وہ پردریش پا رہا ہے۔“

”کہاں ہے وہ؟“ اجنبی کی سانس یکا یک بھاری ہونے لگی۔

”بریل ہائی وے پر مسٹر ایڈمنڈ کے گھر میں۔“

اجنبی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”کیا تم اسے واپس لینا چاہتی ہو۔“

”نہیں۔“ اجنبی نے کھوکھلے لہجے میں جواب دیا۔

”میں اب کہیں نہیں جا سکتا۔“ وہ اس کے قریب کھسک آیا۔ ”تمہیں ایک عرصہ بعد تنہا پایا ہے تم نے کبھی میری بات نہیں سنی خوش قسمتی سے میں تمہاری تلاش میں بھٹکتا ہوا ادھر نکل آیا۔“

اجنبی جو پہلے بھی ایسے کئی نازک لمحوں کا شکار ہو چکی تھی پرسکون رہی۔ وہ اس وقت ایک ایسے شخص کے ساتھ تھی جو اس کے کردار ماضی اور حال سے خوب اچھی طرح واقف تھا۔ اسے آہستہ آہستہ یقین ہوتا گیا کہ یہ شخص اس سے نفرت کرتا ہے اور اسے پامال کر کے بالآخر اس کو قتل کر دینا چاہتا ہے۔

اسے یقین تھا کہ اس شخص کو اس سے محبت نہیں ہو سکتی کیونکہ قسمت میں حکم کا بادشاہ نکلا تھا پان کا بادشاہ نہیں۔ حکم کے بادشاہ کا مطلب موت تھی اور پان کے بادشاہ کا مطلب محبت۔ اس نے سگریٹ پھینک دی۔ ”تم کون ہو۔“ وہ زخمی ناگن کی طرح بل کھا کر بولی۔

”کیا تم اندازہ نہیں لگا سکیں کہ میں کون ہو سکتا ہوں۔“

”نہیں اور اب شرافت سے اپنا تعارف کرا دو

دیا۔“ مگر تم کون ہو؟“

”بتا دوں گا بچے کو جنم دینے کے بعد تم نرس بن گئیں اور پھر تم نے ایک شخص پیچھے کو دام میں پھنسا دیا جس نے تمہیں اپنی بیوی کے تمام زیور دے دیے۔ لیکن تم عین اس وقت پکڑی گئیں جب پیچھے کے ساتھ اس کے کمرے میں تھیں۔ تمہیں جیل بھیج دیا گیا۔ یہ بھی نیو جرمنی ہی کا واقعہ ہے نا۔“

”جلے جاؤ۔“ اجنبی نے سرسراتے ہوئے خوفناک لہجے میں کہا۔

”میں نے کوئی جرم نہیں کیا میں بے قصور ہوں مظلوم ہوں۔“

”میں اب کہیں نہیں جا سکتا۔“ وہ اس کے قریب کھسک آیا۔ ”تمہیں ایک عرصہ بعد تنہا پایا ہے تم نے کبھی میری بات نہیں سنی خوش قسمتی سے میں تمہاری تلاش میں بھٹکتا ہوا ادھر نکل آیا۔“

”میں اب کہیں نہیں جا سکتا۔“ وہ اس کے قریب کھسک آیا۔ ”تمہیں ایک عرصہ بعد تنہا پایا ہے تم نے کبھی میری بات نہیں سنی خوش قسمتی سے میں تمہاری تلاش میں بھٹکتا ہوا ادھر نکل آیا۔“

اجنبی جو پہلے بھی ایسے کئی نازک لمحوں کا شکار ہو چکی تھی پرسکون رہی۔ وہ اس وقت ایک ایسے شخص کے ساتھ تھی جو اس کے کردار ماضی اور حال سے خوب اچھی طرح واقف تھا۔ اسے آہستہ آہستہ یقین ہوتا گیا کہ یہ شخص اس سے نفرت کرتا ہے اور اسے پامال کر کے بالآخر اس کو قتل کر دینا چاہتا ہے۔

اسے یقین تھا کہ اس شخص کو اس سے محبت نہیں ہو سکتی کیونکہ قسمت میں حکم کا بادشاہ نکلا تھا پان کا بادشاہ نہیں۔ حکم کے بادشاہ کا مطلب موت تھی اور پان کے بادشاہ کا مطلب محبت۔ اس نے سگریٹ پھینک دی۔ ”تم کون ہو۔“ وہ زخمی ناگن کی طرح بل کھا کر بولی۔

”کیا تم اندازہ نہیں لگا سکیں کہ میں کون ہو سکتا ہوں۔“

”نہیں اور اب شرافت سے اپنا تعارف کرا دو

دیا۔“ مگر تم کون ہو؟“

”بتا دوں گا بچے کو جنم دینے کے بعد تم نرس بن گئیں اور پھر تم نے ایک شخص پیچھے کو دام میں پھنسا دیا جس نے تمہیں اپنی بیوی کے تمام زیور دے دیے۔ لیکن تم عین اس وقت پکڑی گئیں جب پیچھے کے ساتھ اس کے کمرے میں تھیں۔ تمہیں جیل بھیج دیا گیا۔ یہ بھی نیو جرمنی ہی کا واقعہ ہے نا۔“

”جلے جاؤ۔“ اجنبی نے سرسراتے ہوئے خوفناک لہجے میں کہا۔

”میں نے کوئی جرم نہیں کیا میں بے قصور ہوں مظلوم ہوں۔“

”میں اب کہیں نہیں جا سکتا۔“ وہ اس کے قریب کھسک آیا۔ ”تمہیں ایک عرصہ بعد تنہا پایا ہے تم نے کبھی میری بات نہیں سنی خوش قسمتی سے میں تمہاری تلاش میں بھٹکتا ہوا ادھر نکل آیا۔“

اجنبی جو پہلے بھی ایسے کئی نازک لمحوں کا شکار ہو چکی تھی پرسکون رہی۔ وہ اس وقت ایک ایسے شخص کے ساتھ تھی جو اس کے کردار ماضی اور حال سے خوب اچھی طرح واقف تھا۔ اسے آہستہ آہستہ یقین ہوتا گیا کہ یہ شخص اس سے نفرت کرتا ہے اور اسے پامال کر کے بالآخر اس کو قتل کر دینا چاہتا ہے۔

اسے یقین تھا کہ اس شخص کو اس سے محبت نہیں ہو سکتی کیونکہ قسمت میں حکم کا بادشاہ نکلا تھا پان کا بادشاہ نہیں۔ حکم کے بادشاہ کا مطلب موت تھی اور پان کے بادشاہ کا مطلب محبت۔ اس نے سگریٹ پھینک دی۔ ”تم کون ہو۔“ وہ زخمی ناگن کی طرح بل کھا کر بولی۔

”کیا تم اندازہ نہیں لگا سکیں کہ میں کون ہو سکتا ہوں۔“

”نہیں اور اب شرافت سے اپنا تعارف کرا دو

دیا۔“ مگر تم کون ہو؟“

ورنہ.....“

”میں شیطان ہوں۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

”کیا واقعی؟“ وہ طنز آلودی لیکن اس کا دل شدت سے دھڑک اٹھا تھا کیونکہ اس نے ایک قدیم کہانی میں سن رکھا تھا کہ شیطان ہر سال اپنے لیے ایک بیوی کی تلاش میں نکلتا ہے۔ ”مگر تمہارے سینک نہیں ہیں۔“

”فرشتوں کے سینک نہیں ہوتے اور میں دھتکارا ہوا فرشتہ ہوں۔“

”مجھ سے کیا چاہتے ہو۔“

”یہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں میں ایک عرصہ سے تمہارا تمنائی ہوں اور اب صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم میری بن جاؤ۔ صرف تمہاری وجہ سے دنیا میری دشمن ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگ۔

”آہستہ آہستہ سب سمجھ جاؤ گی میں آج رات تم سے شادی کروں گا اور پھر تم..... جہنم پر حکمرانی کرو گی۔“

”کیا تم مجھے بہت پہلے سے جانتے ہو؟“

”ہاں اور میں قائل ہو گیا ہوں کہ صرف تم ہی جہنم کی ملکہ بننے کی اہل ہو۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اس کی چوڑیوں کی کھک دور تک گونجتی چلی گئی اور پھر وہ ایک طرف دیکھنے لگی۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“

”سواکیہ کی بوتل اپنے بارے میں اتنے انکشافات سننے کے بعد مجھے پیاس محسوس ہونے لگی ہے۔“ پھر وہ بوتل اور دو گلاس لے آئی۔

”میں نہیں پی سکتا۔“ سواکیہ کی بوتل دیکھتے ہی

اجنبی نے کہا۔

”کیا تم اپنی ملکہ کی فرمائش پوری نہیں کرو گے؟“

”وہ فرمائش کیا ہے؟“

”میں ملکہ بن کر جہنم پر راج کرنے پر آمادہ ہوں۔ بشرطیکہ تم اپنی شکل دکھاؤ۔“

”فی الحال یہ ممکن نہیں میری بن جاؤ تو یہ فرمائش بھی پوری کر دوں گا۔“

”تب پھر یہ لو۔“ اپنی نے بڑی چاہت سے گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم نے سواکیہ نہ پی تو تمہاری ہونے والی ملکہ کا دل ٹوٹ جائے گا اور میں تمہاری بننے میں خوش محسوس نہیں کر سکوں گی۔ میری فرمائش مت نالو۔ اپنی ہونے والی دلہن کا دل نہ توڑو۔“ اس نے یہ سب کچھ اتنی لگاؤ سے کہا کہ وہ شخص محصور ہو گیا اور دیر تک غور کرتا رہا۔ پھر اس نے گلاس لے کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں سواکیہ پی لی اور دیکھتے ہی دیکھتے سینہ میلنے لگا۔ اپنی بڑی والہانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”اف اتنی جلد میری آنتیں کٹ رہی ہیں۔“

”نہیں میرے مالک یہ تو محبت کی چھن ہے یہ لو چند گھنٹوں اور پیو پھر ہم ہوں گے اور یہ محبت بھری رات ہو گی۔“

وہ مزید سواکیہ نہیں پینا چاہتا تھا لیکن پہلے گلاس کا نشہ کسی تندہوارے کی طرح اسے مفلوج کر چکا تھا۔ پھر اپنی کی محبت بھری ادائیں اسے پاگل کیے دے رہی تھیں۔

اس نے دوسرا گلاس بھی پی لیا۔

”ڈارلنگ میرے عزیز شوہر۔“ اپنی نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ کر کہا۔ ”آؤ“

میں ملن کی خوشی میں تمہیں ایک گیت سناتی ہوں۔“ اس نے گٹار اٹھا لیا اور پھر ایک مدھر دھن غار میں گونجنے لگی۔

اس شخص نے تیسرا گلاس بھی پی لیا تھا مگر اب اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ اس کی سانس ناہموار تھی سینہ زور زور سے پھول کر پچک رہا تھا۔ وہ بمشکل اٹھا کر اس کی طرف بڑھا مگر اس سے قبل کہ وہ اسے اپنی گرفت میں لیتا اپنی مچھلی کی طرح پھسل کر اس کے عقب میں گئی اور ایک زوردار لات مار کر شیطان کو منہ کے بل گرا دیا۔

”تم میرے شوہر ہو، تم جہنم کے مالک ہونا اتنی سی سواکیہ پی کر بہک گئے۔“

”میں.....!“ شیطان کچھ اور نہ کہہ سکا کیونکہ اپنی کی ٹھوکر اس کے پیٹ پر پڑی تھی اور وہ اونڈھا ہو گیا۔ اپنی پھر گانے لگی۔

وہ گاتی رہی اور شیطان سینہ پیٹ کر ترپتا رہا۔ وہ شدید کرب میں مبتلا تھا پہلی بار گرنے کی وجہ سے اس کا سر پتھر سے ٹکرایا تھا اور خون کی بوندیں بہہ نکلی تھیں۔ دوسری ٹھوکر کے باعث نہیں بلکہ شراب کی وجہ سے اس کے پیٹ میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ ایسا لگا رہا تھا جیسے دل اور آنتیں کٹ کر منہ کے راستے نکل رہی ہوں۔ پھر وہ ساکت ہو گیا اور اس کی ناک سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے۔

اپنی نے گٹار ایک طرف رکھ دیا باہر جھانک کر دیکھا تو صبح ہونے والی تھی۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور غار کے دہانے کی طرف بڑھ گئی۔

ایک ایک چونک کر پلٹی۔ اب اس کی نظریں اس شخص پر جمی ہوئی تھی جس نے اپنے چہرے پر ایک جھلی دار چہرہ چڑھا رکھا تھا۔

وہ بیک رکھ کر اس پر جھک گئی۔

شیطان کی سانس ٹوٹ چکی تھی اور جسم سرد ہونے لگا تھا۔

اپنی نے اپنے نوکیلے ناخنوں سے نقاب نوچ کر پھینک دیا اور پھر اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ایک ہی ساعت اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔

لیکن پھر آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس کے ہونٹ ہلنے لگے۔ ”مارٹن! مجرموں کا سرغنہ مارا گیا۔“ اس کی بھرائی ہوئی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔ ”آج میرے انتقام کا بڑا حصہ پورا ہو گیا آج میں بے حد خوش ہوں۔“

اس نے جارج کی لاش پر تھوکا اور غار سے باہر آ گئی۔ اسے شکا گو پہنچنے کی جلدی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ باقی تین مجرم وہیں موجود ہیں۔

”شاید اگلے کرسٹس تک میں ان سے بھی بدلہ لے سکوں۔“ اس نے خود کلامی کی اور اس کی رفتار تیز تر ہوتی چلی گئی۔

اب وہ اس بچے کے بارے میں سوچ رہی تھی جس کا حوالہ جارج نے مرنے سے قبل دیا تھا۔ اس بچے کا خیال آتے ہی اپنی کو اپنا دل اور دماغ سلگتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مامتا کا وہ جذبہ جس کے بغیر عورت کی تکمیل نہیں ہوتی نہ جانے کہاں جا سویا تھا اور اس کی وجہ شاید یہ بھی کہ وہ بچہ اس کے محبوب مارٹن کی محبت کی نشانی نہیں تھا بلکہ ان عذابناک لمحوں کا کڑوا پھل تھا جو جارج اور اس کے درندہ صفت ساتھیوں نے اس کی ہستی پر مسلط کر دیے تھے۔

38



اسرار احمد

بعض اوقات حالات انسان کو ایسے حالات سے دوچار کر دیتے ہیں جہاں وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو کر اپنے ہر فعل کی ضرورت اور درست گردانتا ہے۔

ایک سیاح کو پیش آنے والے ایک حادثہ کی روداد وہ اچانک نکل کے کس میں پھنس گیا تھا

فرانس کے جنوبی حصے میں واقع ایک پہاڑی سلسلہ ہے جو ناٹوان کہلاتا ہے۔ ناٹوان کی پہاڑیاں سیاحوں میں اس اعتبار سے بہت مشہور ہیں کہ وہاں بڑے بڑے پتھر تلے اوپر جمع ہو کر عجیب و غریب شکلیں اختیار کر لیتے ہیں اور آدمی ان کے درمیان کھڑا ہو کر یوں محسوس کرتا ہے جیسے ان گنت خوف ناک اور مہیب جانوروں کے غول میں گھر گیا ہو اور وہ خوف ناک جانور بتدریج اس کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہے ہوں۔

ان پہاڑیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی بوڑھی عورت چھتری سمیت ان پر چڑھ جائے تو وہ ان بھاری چٹانوں کو چھتری سے بآسانی لڑھکا سکتی ہے یوں جیسے بچے بلے سے گیند لڑھکا دیں۔ ان پہاڑیوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں لاتعداد غار اور بے حساب کھائیاں ہیں۔ فرانس جانے والا کوئی بھی سیاح ان پہاڑیوں کو دیکھے بغیر واپس نہیں لوٹا۔ سیاحوں میں یہ بات مشہور ہے کہ جس نے ناٹوان کی پہاڑیوں کو نہیں دیکھا اس نے دراصل فرانس ہی نہیں دیکھا۔

مجھے بھی سیاحوں میں پھیلا یہ مقولہ ناٹوان کی پہاڑیوں کی طرف متوجہ لایا تھا۔ اس روز وہاں چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ چمیلی، جگمگاتی دھوپ اور خود درجہ جھاڑیوں میں نکلنے والے پھولوں

میرے جسم پر پتھروں کی رگڑ سے بڑ جانے والی خراشیں تھیں اور اس اچانک حادثے پر میرا پورا جسم لرز رہا تھا۔

میری کار وہاں سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ میں جیسے تیسے کر کے وہاں پہنچ سکتا تھا بشرط یہ کہ پہلے اس گڑھے سے نکل جاتا۔ گڑھا نیچے سے چوڑا مڑاؤ پر سے تنگ تھا اور اس میں سے نکلنا آسان نہیں تھا۔

میں نے ایک ہلکی سی کراہ بھری اور اپنے دائیں پاؤں کی دونوں ہاتھوں سے خوب اچھی طرح مالش کر ڈالی۔ مالش سے خاصا افاتہ محسوس ہوا اب میں اپنا پاؤں زمین پر ٹیک سکتا تھا اور اس پر اپنے جسم کا وزن بھی ڈال سکتا تھا۔ میں نے اس گڑھے سے نکلنے کا ہر صورت میں تہیہ کر لیا۔ میں باہر نکلنے کی کوئی تدبیر سوچ ہی رہا تھا کہ میری نظر غار میں ابھرے ہوئے ایک بڑے پتھر پر جم گئی جو غار کی دیوار میں خاصا آگے کی جانب نکلا ہوا تھا۔

میں نے چھلانگ لگا کر اس بڑے پتھر کو پکڑا اور اس پر پاؤں جما کے اس پتھر کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا جو میرے ہاتھوں کی پہنچ سے صرف چند انچ دور تھا۔ میں نے وہ پتھر پکڑنے کے لیے اپنی جگہ کھڑے کھڑے اوپر کی جانب چھلانگ لگائی تھی تھی کہ وہ پتھر اپنی جگہ سے کھسک گیا جس پر میں کھڑا ہوا تھا اور تیزی سے نیچے گرتے ہوئے گڑھے کے فرش پر جا کر ٹک گیا۔

بروقت دوسری جانب چھلانگ لگا کر میں نے خود کو اس پتھر تلے آنے سے بچایا، بڑے پتھر کے نیچے ہی دوسرے چھوٹے چھوٹے پتھر، کنکریاں اور بہت سی مٹی بھی نیچے آ گری جس سے میں کسی طور نہ بچ پایا جب طبعی بارش بھی تو میں نے سر

اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا، اب پتھروں کا سہارا لے کر اوپر چڑھنا خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنے کے مترادف تھا۔

میں دیوانہ وار گڑھے میں چکر لگانے لگا اچانک ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی میرے جسم کے رونکنے کھڑے ہو گئے۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں باہر گھوم رہا تھا تو مجھے دور دور تک اس علاقے میں کوئی دوسرا شخص دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر میں جیج پکار چاتا تب بھی بیرونی امداد ملنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔

میری چشم تصور میں اخبارات میں چھپنے والی خبروں کی سرخیاں ابھرائیں۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک انگریز انجینئر جو گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے فرانس آیا تھا اچانک ہی لاپتا ہو گیا۔ تلاش بسیار کے باوجود اس کا کوئی پتا نہ چل سکا۔

اس دہشت انگیز خیال نے مجھے اور پریشان کر دیا۔ میرے حواس دھیرے دھیرے میرا ساتھ چھوڑنے لگے میں حیران پریشان اور کم صم اپنی جگہ کھڑا تھا کہ میری سماعت سے مکھیوں کی بھنبھناہٹ ٹکرائی، میں چونکا ہوا گیا میں نے سر اٹھایا تو دو مکھیاں خلا سے نیچے آ کر بائیں جانب چلی گئیں۔ ان مکھیوں کے پیچھے ایک غول کی صورت میں لاتعداد مکھیاں تھیں، پہلی دو شاید ان کی رہنمائی کر رہی تھیں۔

میں نے اس جانب قدم بڑھائے، جدھر مکھیاں جاری تھیں میں چند ہی قدم چلا تھا کہ ٹھٹھک گیا۔ مجھے ہلکی روشنی میں ایک انسانی لاش دکھائی دی میں سر تاپا کانپ اٹھا۔ پتا نہیں وہ کون بد نصیب تھا جو اس طرح دیارِ غیر میں مارا گیا تھا۔ پھر مجھے اپنا

ہدایت اور اصلاح کا روشن چراغ

ملک منفرد دینی و اصلاحی رسالہ

الاسلام

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

ممتاز مفکر و دانشور مشتاق احمد قریشی کی زیارت

قیمت: 20 روپے

دینی مسائل کا حل: مولانا سعید احمد جلال پوری

روحانی مسائل: حافظ شبیر احمد

اسلام اخوت بھائی چارے اور تہذیب شناسی کا مذہب ہے۔

اپنے دین کو جاننا اور سمجھنا ہر مسلمان پر فرض نہیں ہے۔

اسلام ایک مکمل شاخہ حیات ہے ہمیں اسے صحیح سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اس پر عمل کر کے ہی ہم آخرت میں فردی حاصل کر سکتے ہیں۔

قارئین کی مشکلات کو مد نظر رکھتے ہوئے الاسلام میں کچھ ایسے سلسلے شروع کیے

ہیں جن سے عام لوگوں کو دینی مسائل سمجھنے میں آسانی ہو سکے گی۔

دنیا کے اسلام کے تمام مسالک متعلق

علماء کرام کی نگارشات اور آراء پر مشتمل

اسلامک کھیپ چھاپنا اور پھیلنا چاہتے ہیں

پتا: کمرہ نمبر 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

فون: 35260771/2 فیکس: 35260773

alislamkhi@gmail.com

مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہ آئی کہ ڈی میگارڈو تنظیم کے ہر کاروں کے خوف سے فرانس بھاگ آیا مگر اسے یہاں بھی پناہ نہیں ملی۔ موت اس کا مقصود بن گئی تھی۔ تنظیم کے ارکان نے اسے ڈھونڈ نکالا اور بالآخر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

میں لاش کے قریب سے ہٹ گیا اور گرڑھے کی ایک دیوار کے سہارے پشت ٹیک کر بیٹھ گیا، میں موت کا انتظار کرنے لگا۔ جو بتدریج میری جانب بڑھ رہی تھی اور جس سے فرار ممکن نہیں رہا تھا۔ رفتہ رفتہ غار میں ٹھن بڑھنے لگی اور لاش سے تعفن اٹھنے لگا۔ کھکیوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ہی میری وحشت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں پھر لاش کے قریب گیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ تنظیم کے افراد نے اس کی زبان کاٹی تھی یا نہیں؟ ایک دندان سازی حیثیت سے میں ان گنت افراد کے جڑے اور منہ ان کی مرضی کے خلاف کھلوا چکا تھا مگر وہ ایک لاش تھی۔ اس کا جڑ اکھولنے میں مجھے پسینہ آ گیا۔ بالآخر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو ہی گیا۔ منہ کھلنے پر میں حیران رہ گیا، مجھے ڈی میگارڈو کے حلق میں موجود اس کی زبان صاف دکھائی دے رہی تھی جو اپنی جگہ موجود تھی۔

میں ابھن اور حیرت کا شکار ہو گیا، میں سوچ رہا تھا کہ آخر تنظیم کے لوگوں نے اپنا عمل پورا کیوں نہیں کیا۔ انہیں یقیناً اپنے سربراہ اعلیٰ کا حکم پورا کرنا چاہیے تھے ورنہ خود ان کی خیر نہ ہوتی۔ وہ بھی کسی نادیہ عذاب کا شکار ہو سکتے تھے۔ اسی لمحے ایک اور خیال میرے ذہن میں درآ یا یہ عین ممکن تھا

چند ٹریڈرز چیک اور کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرچہ ملا جس پر ٹائپ میں چند سطر عمارت درج تھی اب سورج ڈھل رہا تھا اس لیے گرڑھے میں روشنی برائے نام ہی رہ گئی تھی۔ میں یہ مشکل اس خرب کو پڑھنے میں کامیاب ہو سکا، پرچے پر لکھا تھا۔

”ڈی میگارڈو! تم نے ہماری تنظیم سے غداری کی ہے لہذا تمہارے لیے موت کی سزا تجویز کر دی گئی ہے تم چاہے دنیا کے کسی بھی گوشے میں پہنچ جاؤ میرے آدمی تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے اور تمہیں مجوزہ سزا دیں گے پھر تمہاری زبان کاٹ کر کالی دیوی کے حضور پیش کر دی جائے گی۔“

پرچے کے اختتام پر نام کی جگہ بین الاقوامی تنظیم ”ساحران“ کے سربراہ اعلیٰ کے دستخط تھے جو کسی انسانی کھوپڑی سے مشابہہ تھے۔ اس پرچے کو پڑھ کر میرے جسم پر ایک بار پھر لرزہ طاری ہو گیا جو لوگ اس تنظیم کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ان کے لیے یہ پرچہ بے معنی اور فطی غیر اہم تھا مگر میں جانتا تھا کہ بین الاقوامی تنظیم ”ساحران“ کیا بلا تھی۔ اس تنظیم کا چرچا برطانوی اخبارات میں بہت عرصے سے ہو رہا تھا۔

یہ ایسے افراد کا ٹولہ تھا جو کالے علم پر دسترس رکھتے تھے۔ ان کی سرگرمیاں غیر قانونی اور زیر زمین تھیں۔ اس لیے پولیس کو ہمیشہ ان کی تلاش رہتی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ ڈی میگارڈو یقیناً پولیس کا خبر ہوگا اور اس نے تنظیم کے بارے میں کوئی خفیہ بات پولیس کو بتادی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ کچھ ماہ پہلے برطانیہ میں اس تنظیم کے بیش تر افراد کی گرفتاری کی خبریں بھی اخبارات میں شائع ہوئی تھیں جو یقیناً ڈی میگارڈو کی جانب سے ملنے والی اطلاعات ہی کی مرہون منت تھیں۔

خیال آ گیا، کیا میرا بھی یہی حشر ہوگا؟ اس خیال کے ساتھ ہی میرے جسم میں تھر تھری چھوٹ گئی اور پسینہ بدن کے مساموں سے پھوٹ نکلا۔ شاید میں بھی کسی ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہونے والا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اپنا دل مضبوط کیا اور لاش کے قریب چلا گیا۔ یہ خیال میرے لیے تقویٰ کا باعث تھا کہ جب مرنا ہی ٹھہرا تو اس سے ڈرنا کیا۔ لاش کے جسم پر براؤن پتلون اور سیاہ چمڑے کی جیکٹ تھی۔ سر پر ایک گہرا زخم تھا جس میں سے خاصی مقدار میں خون نکل کر اس کے چہرے پر جم گیا تھا اس طرح کہ اس کی صورت پہچانی نہ جاتی تھی۔

میں نے بغور زخم کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ اس کے سر پر کسی نوکدار وزنی چیز سے وار کیا گیا تھا۔ لاش کے معانے کے دوران میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ لاش سے بدبو نہیں اٹھ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے میرے گرڑھے میں گرنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی وہاں لاکر پھینکا گیا تھا۔

آہستہ آہستہ کھکیوں کی تعداد اور ان کی بھینھناٹ میں اضافہ ہونے لگا مجھ پر ابھن سوار ہو گئی۔ موت کا خوف اب میرے اعصاب پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ میں نے گھٹنوں کے بل جھک کر لاش کی جببوں کی تلاشی لی تو ایک چرمی بٹا اور شناختی کارڈ ملا۔ شناختی کارڈ کے مندرجات کے مطابق وہ ڈی میگارڈو تھا۔ میری ہی طرح ایک انگریز جو ایک بینک آفیسر تھا جب کہ میں ایک دندان ساز تھا۔ میں نے بٹے کو مزید الٹ پلٹ کر دیکھا تو تھوڑی سی فرانسیسی کرسی

میں سوچتا ہوں کہ میں نے دندان سازی کا پیشہ اختیار کر کے غلطی کی، مجھے پولیس کے محکمے میں ہونا چاہیے تھا۔“

”ضرور!“ اس نے سرد مہری سے کہا۔ اس کا لہجہ کچھ اس انداز کا تھا کہ میں چونک کر اس کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا شاید کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔

”تمہیں یہ جان کر دکھ ہوگا کہ موسیو میگاردو کا قاتل پہلے ہی گرفتار ہو چکا ہے۔“ اس نے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔ ”میں نے لاش حاصل کرنے کے لیے دو آدمی روانہ کیے تھے وہی دونوں جنہیں تم نے پتھر مار کر شدید زخمی کر دیا۔ ان دونوں کا شمار فرانس کی پولیس کے بہترین آدمیوں میں ہوتا ہے لیکن اب وہ اسپتال میں پڑے ہیں۔“

”مگر..... مگر..... وہ تو.....!“ میں ہکلا کے رہ گیا اور اس سے آگے کچھ نہ کہہ پایا۔ ساری بات غلطی کی تھی، مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ پولیس والے ہیں۔ میں تو انہیں بین الاقوامی تنظیم ساحران کے ایجنٹ سمجھا تھا جو اپنے پاس کے حکم کے مطابق ڈی میگاردو کی زبان کاٹنے کے لیے گڑھے میں اترے تھے۔

پولیس چیف نے مجھے درشتی سے گھورا اور پھر چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں دل ہی دل میں ان دونوں کی جلد صحت یابی کی دعا کرنے لگا اگر وہ مر جاتے تو مجھ پر فرانس کی پولیس کے دو بہترین آدمیوں کو قتل کر دینے کے الزام میں مقدمہ بھی چل سکتا تھا، پہلے میں جیل جاتا پھر سونے دار۔

کر دیا تھا اور معاشرے کے دو ناسوروں کو کاٹ چھینکا تھا۔

غار سے باہر آنے کے بعد میں نے اس سمت چلنا شروع کر دیا جہاں میری کار کھڑی تھی لیکن میں بہ مشکل چند ہی قدم طے کر پایا تھا کہ مجھے جکڑ آ گیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ بے ہوشی سے قبل مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں پتھروں پر گر پڑا تھا، اس کے بعد مجھے گرد پیش کا ہوش نہیں رہا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک اسپتال کے بستر پر پایا۔ میری تیمارداری پر متعین نرس نے مجھے بتایا کہ چند سیاح اتفاق سے اس پہاڑی سلسلے پر جا نکلے تھے انہوں نے مجھے بے ہوش پڑے پایا تو اٹھا کر شہر لے آئے۔ میری کار ان لوگوں کو ہمیں نظر نہ آئی تھی میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ کار کے بارے میں مجھے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بعد میں بھی آ سکتی تھی اسی دن مجھے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ میں پورے دو دن بے ہوش رہا تھا۔

دوسرے روز جب کہ میں اپنے ہوٹل کے بستر پر بیٹھا سوپ پی رہا تھا اور اپنے اس پیرو کو دیکھ رہا تھا۔ جس پر پلستر چڑھا دیا گیا تھا۔ فرانس کی پولیس کا چیف مجھ سے ملاقات کرنے آیا، اس کا چہرہ گھوڑے کی طرح سخت اور آنکھیں سانپ جیسی چمکیلی تھیں۔ اس نے مجھ سے استفسار کیا کہ مجھے کیا واقعہ پیش آیا تو میں نے جواب میں اسے پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا، میں خاموش ہوا تو اس نے چہتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میرا خیال ہے موسیو! اپنے اس کارنامے پر تم خود کو ہیرو سمجھ رہے ہو گے۔“

”ہاں!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اب

پاؤں زمین سے لکرائے وہ گہرے سانس لیتا ہوا لاش کی طرف بڑھا اور جھک کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اسی اثنا میں دوسرا آدمی بھی نیچے اتر آیا میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی تھی ورنہ وہ ڈی میگاردو کی زبان بعد میں کاٹنے پہلے میری خبر لیتے اور مجھے بھی ڈی میگاردو کے پیچھے ایک لمبے سفر پر روانہ کر دیتے۔

وہ دونوں لاش پر جھکے بغور اس کا جائزہ لے رہے تھے ان کی پشت میری جانب تھی میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے قریب پڑا ایک وزنی پتھر اٹھا کر اس شخص کی کھوپڑی پر دے مارا جو مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا، پتھر لگتے ہی اس کے حلق سے ایک کریہہ چیخ نکلی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا، دوسرے آدمی نے پلٹ کر میری طرف دیکھا مگر اس سے پہلے کہ وہ سمجھتا میں نے ایک اور وزنی پتھر اس کی کھوپڑی کی طرف اچھال دیا۔ اس بار بھی میرا نشانہ خطا نہیں گیا، اس آدمی کی بھی کھوپڑی کھل گئی اور وہ بھی اپنے ساتھی کی طرح فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔

میرے لبوں سے بے ساختہ ایک طمانیت بھری سانس نکل گئی اب میں آزاد تھا اور آسانی سے اوپر جاسکتا تھا۔ اوپر پہنچتے ہی مجھے مقامی پولیس کو اس واقعے کی تفصیلی رپورٹ دینی تھی، لیکن غار سے نکلنے کا عمل اتنا آسان ثابت نہیں ہوا جتنا کہ میں نے سمجھ لیا تھا کیونکہ میری ٹانگ کی تکلیف دوبارہ شروع ہو گئی تھی اور کمزوری کا احساس مجھ پر غالب آ چکا تھا۔ تاہم میں نے ہمت نہ ہاری اور اسی رستی کے سہارے غار سے نکل آیا۔ اس وقت میں خود کو دندان سازی کی بجائے ایک ہیرو تصور کر رہا تھا جس نے ایک غیر قانونی تنظیم کے دو افراد کو جہنم رسید

کہ کسی وجہ سے انہیں ڈی میگاردو کی زبان کاٹ لینے کا وقت ہی نہ ملا ہو۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یقین ہو گیا کہ جلد ہی کوئی نہ کوئی شخص اس گڑھے میں اترے گا اور ڈی میگاردو کی زبان کاٹ کر اپنے پاس کے سامنے لے جا کر پیش کر دے گا تاکہ وہ اسے کالی دیوی کے حضور پیش کر سکے۔

یہ خیال میرے لیے خاصا دہشت ناک اور لرزہ خیز تھا۔ میں نے غار میں چاروں طرف دیکھا، غار کی داہیں جانب ایک بڑا سا پتھر پڑا تھا، میں فوراً ہی اس کے عقب میں چھپ کر بیٹھ گیا تاکہ آنے والے کی نگاہ مجھ پر نہ پڑ سکے۔ مجھے جب تنظیم کے ہر کاروں کا خیال آتا میں کانپ اٹھتا۔ میں نے دل ہی دل میں اس وقت کو کو سا جب میں نے فرانس آنے اور ٹاڈوان کی پہاڑیاں دیکھنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس پر عمل بھی کر رہا تھا۔

مجھے پتھر کے پیچھے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے غار میں جھانک کر دیکھا ہو۔ ہلکی سی آہٹ بھی ہوئی تھی میں آنے والوں کے خوف سے مزید دب گیا، چند ثانیے بعد ہی باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا گویا تنظیم کے ہر کارے ڈی میگاردو کی زبان کاٹنے کے لیے آپہنچے تھے اور اب نیچے اترنے کی تیاری کر رہے تھے۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ سر اٹھا کر غار کا روشن حصہ دیکھتا رہا، ان میں سے ایک نے غار میں رستی لٹکادی جو بل کھائی ہوئی نیچے آ کر غار کے فرش سے ٹک گئی پھر ان میں سے کسی ایک نے رستی کو جھٹک کر اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا اور اس کے سہارے پھسلتا ہوا نیچے اترنے لگا۔

میں نے اپنا سانس روک لیا جونہی اس کے

تلاشِ بیستی

فضیلتِ حسن

ایک مصنف کی روداد اسے ایک کہانی کے پلاٹ کی تلاش تھی اور وہ اس کے لیے سڑکوں پر سرگرداں تھا۔

روشنائی کی جگہ خون سے تحریر کی جانے والی کہانی جو آپ کی پکوں کو نکلین پانی سے بھر دے گی

رات آہستہ آہستہ بھٹکتی جا رہی تھی وہ تینوں کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے کافی کی پیالیوں سے مہکتی ہوئی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ حسب سابق اس بار بھی بل کی ادائیگی رمیش کے ذمے تھی ورنہ مینے کے آخری ہفتے میں ان کا وہاں کیا کام۔ ان میں ایک رمیش ہی ایسا تھا جس کی سدا بہار جیب ہر موسم میں گرم رہتی تھی۔ رمیش نے کافی کا ایک گھونٹ لیا اور سامنے بیٹھے دوستوں کو غور سے دیکھا۔

”یارو کیوں اپنی اپنی ہونے والی خوشدامن کی صاحب زادی کی زندگی برباد کر رہے ہو؟“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے شگفتہ لہجے میں کہا۔ ”بہتر ہوگا کہ تم لوگ کہانیوں اور مصوری کا پیچھا چھوڑ دو اب تو تم سے بھاگتے ان کے پیرشل ہو گئے ہوں گے۔“

”کے کہہ رہے ہو؟“ کرشن نے تیز لہجے میں پوچھا۔ دھرمیندر کی پیشانی پر بھی بل پڑ گئے۔

”وہ تو پہلا مصرعہ تھا دوسرے مصرعے کے دو حصے ہیں۔“ رمیش چکا۔ ”پہلے وضاحت کر دوں کہ پہلے مصرع میں صفت لف و نشر، معکوس الترتیب پائی جاتی ہے لہذا پہلے ہوا کر مصوری..... مصوری کا تعلق بلکہ یوں کہنا چاہیے

کسی ایڈیٹر کو ترس آ جائے تو کہانی چھپ جاتی ہے اور جیب کا پاؤں بھاری ہو جاتا ہے لیکن اسقاط میں بھی دیر نہیں لگتی، پھر.....“ ”رمیش مزید بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔“ کرشن کا چہرہ خفت کے احساس سے سرخ ہو گیا تھا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم فنکار ہو لیکن اس فن سے تمہیں کیا ملتا ہے؟“ ”تم فضول باتیں کیوں شروع کر دیتے ہو؟“ دھرمیندر بھی بھنا گیا۔

”یارو! میں تو تمہارے ہی بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔“ رمیش کا لہجہ مدافعانہ ہو گیا۔ ”ہم لوگ بچپن کے ساتھی ہیں، ایک ساتھ پلے بڑھے۔ میں تو تمہیں صرف یہ یاد دلارہا ہوں کہ ہمارے ماں باپ نے ہمارے لیے بہت ایثار کیا ہے پھر انہوں نے ہم سے امیدیں وابستہ کی ہیں۔ ان کے بھی کچھ خواب ہیں لیکن ہم اپنے خوابوں کی خاطر ان کے خواب کو نظر انداز کر دیں تو ان پر کیا گزرے گی اور یہ تو کھلی ہوئی خود غرضی ہے جب کہ ان کے خوابوں کا تعلق بھی ہم ہی سے ہے۔ وہ بے غرض ہیں، تو کیا ہم ان کے ایثار کے عوض ان کے خوابوں کو تعبیر نہیں دے سکتے، وقتی طور پر اپنے خوابوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے، ذرا غور تو کرو وہ تمہیں تہی دست دیکھ کر کسی قدر اذیت سہتے ہوں گے۔“

”تم نہیں جان سکتے کہ میرا فن مجھے کیا دیتا ہے۔“ کرشن نے طنز کیا۔ ”تم تو زندگی کے صرف ایک ہی رخ سے واقف ہو اور وہ ہے مادی رخ۔“ ”بے شک یہ درست ہے اور میں اس پر

شرمندہ بھی ہوں۔ پیٹ سب سے بڑی حقیقت ہے دوست! اس جہنم کو بھرنے کے لیے مادہ ہی درکار ہوتا ہے، کبھی تم نے کھانے کی جگہ کہانی سے پیٹ بھرا ہے کوئی تصویر لگی ہے؟ بولو! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“ ”تم جانتے ہو کہ میں جاہلانہ گفتگو سے ہمیشہ گریز کرتا ہوں۔ میں تمہیں وہ بات کیسے سمجھا سکتا ہوں جو تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے۔ تم آتما کی حقیقت اور اس کی اہمیت کو کیا سمجھو گے۔“ کرشن نے زہریلے لہجے میں کہا اور بغیر کچھ کہے کیبن سے باہر نکل گیا۔

رمیش اور دھرمیندر دیکھتے ہی رہ گئے۔ ان کے درمیان بہت زیادہ بے تکلفی تھی، پہلے کبھی اس طرح کی رنجش نہیں ہوئی تھی۔ ”یارو! یہ کیا ہو گیا۔“ رمیش نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”بس! الجھا ہوا ہے کسی رسالے کے ایڈیٹر سے کہانی کا وعدہ کیا تھا اور کہانی کا موڈ نہیں بن رہا ہے۔ اسی لیے چڑا ہورہا تھا۔ اس پر تم نے چیخو دیا بلا وجہ کھنچائی کر دی اس کی حالاں کہ وہ تم سے زیادہ ہی کماتا ہے۔“

”دھرمیندر! میں یہ باتیں تو پہلے بھی کرتا رہا ہوں، تم دونوں ہی ہنس کر ٹال جاتے تھے لیکن آج اس کی برہمی نے صدمہ پہنچایا تو مجھے احساس ہوا کہ میں یہ سب کچھ کیوں کرتا رہا ہوں، جانتے ہو؟“ دھرمیندر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا اور منہ سے کچھ نہ بولا۔

”مجھے موسیقی کا بہت شوق تھا میں کلاسیکی موسیقی سیکھنا چاہتا تھا لیکن باپو اور ماما جی نے ہمیشہ یہی کہا کہ اس میں ”واہ واہ“ کے سوا کچھ

نہیں پہچانتی لیکن دیکھ میں نے تجھے پہچان لیا ہے۔ میرے پاس پہچاننے کے لیے تھا ہی کیا تو اور ذیشان وہ چلا گیا اور تو..... تو مجھے بھول گیا۔“ انا نے اُمّی سانسوں کے درمیان کہا۔ کرشن کو پتا بھی نہ چلا کہ وہ کس طرح رو رہا ہے۔ ”اب..... اب کہیں نہ جانا انا!“ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”پگلے تو نے بہت دیر کر دی“ اب تو میں ذیشان کے پاس جا رہی ہوں۔“ کرشن کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

”انا..... انا..... تم میری ماں ہو۔“

”ہاں وہ تو ہوں لیکن تو نے دیر.....“ اور سانسوں کی ڈوری ٹوٹ گئی۔

اور کرشن وہاں بیٹھا دیر تک سوچتا رہا کہ اب کہانی لکھی جاسکتی ہے۔ یہ کہانی مجھ پر فرض تھی اور قرض ہے۔ انا مجھے کہانی دے گئی ہیں۔ انا مجھے آئینہ دے گئی ہیں، اب میں قارئین کو اپنے خود خال دکھاؤں گا۔ انا کے دیئے ہوئے آئینے میں دیکھ کر اپنے لفظوں کے حوالے سے..... اپنے خود خال، ایک خود غرض اور کم ظرف انسان کے خود خال۔ ایک سچا قلم کار ہونے کی حیثیت سے یہ میرا فرض ہے اور میں اسے پورا کروں گا لیکن جلدی کیا ہے، ابھی تو ایک اور فرض کو پورا کرنا ہے۔ ابھی تو انا کو..... اپنی ماں کو کفن دینا ہے پھر کہانی بھی لکھی جائے گی اور ضرور لکھی جائے گی۔

وہ انا کا سراپے زانو پر رکھے دیر تک بیٹھا رہا، بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ ستارے ڈوب گئے۔

○

ثابت ہوا تھا۔ بجائے دوسروں کے دکھ بانٹ کر اپنے دکھوں کا علاج کرنے کے وہ اپنے دکھ میں ڈوب گیا تھا اور دکھ کا علاج پھر بھی نہ کر سکا تھا اس نے نہیں سوچا تھا کہ مشترک درد رکھنے والوں کی یکجائی درد کا مداوا کر دیتی ہے۔ وہ انا کا بیٹا بھی تو بن سکتا تھا انا نے تو اسے ماں کی طرح چاہا تھا۔ انا اس کا خلا پر کر دیتیں اور وہ انا کی مامتا کی تسکین کا سبب بن جاتا لیکن وہ تو دکھ کا سچا بھی نہیں تھا آج اس دکھ کا کوئی نشان اس کی زندگی پر نہیں لیکن انا کا دکھ سچا تھا اور ہر تھا۔ انا کو اس کا دکھ بھی ہوگا۔

وہ بہت تیزی سے بھاگا، انا گلی سے مڑ چکی تھیں جب وہ بھاگتا ہوا گلی میں مڑا تو انا قبرستان والی سڑک پار کرنے والی تھیں وہ انا..... انا پکارتا ہوا بھاگتا رہا لیکن انا نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

”انا..... انا کو میں تمہارا ذیشان ہوں۔“ وہ چلا یا۔ انا سڑک کے عین وسط میں رک گئیں اور اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ ایک لمحہ شاید وہ صرف ایک لمحہ تھا، تاریک سڑک پر سیاہ چادر میں لپی ہوئی وہ محض ایک سایہ معلوم ہو رہی تھیں۔ اچانک ایک ٹرک کے بریک چیخے اور انا سڑک پر پھر گئیں، ٹرک ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر رفتار پکڑ گیا۔ سنسن سڑک پر پوچھنے والا کون تھا۔

وہ لپک کر انا کے پاس پہنچا، وہ لبو لبہاں تھیں کرشن نے ان کا سراپے زانو پر رکھ لیا۔

”تو..... تو کرشن ہے نا۔ جانے کتنی صدیوں بعد ملا ہے۔ ہے نا؟“ انہوں نے پوچھا اور کرشن کے میں رہ گیا۔ انا نے بیس برس بعد بھی اسے پہچان لیا تھا۔ ”وہ کہتے تھے میں پاگل ہوں، کسی کو

اس کی موجودگی میں بھی تو میرا بیٹا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ میں تجھے کبھی نہیں بھولوں گی۔“ پھر ان کا بچہ عجیب ہو گیا تھا۔ ”لیکن تو شاید مجھے بھول جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے ذیشان کو اس کی گود میں دے دیا۔ ”ارے پگلے یہ میرا بیٹا بعد میں تیرا بھائی پہلے۔“ اور واقعی انا کی محبت میں اسے کوئی فرق محسوس نہیں ہوا، وہ اب بھی اسے پہلے ہی کی طرح چاہتی تھیں۔

پھر اچانک تین ایسے رونما ہوئے سات سالہ ذیشان حادثے کا شکار ہو گیا۔ احسان صاحب یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے اور انا کے گھر سے یک وقت دو جنازے اٹھے، انا تو پاگل ہو کر رہ گئیں عین اسی وقت جب انہیں کرشن کی ضرورت تھی، کرشن کی ماں اس کا ساتھ چھوڑ گئی، سب کچھ لٹ کر رہ گیا۔ اسے تو یاد ہی نہیں تھا کہ وہ دن کیسے گزرے تھے وہ اپنے دکھ کے سیلاب میں اسی طرح بہا تھا کہ اسے کسی اور کا ہوش ہی نہیں رہا۔ لوگ بتاتے ہیں کہ جب تک انا کا ذہنی توازن کسی حد تک ٹھیک رہا۔ وہ ذیشان کے ساتھ ساتھ کرشن کو پکارتی تھیں، پھر جب انہیں کرشن کی صورت بھی نظر نہ آئی تو وہ صرف ذیشان کی صورت ہی دیکھیں اور اچانک ایک دن غائب ہو گئیں۔

✽.....✽.....✽

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا، خاتون گلی سے مڑ رہی تھی وہ بھول لے کر چلی بھی گئی تھی اور وہ ماضی کے درپچوں میں جھانکتا رہ گیا، اب اسے اپنی کوتاہی کا احساس ہو رہا تھا، اسے انا کے وہ الفاظ یاد آ رہے تھے ”میں تجھے کبھی نہیں بھولوں گی لیکن تو شاید بھول جائے گا۔“ اور وہ کم ظرف

ایک ایک کر کے کھل گئے اور وہ ان میں جھانکتا رہا۔ وہ جس محلے میں رہتا تھا وہاں شرف آباد تھے وہیں احسان نامی ایک صاحب رہتے تھے ان کی بیوی کا نام رابعہ تھا، دونوں میاں بیوی بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے لیکن خود اولاد سے محروم تھے۔ کرشن جب بھی ان کے گھر جاتا وہ اسے کھلاتیں، پلاتیں، اس کو پیار کرتیں، پیاری پیاری کہانیاں سناتیں، کبھی بھی اس کی آنکھیں موندنے لگتیں تو اسے لوری دیتیں۔

کرشن کو یاد تھا کہ اسے ان کا عبادت کا طریقہ اتنا پسند تھا کہ ان کے ساتھ بیٹھ کر عبادت کرے جب وہ جاء نماز پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کے بعد جھولی پھیلاتیں اور جانے خدا سے کیا مانگتیں کہ ان کی آنکھیں برستی رہتیں۔ ایسے میں ان کا چہرہ اتنا روشن ہو جاتا کہ کرشن انہیں دیکھنے کی بھی ہمت نہ کر پاتا، پھر وہ نماز سے فارغ ہوتیں تو ان کی طرف دیکھ کر کرشن کو ایسا لگتا کہ ان کی دھلی دھلی آنکھوں میں بھگوان اتر آیا ہو۔

احسان صاحب کی محلے میں بہت عزت تھی وہ تھے بھی بہت مخلص آدمی۔ ہر ایک کی مدد کے لیے پیش پیش رہتے اور بچوں میں بچہ بن جاتے پھر ان کی زندگی میں وہ یادگار دن بھی آیا جب خدا نے ان کی سب سے بڑی آرزو پوری کر دی، ان کے گھر بیٹا پیدا ہوا اور انہوں نے اس کا نام ذیشان رکھا۔ وہ بہت پیارا سا بچہ تھا اس کی پیدائش کے بعد کرشن ان کے گھر گیا تو اس نے بڑی حسرت سے کہا۔

”انا، اب میں آپ کا بیٹا نہیں۔“
”پاگل۔“ انا نے اس کے رخسار تھپتھپائے۔
”جب ذیشان نہیں تھا تب بھی تو میرا بیٹا تھا، اب

گردش ہے

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن، زن، زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ نیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے پیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے ذمے میں صرف پچھانوہ باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کر دی ہے۔

اس داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری، بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جاہلوں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جاہلوں کی دہلیز پر مامتا ٹپکتا دکھائی دیتا ہے۔

تیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے فن کی تحریر سلسلے وار کہانی

سمندر کے کنارے پر کھڑا میں بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا کہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر گہری اداسی اور غم و الم چھایا ہوا تھا۔ پھر میرا دل نہ مانا تو میں بھی باؤنڈری پار کر کے پتھروں سے اترتا ہوا سمندر کی گیلی ریت پر اتر آیا۔ میں جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوتا ہوتا اس کی جانب بڑھتا گیا حد یہ کہ میں اس کے بالکل نزدیک پہنچ گیا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا لیکن وہ اپنے خیالات کے جہوم میں کچھ اس طرح گھری ہوئی تھی کہ اس نے میری آہٹ یا میری آمد کو قطعی محسوس نہیں کیا۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ہوئے تھے۔ سمندر کی تیز ہوائیں اس کے بالوں کو اڑا رہی تھیں۔ ہمیں کچھ میں متید اس کے بالوں کو شدید ہواؤں نے بھیڑ دیا تھا رفیق بار بار اس کے رخساروں کو چوم رہی تھیں لیکن اسے ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میرا شدت سے جی چاہا کہ میں اس کی اینٹریوں کو اپنے ہاتھوں سے سنواروں پہلے جب بھی اس کی

کس طرح مناؤں ان کی نگاہوں میں بقول ان کے ایک پتھر ڈاکٹر کی کوئی ویڈیو نہیں ہے انہیں تو بے پناہ دولت مند لوگ ہی بھاتے ہیں لیکن شاہو میں نے بھی انہیں صاف صاف بتا دیا ہے کہ اگر میں شادی کروں گی تو تم ہی سے ورنہ اپنی جان دے دوں گی۔ اس نے ہنستے ہنستے گہری سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیا اور بے ساختہ میری بانہوں میں سمٹ آئی۔

میری مذاق میں کہی ہوئی بات کو بھی وہ سنجیدگی سے لیتی اور مجھ سے ایک فاصلہ قائم رکھتی۔ لیکن ہماری آخری ملاقات میں وہ خود اپنے ضبط کے سارے بندھن توڑ بیٹھی تھی۔ اس نے میرے سینے سے ہٹ کر میرے چہرے کے کئی بوسے لیے تھے اور اس کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا۔

”شاہو یہاں سے فوراً کہیں روپوش ہو جاؤ“ ڈیڈی تمہاری جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔ ابھی میں نے خود ان کی اور انکل شیر افضل کی گفتگو سنی ہے وہ تمہیں میرا رشتا کبھی نہیں دیں گے بلکہ بہانے سے موت کا تختہ دیں گے۔ مجھے بھول جانے کی کوشش کرنا یوں سمجھنا ہم ملے ہی نہیں تھے۔ ہم زندگی میں نہیں ملے تو کیا میں یہ سوچ کر جی لوں گی کہ تم جہاں بھی ہو زندہ ہو۔

اور آج اتنے سالوں کے بعد یہاں کراچی میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ تباہی ٹیکسی میں کیوں آئی ہے۔ پھر میں نے اسے پکار ہی لیا۔ ”مہوش“

حالانکہ میں نے بہت دیر سے اسے پکارا تھا لیکن میری صدائے ان کی سماعت میں پانچل سی چا دی اور وہ بری طرح چونک پڑی۔ اس کی نگاہ جب میرے اوپر پڑی تو اس کی آنکھوں میں اجنبیت تھی۔ آنکھوں سے پھلکتی اجنبیت دیکھ کر مجھے شاک سا لگا لیکن میں فوراً سنبھل گیا چوں کہ میں میک اپ میں تھا

اس لیے ان کا انداز درست تھا۔ مہوش یہ میں ہوں تمہارا ڈاکٹر شاہ زماں اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے گلاب جیسے لب تھر تھرانے لگے۔ جھیل جیسی آنکھوں میں جھلکین پانی ہلکورے لینے لگا۔

اس کا کپکپاتا ہوا ہاتھ اٹھا اور میری جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے سرگوشی کی۔

”شاہو..... تیت..... تم زندہ ہو.....؟“ شدت جذبات سے ڈھیر سارے آنسوؤں کا گولہ میرے حلق میں آ کر اٹک گیا اور میں محض سر ہلا کر رہ گیا۔

”تم شاہو ہی ہونا یا میرے اللہ“ اس نے اپنا سر آسمان کی جانب اٹھایا اور بولی۔ ”تم سچ زنده ہو یا میں ہمیشہ کی طرح کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ تم آج بھی میرے خوابوں میں آتے ہو اور مجھ سے یہی کہتے ہو کہ مہوش میں زندہ ہوں۔“ اس کے آنسو تیزی سے بہتے ہوئے اس کا چہرہ بھگور رہے تھے۔

”میں زندہ ہوں مہوش ہاں یہ میری بد نصیبی ہے کہ اپنے پیاروں کو کھو دینے کے بعد بھی میں زندہ ہوں بلکہ ڈھنٹائی کے ساتھ نئے جا رہا ہوں۔“ ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھوں کو تھام لیا ہم رو بھی رہے تھے اور ہنس بھی رہے تھے۔

دیکھ رہی ہوں۔“ مہوش نے بیجانی کیفیت میں کہا۔
 ”یہ طریقہ بھی میں نے ہی اپنایا تھا۔ میرے
 ساتھ ایک ہندہ بیٹھا تھا ٹرین کے حادثے میں اس کی
 ڈیٹھ ہوگئی تھی جبکہ مجھے معمولی چوٹیں آئی تھیں
 میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی اور اپنے دشمنوں
 کے اطمینان کے لیے میں نے یہ کام کیا کہ اپنا شناختی
 کارڈ اور پرس اس کی جیب میں رکھ دیا اور اس کی
 چیزیں اپنے قبضے میں لے لیں۔ بس اسے اپنی خوش
 نصیبی ہی کہوں گا کہ اس شخص کا چہرہ کل کرمخ ہو گیا تھا
 ورنہ قابل شناخت تھا اسی لیے میرے ذہن میں ایسا
 کرنے کا خیال آیا۔“ میں نے کہا۔
 ”تم نے ایسا کرتے ہوئے ایک بار بھی یہ نہیں
 سوچا کہ جب میں یہ خبر سنوں گی تو میرا کیا حال
 ہوگا۔“ مہوش نے میرے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے
 لگاتے ہوئے کہا۔
 کچھ لوگ ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے
 ہمیں اس طرح کھڑے دیکھ کر ہم پر آوازیں کتے
 ہوئے چلے گئے تب میں نے سے کہا۔
 ”مہوش کیا ایسا ممکن ہے کہ ہم کہیں اطمینان
 سے بیٹھ کر بات کر سکیں۔ یہاں اتنے لوگ آ جا رہے
 ہیں اور ہمیں عجیب عجیب سی نگاہوں سے بھی دیکھ
 رہے ہیں۔“
 ”ہاں..... اس نے ایک بار پھر ایک گہری سانس
 لیتے ہوئے میرے ہاتھوں کو چھوڑ دیا۔
 ”کہاں چلیں۔“
 ”کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”ٹھیک ہے وہ جو سامنے دکھائی دے رہا ہے
 وہیں چل کر بیٹھتے ہیں تم اپنی کار میں جاؤ میں نے
 ایک ٹیکسی ہائری کی ہے میں اس میں بیٹھ کر آئی ہوں۔“
 مہوش نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گئی۔

میں بھی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنی کار تک
 آیا اور سمندر کے کنارے بے ایک ریسٹورنٹ میں جا
 کر بیٹھ گیا۔
 تھوڑی دیر بعد مجھے مہوش بھی آتی ہوئی دکھائی
 دی۔ رات کا وقت تھا اس وقت ریسٹورنٹ میں کافی
 رش تھا لیکن پھر بھی ہمیں ایک خالی ٹیبل مل ہی گئی۔
 میں نے بیٹھے بیٹھے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا تو وہ
 میری جانب آنے لگی۔ میں قدرت کے اس حسین
 اتفاق پر بے حد خوش تھا کچھ بھی تھا آج میں اپنی مہوش
 سے مل لیا تھا۔ اسے دیکھ لیا تھا میرے جینے کے لیے
 اس کا یہ چند لمحوں کا ساتھ ہی کافی تھا۔
 اچانک میرے موبائل کی رنگ ٹون سنائی دی
 میں نے بے زاری سے فون کی روشن اسکرین پر نگاہ
 ڈالی تو میڈم روزی کا نمبر جگمگا رہا تھا۔
 اس سے پہلے کہ مہوش میری ٹیبل تک آتی میں
 نے جھٹ آنس کا مٹن پیش کر کے فون کان سے لگا لیا۔
 ”کہاں رہ گئے شمرز..... میں کب سے تمہارا انتظار
 کر رہی ہوں۔“ روزی نے میرا ہیلو سنے بغیر ہی کہا۔
 ”روزی میں اس وقت بہت ضروری کام کے
 سلسلے میں مصروف ہوں فارغ ہو کر خود تم سے رابطہ
 کروں گا ڈونٹ ڈسٹرب می پلیز گڈ بائے۔“ کہہ کر
 میں نے اس کا جواب سنے بنائی سیل فون کا آف کر دیا
 تاکہ اب کوئی بھی مجھے مزید ڈسٹرب نہ کر سکے۔ میں
 جانتا تھا کہ روزی کو میری یہ حرکت بہت بری لگی ہوگی
 لیکن مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی میں اپنی اس
 مصروفیت کا کوئی بھی بہانہ بنا کر اسے مطمئن کر سکتا تھا
 اور اسے مناسکتا تھا۔
 مہوش آ کر بیٹھی تو ویٹر نے مینو کارڈ لا کر ہمارے
 ہاتھوں میں تھما دیے۔ میں نے مہوش سے پوچھا کہ وہ
 کیا کھائے گی تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا کہ اس کا

کچھ بھی کھانے کا دل نہیں چاہ رہا ہے مگر میں نے کہا
 کہ ہم یہاں آئے ہیں تو کچھ نہ کچھ تو منگوانا ہی ہوگا۔
 ”ٹھیک ہے پھر اسٹیک کا منگواؤ۔“ اس نے
 کہہ کر کھوئے لہجے میں کہا۔
 میں نے ویٹر کو اسٹیک کا آرڈر لکھوایا تاکہ ہم
 اطمینان سے اپنی بات کر سکیں۔
 ”ہاں اب بتاؤ کہ تم کراچی کس سلسلے میں آئی ہو
 اور کیلی کیوں ہو؟“ میں نے پوچھا۔
 ”تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھے دو چار کو ساتھ لانا
 چاہیے تھا بھئی اکیلی ہوں تو اکیلی ہی آؤں گی۔“
 اس نے ایک پھینکی سی مسکراہٹ زبردستی اپنے
 لبوں پر سجاتے ہوئے کہا۔
 ”اکیلی ہو میں کیا سمجھوں تمہاری اس بات کا
 مطلب؟ ذرا وضاحت کرو۔“ میں نے دھڑکتے ہوئے
 دل کے ساتھ سوال کیا۔
 ”کاش مجھے بہت پہلے اس بات کا علم ہو جاتا کہ تم
 زندہ ہو تو آج حالات مختلف ہوتے۔“ اس کے لہجے
 میں ڈھیروں پیچھتاؤں کے رنگ گھلے ہوئے تھے۔
 اس نے ٹیبل کی سطح پر اپنا ناخن رگڑتے ہوئے کہا۔
 ”کون سے حالات.....؟ تم بتاؤ تو سہی آخر کیا
 ہوا ہے تمہارے ساتھ؟“ میں نے بے تاب لہجے
 میں پوچھا۔
 اس نے صرف لمحے بھر کے لیے اپنی لرزتی ہوئی
 بھیگی پلکیں میری جانب اٹھائیں پھر نیچے گر لیں۔
 اس نے کئی مرتبہ بات کرنے کے لیے اپنے لب
 کھولنے چاہے پھر لبوں کو تختی کے ساتھ ایک دوسرے
 میں بچھ لی۔ دو تین مرتبہ اپنے سر کو بھی جھکا دیا۔ پھر
 ڈھیروں اپنے اندر رکی ہوئی سانس باہر نکالی پھر بے
 بسی سے اپنا سر ٹیبل پر یہ کہتے ہوئے رکھ دیا۔
 ”میں کیا بتاؤں تمہیں میں کچھ بھی نہیں بتا سکتی۔“

”کیوں میرے صبر کا امتحان لے رہی ہو جو
 بات بھی ہے پلیز مجھے بتاؤ..... مہوش.....
 مہوش..... پلیز.....!“
 میں نے ٹیبل پر جھکے اس کے سر کو چھوتے ہوئے
 کہا تو اس نے سر اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو
 بہہ رہے تھے جنہیں اس نے اپنے ارد گرد کے ماحول
 کے خیال سے جھٹ ٹٹو سے صاف کر لیے پھر بولی۔
 ”کیا تم مجھے اس تصور کے لیے معاف کر سکو گے
 کہ میں تمہارے ساتھ بے وفائی کی مرتکب ہوئی
 ہوں۔“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے
 بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
 ”کیا تم نے شادی کر لی ہے؟“ میں نے دھڑکتے
 ہوئے دل کے ساتھ پوچھا تو اس نے نگاہیں جھکا کر
 اثبات میں سر ہلا دیا اور میرے اندر کہیں اندر سے کوئی
 چیز ٹوٹ گئی۔ میرے اندر بہت سا شور اٹھنے لگا لیکن
 اس شور کی صدا کسی نے بھی نہیں سنی۔ بس ایک میں ہی
 تھا جو اپنے ہونٹوں کو چباتے ہوئے اپنے ٹوٹے
 ہوئے دل کی کرچیوں کو سمیٹ رہا تھا میں کچھ بھی نہ
 کہہ سکا بس اس کی صورت تکنتارہا۔ کتنے ہی زہریلے
 خیالات تھے جو اس کے منہ سے چہرے کو دیکھ کر اس کے
 شوہر کے حوالے سے مجھے آ رہے تھے۔
 اس کے یہ منہ رخسار یہ بلوریں کچھ جیسی حسین
 آنکھیں گلاب جیسے لب اس کی تھوڑی کا یہ حسین
 ڈمپل..... سب کچھ تو میری امانت تھا پھر وہ کون تھا
 جس نے میری امانت میں خیانت کی۔
 اس سے پہلے کہ میں مزید کوئی سوال کرتا دیکھ ہمیں
 ڈنسر رو کر نے لگا۔ مہوش نے اس کی جانب سے رخ
 پھیر کر ویٹر کی لائی ہوئی منرل واٹر کی بوتل سے گلاس
 میں پانی ڈال کر پینے لگی۔
 ”سر اوپر کچھ؟“ ویٹر نے مودب ہو کر سوال کیا۔

”تو ٹیکس! ضرورت ہوئی تو بتا دیں گے۔“ میں نے کہا تو وہ چلا گیا۔

میں نے مہوش کو اشارہ کیا کہ وہ کھانا شروع کرے تو وہ ہاتھوں میں نورک اور نانف اٹھا کر کھیلنے لگی۔

”کون تھا وہ خوش نصیب۔“ میں نے پھر سوال کیا۔

”تمہیں اپنا دشمن اور ڈیڈی کا دوست شیر افضل تو یاد ہی ہوگا اس کا بھتیجا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اب کہاں ہے؟“ میں نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

”یہیں ہے کراچی میں۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”پھر تم اکیلی کیوں گھوم رہی ہو وہ بھی ٹیکسی میں کیا تمہارے پاس کار نہیں ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تم یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ میں نے یہ شادی کیوں کی وہ کیا حالات تھے کہ میں شادی کے لیے مجبور ہو گئی۔“ مہوش نے جھنجھلاتے ہوئے کہا اس کی آواز بھی تیز ہو گئی۔

”ریلیکس مہوش! تم اس طرح بات کرو گی تو سارے لوگ ہماری جانب متوجہ ہو جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”میرا دل غم اور شکستگی سے پھٹا جا رہا ہے اور تم اتنے اطمینان سے بیٹھے ہو کیا میری شادی کی خبر سن کر تمہیں ذرا بھی دکھ نہیں ہوا کیا واقعی تم نے مجھے اپنے دل سے اپنی یادوں سے نکال پھینکا تھا۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”ایسی بات نہیں ہے مہوش!.....!“ میں نے دھیرے سے کہا۔ ”میرے دل میں آج بھی تمہاری ایک ایک بات ایک ایک انداز موجود ہے۔“ میں نے

تمہیں کبھی بھی فراموش نہیں کیا بس اپنی زندگی میں اتنے درد و الم برداشت کیے ہیں کہ یہ دل درد سہنے کا عادی ہو گیا ہے۔

تمہاری شادی کا سن کر مجھے اس لیے شاک نہیں لگا کہ جب میں تمہاری زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل آیا تو تمہیں کسی نہ کسی کا ہاتھ تو تھا مٹا ہی تھا۔ میں تمہارے لیے پہلے بھی دعا گو تھا اور آج بھی تمہاری خوشیوں کا متنی ہوں۔ اللہ کرے تمہارا گھر ہمیشہ آباد رہے اور تم ہمیشہ خوش رہو۔“ میں نے بھیک بھیکے لہجے میں کہا تو وہ بولی۔

”تم آج بھی بالکل ویسے ہو ذرا بھی نہیں بدلے۔“

”اچھا یہ تمہارا خیال ہوگا ویسے میں نے اپنے آپ کو ٹیکس تبدیل کر لیا ہے۔“ میں نے دھیمی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”مثلاً کیا تبدیل کر لیا ہے؟“ اس نے میرے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میرے ذکر کو چھوڑ دو تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ کہ جب میں آخری بار تم سے جدا ہو کر گیا تھا تمہیں

یاد ہے راجہ صاحب نے اس دن مجھے ملنے کے لیے بلایا تھا اور تم نے مجھے یہ کہہ کر وہاں سے واپس لوٹا دیا تھا کہ میری جان کو خطرہ ہے اگر اس روز تم مجھے اپنی

جان کی قسم نہ دیتیں تو میں کبھی راجہ صاحب سے ملے بغیر نہ جاتا۔ موت سے تو نہ میں اس وقت ڈرتا تھا اور نہ ہی آج خوف زدہ ہوں اس لیے کہ میرا ایمان ہے جو رات قبر میں آتی ہے وہ آتی ہے زندگی کی اس اٹل حقیقت سے کیا خوف زدہ ہونا۔ جب تک

انسان کا وقت پورا نہیں ہو جاتا موت خود زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔“ میں نے کہا تو اس کی نگاہیں ایک بار پھر میرے چہرے پر جم گئیں وہ نہ جانے

میرے چہرے پر کس چیز کا کھون لگا رہی تھیں۔ ”تم نے ٹھیک کہا ہے شاہو مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تم واقعی تبدیل ہو گئے ہو تمہارا چہرہ تمہاری آواز اور لہجے میں نہ تو وہ پہلے والی نرمی اور حلاوت ہے اور نہ ہی تمہاری آنکھوں میں بلکہ اس کی جگہ ایک سختی اور کڑواہٹ سی آ گئی ہے ایسا کیوں ہوا ہے شاہو۔“ اس نے کہا۔

”وقت ہمیشہ تبدیلی لے کر آتا ہے اور یہ ہمارے حالات ہی ہوتے ہیں جو انسان کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ میرے جو حالات تھے ان سے تم واقف ہی ہو امی بابا! ارمان اور فائزہ سب مجھ سے جدا ہو گئے۔ پھر تمہارا ساتھ بھی چھوٹ گیا۔ شاید اسی وجہ سے میرے چہرے پر سختی اور لہجے میں سختی آ گئی ہے۔“ میں نے جواب دیا تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی اور بولی۔

اور شاید تمہارے ان تمام حالات کی ذمہ دار میری اپنی ذات بھی ہے۔ کاش میں تم سے ملی ہی نہ ہوتی۔ میں نے تم سے محبت ہی نہ کی ہوتی اور نہ اس بات کو کہ میرے ڈیڈی تمہارے دشمن ہوتے۔“ اس نے بھراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔

”تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو یہ سب تو میرے نصیب میں لکھا تھا۔ میں نے یہ دیکھ اٹھانے تھے شاید قدرت نے اسی لیے مجھے زندہ رکھا لیکن ان سب سانحات کا ذمہ دار تو شیر افضل تھا۔ تمہارے ڈیڈی تو نہیں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں یہ بات بعد میں میرے علم میں آ گئی تھی کہ تمہارے ساتھ وہ دشمنی شیر افضل نے میرے ڈیڈی کی ایما پر ہی کی تھی۔ وہ تو تمہیں بھی مار دینا چاہتے تھے اگر اس روز میں شیر افضل اور اپنے ڈیڈی کی گفتگو سن نہ لیتی اور تمہیں خبردار نہ کرتی تو آج تم زندہ نہ ہوتے۔“

”تمہارے ڈیڈی کہاں ہیں؟“ میں نے یہ جاننے کے بعد کہ راجہ بھی میری تباہی کا ذمہ دار ہے اپنے لہجے میں چھپی ہوئی شیر کی غراہٹ کو چھپا نہیں سکا۔ ”وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”اوہ آئی ایم سوری۔“ میں نے اپنے اندر رکی ہوئی سانس باہر نکالتے ہوئے کہا۔

”تمہیں پتا ہے شاہو تمہارے جانے کے کچھ عرصے کے بعد ان کے اوپر فاج کا شدید ایک ہوا اور ان کا دایاں حصہ مفلوج ہو گیا۔

جب تم ان سے ملنے کے لیے نہیں آئے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ دیکھ لو مہوش بیٹا میں نے تو شاہ زمان کو تمہارے رشتے کی بات کرنے کے لیے بلایا تھا میں اس کے بھائی اور ماں کے قاتلوں کو سزا دلوانے میں اس کی مدد بھی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کو تم سے محبت تھی ہی نہیں اسی لیے وہ نہیں آیا اور کہیں غائب ہو گیا اور تم ہو کہ اس کی محبت کو سینے سے لگا کر بیٹھی ہو۔

ان کی بات سن کر میرا دل زور سے تھپتھپانے لگا۔ وہ کتنا جھوٹ بول رہے تھے۔ جب کہ میری ادنیٰ سے ادنیٰ اور بڑی سے بڑی خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ ذرا بھی دیر نہیں لگاتے تھے اور میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی کو انہوں نے کس طرح مجھ سے چھین لیا۔ ڈیڈی کی ساری دولت میری ہی تو تھی۔ زندگی خوشی سے گزارنے کے لیے مجھے تو صرف تمہارا ساتھ تھا اور تمہاری محبت ہی چاہے تھی اور آج جبکہ میرے پاس بے پناہ دولت ہے لیکن میں خوش نہیں ہوں کاش ڈیڈی کو موت تھوڑی مہلت اور دے دیتی تو ڈیڈی خود آتی آنکھوں سے دیکھ لیتے میں ان کے جھوٹ پر انہیں کچھ بھی تو نہ کہہ سکتی بس انہیں دیکھتی رہ گئی۔

اس روز شدت کے ساتھ مجھے اپنی ماما یاد آئیں کاش وہ ہوتیں تو میں ان کے سینے میں منہ چھپا کے اپنے سارے سو بہا لیتی۔ اپنی محبت کے لئے کام کر لیتی۔ ماں کا محبت بھرا لمس تو مجھے نہیں ملا البتہ اپنے کمرے کی تنہائی میں اندھیرا کر کے میں تمہیں یاد کر کر کے رو لیتی تھی۔ تمہارے لیے دعائیں کرتی تھی۔

پھر ایک دن ڈیڈی نے مجھے بلایا اور ٹرین کے حادثے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو میں کہہ رہا تھا نا کہ وہ تمہیں چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے وہ اس حادثے کا شکار ہونے والی ٹرین میں سوار تھا ٹرین کراچی جا رہی تھی شاہ زیب اب زندہ نہیں ہے مر چکا ہے۔“

اور اس روز میں دھاڑیں مار مار کر روئی۔ اتنے آنسو بہائے کہ میری آنکھوں میں بسنے والے آنسوؤں کا سمندر خشک ہو گیا۔ میں بھی جیسے مر گئی تھی۔ بس سانسوں کا جسم کے ساتھ رشتا بنایا تھا۔

اور اس رات ڈیڈی کو فاج کا ایک ہوا اور میں تمہارے عم کو سینے سے لگائے لگائے ڈیڈی کی خدمت میں لگ گئی۔

ڈیڈی پندرہ بیس دن اسپتال میں رہنے کے بعد گھر آ گئے لیکن اب وہ صرف بستر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ چپ چاپ بستر پر لیٹے میری اداس صورت کو تکتے رہتے فاج کی وجہ سے وہ زیادہ بات نہیں کر سکتے تھے ان کی زبان بھی متاثر ہوئی تھی بڑی مشکل سے بات کر پاتے تھے۔

پتا نہیں میری دن رات کی خدمت نے انہیں کوئی احساس دلایا یا پھر میری صورت دیکھ کر انہیں اس بات کا احساس ہوا، ایک دن انہوں نے روتے ہوئے میرے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور مجھ سے معافی مانگنے لگے۔

”آپ کیوں معافی مانگ رہے ہیں ڈیڈی آپ نے کیا کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے مجھے تمہاری شادی شاہ زمان کے ساتھ کر دینی چاہیے تھی تاکہ تم بھی خوش رہتیں اور میں بھی سکون سے مر پاتا۔“ انہوں نے کہا۔

”آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں ڈیڈی آپ تو میری شادی شاہ زمان سے کرنا چاہتے تھے۔ شاہ زمان ہی بے وفا نکلا اور مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔“ میں نے ڈیڈی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ جواب دے بھی کیسے سکتے تھے ان کے اندر اتنی اخلاقی جرأت تھی ہی نہیں کہ اپنی غلطی اور اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیتے۔

پھر ایک دن شیر افضل ہمارے گھر آیا۔ وہ کافی دیر تک ڈیڈی کے ساتھ رہا۔ میں جب دوبارہ ڈیڈی کے کمرے میں گئی تو وہ ڈیڈی کو کسی بات پر قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھا تو دونوں خاموش ہو گئے اور ان کی خاموشی سے میں سمجھ گئی کہ میں نے انہیں ان کی کسی اہم گفتگو میں ڈسٹر ب کر دیا ہے۔ اس لیے وہاں سے فوراً ہی چل آئی فاج ہونے کے بعد ڈیڈی نے عملی طور پر سیاست میں حصہ لینا چھوڑ دیا تھا لیکن اب بھی ڈیڈی کے دوست سردار شیر افضل اور شیر زادہ خٹک اب بھی ڈیڈی کے پاس آتے تھے اور ان سے بہت سے گیمیں معاملات میں ڈسکس کیا کرتے تھے۔

ان کے جانے کے بعد میں دوبارہ ڈیڈی کے کمرے میں پہنچ گئی اور ڈیڈی سے کہا۔

”ڈیڈی آج تو آپ کافی فریش ہو گئے ہوں گے آپ کے دوست جو آئے تھے اور وہ کافی دیر کے بھی

ہیں۔“ ڈیڈی نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے میرا چہرہ تکتے رہے۔

”کیا بات ہے ڈیڈی..... آپ اس طرح سے مجھے کیوں دیکھ رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”کچھ نہیں، میں تمہارے چہرے کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ بیٹیاں کتنی پیاری ہوتی ہیں انہیں پیار سے پاؤناں سے محبت کرو لیکن ایک نہ ایک دن انہیں اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر جانا ہی ہوتا ہے۔“

ڈیڈی نے یہ مشکل انگ انگ کہا۔

”لیکن مجھے دیکھ کر آپ ایسی کوئی بات بھی نہ سوچیں کیونکہ میں تو آپ کو چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جانے والی۔“ میں نے ان کے گلے میں نیپکن لگانے کے بعد تچچے میں سوپ بھر کر ان کے منہ کے قریب لے جاتے ہوئے کہا تو انہوں نے ہاتھ آگے کر کے مجھے روک دیا۔

”یہ کیا ڈیڈی آپ بھی ناں کبھی کبھی بالکل بچے بن جاتے ہیں اب اگر آپ یہ سوچ نہیں لیں گے تو کمزوری کیسے دور ہوگی طاقت نہیں آئے گی تو آپ ٹھیک کیسے ہوں گے۔ پتا ہے ڈاکٹر سلطان نے مجھے حتی کے ساتھ ہدایت کی ہے کہ آپ کی خوراک کا خاص خیال رکھا جائے۔“ میں نے یہ سمجھتے ہوئے ڈیڈی اس لیے یہ سوچ نہیں لے رہے ہیں کہ انہیں خواہش نہیں ہو رہی ہے ان سے کہا۔

”بعد میں.....“ انہوں نے کہا ”پہلے میری بات سن لو۔“

”اچھا بتائیے ایسی کون سی خاص بات ہے جو بعد میں نہیں ہو سکتی۔“ میں نے سوپ کا پیالہ ایک جانب رکھتے ہوئے کہا۔

”ابھی شیر افضل آیا تھا وہ تمہارے رشتے کی بات کر رہا تھا اس کا بھتیجا ہے پڑا لکھا ہے اسٹیشن ہے

میرے خیال میں تو یہ ایک اچھا رشتہ ہے تمہارا کیا خیال ہے۔“ انہوں نے اٹکتے ہوئے بڑی مشکل سے اتنا بڑا جملہ بولا۔

”آپ انہیں صاف منع کر دیں۔ مجھے شادی کرنی ہی نہیں ہے۔ نہ ابھی نہ کبھی اور میں تو بس آپ کے پاس رہ کر آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔“ شادی کی بات سن کر میرا موڈ آف ہو گیا اور میں نے ڈیڈی کو بڑی رکھائی سے صاف صاف جواب دے دیا۔

”تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو کہ زندگی بھر شادی ہی نہیں کرو گی، میں تمہارا ایک بیمار آدمی..... تھوڑے ہی دنوں میں زندگی کی یہ مہلت بھی ختم ہو جائے گی پھر تمہارے سامنے ساری زندگی پڑی ہے کیسے تنہا گزارو گی۔“ ڈیڈی نے کہا۔

”البتہ آپ کو بڑی عمر دے ڈیڈی، بس مجھ آپ کے پاس سے کہیں نہیں جانا اور نہ ہی زندگی گزارنے کے لیے مجھے کسی کے بھی ساتھ کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر جانے لگی تو ڈیڈی نے مجھے آواز دی۔

”سے شے بیٹے۔“ ڈیڈی جب مجھے زیادہ پیار سے پکارتے تو سے شے بیٹے کہہ کر پکارتے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے قدم رک گئے اور میں پلٹ کر دوبارہ ان کے پاس آ بیٹھی۔

”خدا کی قسم سے شے بیٹے اگر شاہ زمان زندہ ہوتا تو میں خود تمہارا ہاتھ اس کے ہاتھ میں اپنے دل کی تمام تر خوشی اور رضا مندی سے دیتا لیکن میری جان اب میں اسے کہاں سے لاؤں، بھلے وہ خود تمہاری زندگی سے چلا گیا تھا لیکن اگر وہ زندہ ہوتا اور دنیا کے کسی بھی کونے میں ہوتا میں اسے تمہارے لیے ڈھونڈ لاتا لیکن اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ شادی کے لیے اب تمہارے پاس چو اُس نہیں ہے۔ میری حالت پر رحم کھاؤ اور مجھے مزید شرمندہ مت کرو

اپنی ساری جائیداد میرے نام کر دی۔
رئیس خان کو میرے مافی کی کسی بھی بات کا علم نہیں تھا حالانکہ شیر افضل ساری باتوں سے واقف تھا لیکن شاید اس نے یہ عقل مندی کی کہ رئیس خان کو ان تمام باتوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔
رئیس خان ایک خوب صورت پر سائی کا مالک تھا اس کے پاس بہت دولت تھی لیکن میں اس کے سامنے پتھر بنی رہتی وہ مجھے خوش رکھنے کی بہت کوشش کرتا لیکن میں کبھی نہ مسکرا سکی۔

میری شادی کو ابھی پندرہ دن ہی ہوئے تھے کہ ایک رات مجھے گھر کے ایک ملازم کا فون آیا اور اس نے بتایا کہ ڈیڈی کی حالت بہت خراب ہے۔ رئیس خان کا گھر اسلام آباد میں تھا میں فوراً پنڈی کے اسپتال پہنچی لیکن میرے پہنچنے سے پہلے ہی ڈیڈی مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔
میں ہفتوں گم صم رہی اب تو رئیس خان کے سامنے مجھے اداس رہنے کا جواز مل گیا تھا۔ ڈیڈی کے انتقال کے بعد رئیس خان نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنا بزنس دیوٹی میں سیٹ کر رہا ہے اور اس کے لیے بہت زیادہ رقم کی ضرورت ہے ہم تو دینی شفٹ ہو جائیں گے اس لیے یہاں کی جائیداد کی دیکھ بھال کون کرے گا بہتر یہ ہے کہ ساری جائیداد کو فروخت کر کے دینی کے بزنس میں لگادی جائے۔
میں نے اس بات پر ہلکا سا احتجاج کیا لیکن رئیس خان کی ضد کے آگے مجبور ہو گئی اور پھر اس نے ساری جائیداد بیچ دی۔

اب تم تنہا رات بھر جاگ کر اپنے عاشق کی یادوں سے دل بہلاؤ میں حسین نازنیوں کے ساتھ اپنی راتیں رنگین کروں گا۔ نہ میں تمہارے کام میں دخل دوں گا اور نہ تم میرے کام میں دخل دینا۔
”کیا عاشق عاشق کی بے ہودہ رٹ لگا رہی ہے۔“

رہا ہوں لیکن اپنے باپ ہونے کا کیا کروں تمہیں کس کے سہارے پر چھوڑ کر جاؤں میں نے شیر افضل سے کہا تھا کہ مہوش نہیں مان رہی ہے تو اس نے مجھے بتایا ہے کہ ڈاکٹر نے یہ کہتے ہیں کہ اگر مجھے دوسرا ایک ہوا تو میں زندہ نہیں بچوں گا اس لیے میری بیٹی اپنے مرتے ہوئے باپ کی بیاہری خواہش پوری کر دو۔“
”بکواس کرتے ہیں شیر افضل۔“ میں نے تڑپ کر غصے سے کہا۔
”دیکھو بیٹا اگر میرا دوسرا ہاتھ اٹھ سکتا تو میں تیرے آگے اپنے ہاتھ جوڑ دیتا۔ اللہ کے واسطے اپنی ضد چھوڑ دے اور میری بات مان لے۔“

ڈیڈی کے مفلوج بستر پر پڑے جسم اور لا چاری کو دیکھ کر مجھے اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہوا اور میں نے ان کے ہاتھ کو اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔
”ٹھیک ہے ڈیڈی جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا ہی کریں میں تیار ہوں۔“
”اس سے اگر ملنا چاہتی ہو تو مل لو میں نے تو اسے دیکھا ہوا ہے اور اس سے ملا بھی ہوں۔“ ڈیڈی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
”اس کی ضرورت نہیں ہے ڈیڈی جیسا آپ کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی ہوگا۔“

میں نے صرف ایک بے بس اور لا چار باپ کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالے تھے میرے لیے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کون ہے کیسا ہے کیونکہ میرے دل کے نہاں خانوں میں آج بھی صرف ایک ہی صورت چھپی ہوئی تھی اور وہ صورت تمہاری تھی شاہد صرف تمہاری۔ پھر ڈیڈی نے شیر افضل کو بلوایا اور اسے میری رضامندی کی خوش خبری سنائی۔ ایک ہفتے کے قلیل عرصے میں ایک شام میرا نکاح رئیس خان کے ساتھ کر دیا گیا۔ اسی روز ڈیڈی نے وکیل کو بلوا کر

تمہارے ساتھ زیادتی کر کے میں خود اپنی لگا ہوں میں گر گیا ہوں۔ دیکھو قدرت نے مجھے میری زیادتی اور گناہوں کی کتنی بڑی سزا دی ہے میں ایک زندہ لاش بن کر رہ گیا ہوں۔ اگر تمہیں اسی طرح چھوڑ کر مر گیا تو مرنے کے بعد میری روح بھی بے چین و بے قرار رہے گی مجھ پر احسان کرو اور شادی کر لو۔ تاکہ میں سکون سے مر سکوں۔“ ڈیڈی نے اتنی بات کی تو ان کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔ ان کی حالت خراب ہونے لگی۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور سانس اکھڑنے لگا میں نے گہرا کر ڈاکٹر کو کال کی۔

ڈاکٹر نے آتے ہی ڈیڈی کو دیکھا اور کہا کہ انہیں ہارٹ ایک ہوا ہے فوراً اسپتال لے جانا ہوگا۔
اس ہارٹ ایک کے بعد ڈیڈی چند روز اسپتال میں رہ کر گھر تو لوٹ آئے لیکن ڈاکٹر نے سختی سے ہدایت کی کہ انہیں کسی بھی قسم کے ڈپریشن اور ٹینشن سے دور رکھا جائے ورنہ اگر دوسرا ایک ہوا تو وہ جاں لیوا بھی ہو سکتا ہے۔

گھر آ کر ڈیڈی نے دوبارہ مجھ سے رشتے کی بات چھیڑ دی۔ میں نے روتے ہوئے ڈیڈی کے سینے پر سر رکھ کر کہا۔

”ڈیڈی شادی تو خوشی کے بندھن کا نام ہے۔ لیکن میرا دل اندر سے مردہ ہو چکا ہے۔ اس میں خوشی اور مسرت کی ذرا سی بھی رقی باقی نہیں ہے۔ یہ تو آپ کی ذات ہے ڈیڈی جس کے سہارے میں زندہ بھی ہوں ورنہ جب میں نے شاہ زمان کے مرنے کی خبر سنی تھی۔ میں بھی اپنے آپ کو ختم کر لیتی پلیز مجھے کسی امتحان میں مت ڈالیں میں کسی کو کوئی خوشی نہیں دے سکتی۔“ میرے ساتھ ساتھ ڈیڈی بھی رونے لگے۔ پھر بولے۔
”میں تمہارے دل کی حالت اور ذہنی کیفیت کو سمجھ

کون سا عاشق؟ کیا عاشق؟“ میں جوتانی دیر سے چپ چاپ اس کی بکواس سن رہی تھی ایک دم ہی پھٹ پڑی۔

”زیلیکس ڈیئر زیلیکس۔“ وہ بہت پرسکون لہجے میں بولا۔ ”جیسا تمہارا رویہ میرے ساتھ رہا ہے وہ تو چنچ چنچ کر کہہ رہا ہے کہ تمہارے دل میں کسی اور کی حکمرانی ہے مجھے کیا تم نے دودھ پیتا بچہ سمجھ رکھا ہے۔“

گھاٹ گھاٹ کا پانی بیا ہے میں نے میری جان..... اور عورتوں کے تو میں تمام تاریخ و جغرافیہ سے اچھی طرح سے واقف ہوں اور تم سمجھ رہی تھیں کہ میں تمہیں نہیں پہچان پاؤں گا۔ ویسے کیا آج اس راز سے پردہ اٹھاؤں گی کہ تمہاری اس سے شادی کیوں نہیں ہوئی؟ کیا وہ تمہیں بے وفائی کا داغ دے کر بھاگ گیا۔“

”شٹ اپ..... شٹ اپ.....!“ میں غصے کی شدت سے بری طرح کانپ رہی تھی۔ میں بری طرح روتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ آج جو روپ میں نے رئیس خان کا دیکھا تھا وہ پہلے نہیں دیکھا تھا میری نگاہوں میں وہ ایک سیدھا سادا اور محبت کرنے والا شہر تھا۔ بلکہ بعض اوقات تو مجھے خود پر اور اس کے ساتھ اپنے رویے پر شرمندگی بھی ہوتی تھی اور میں سوچتی کہ کاش میں اس کی محبت کا جواب محبت سے دے سکوں۔

لیکن جب یہ ساری باتیں میرے علم میں آئیں تو مجھے اس سے شدید نفرت ہو گئی اور پھر ایک اور بات سنی ان دنوں ہمارے دینی جانے میں چند روز ہی باقی تھے۔ معلوم ہوا کہ شیر افضل کی بڑی نیک اور پارسائی جس کو اس نے اپنی حویلی میں سات پردوں میں چھپا کر رکھا تھا کنواری ماں بننے والی ہے۔

اس خبر کو سن کر میں بہت روئی اور اللہ تعالیٰ سے فریاد کی کہ یا اللہ گناہ تو باپ کرتے ہیں تو سزا بیٹیوں کو

کیوں دیتا ہے میرا باپ گناہگار تھا میں سزا بھگت رہی ہوں۔ شیر افضل گناہگار کا تو سزا اس کی بیٹی کو کیوں ملی میں نے یہ بھی سنا کہ ایک روز چپ چاپ اس کی بیٹی سر گئی۔ شاید اس نے اپنے ہاتھوں ہی اپنی بیٹی کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا۔ زہر دیا ہوگا۔ سنے میں یہی آیتھا کہ اس نے زہر کھا کر خود کشی کر لی تھی۔

دئی آنے کے بعد میں نے خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیا شروع ہی سے میں نے اپنا بیڈروم علیحدہ کر لیا تھا۔ مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ اپنی راتیں دوسری عورتوں کے ساتھ گھر سے باہر گزارتا ہے یا انہیں گھر میں لے کر آتا ہے۔

آہستہ آہستہ میرے اوپر بہت سے راز منکشف ہو گئے وہ یہ کہ رئیس خان کہنے کو تو ایک بزنس مین ہے لیکن در پردہ اس کے کئی دوسرے برے دھندے بھی ہیں۔ اس کے پاس نجائے کہاں سے دولت کے انبار لگے جا رہے ہیں۔

مجھے یہ کبھی معلوم ہوا کہ پاکستان میں کوئی بہت پہنچا ہوا پیر ہے اور رئیس خان اس کا بہت بڑا معتقد ہے وہ اسے اپنا روحانی باپ سمجھتا ہے۔

چھپے دنوں رئیس خان بہت زیادہ پریشان تھا۔ اس نے کئی مرتبہ اس پیر کو فون بھی کیا پھر شاید اس نے رئیس کو بلوایا یا رئیس نے خود ہی پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔

حیرت انگیز طور پر اس مرتبہ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ پاکستان اپنے پیر صاحب کی خدمت میں حاضری دینے جا رہا ہے تم بھی چلو تم اپنے اوپر دم کرو الینا تمہارے بے قرار دل کو سکون مل جائے گا۔

اور میرے منع کرنے کے باوجود وہ مجھے اپنے ساتھ پاکستان لے آیا انہیں چار یا پانچ دن ہی ہوئے ہیں مجھے آئے ہوئے ہم یہاں ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ رئیس خان نے ابھی تک تو مجھے اس پیر سے نہیں

ملوایا ہے البتہ خود جاتا رہتا ہے آج بھی وہ وہیں گیا ہوا ہے تو میں تنہائی سے گھبرا کر یہاں نکل آئی۔

اس لیے تم نے مجھے تنہائی میں دیکھا ہے اب تمہیں تمہارے سارے سوالوں کے جوابات مل گئے ہوں گے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں تنہا ہوں یا نہیں۔“ مہوش نے کہا وہ خاموش ہوئی تو میں جو بڑی حویت سے اس کی باتیں سن رہا تھا بری طرح چونک پڑا۔

”آں..... ہاں۔“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”اور تم، تم سناؤ تم بھی اکیلے ہو یا گھر بسا لیا ہے۔“ اس نے ایک پھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے چلو اپنے اس سوال کا جواب بھی تم ہی دو۔“ میں نے کہا تو وہ خاموش رہی۔ ”کیا ہوا مہوش۔ یہ کیا بڑا مشکل سوال ہے۔“

میں نے اسے خاموش دیکھ کر کہا تو اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

”اپنے منہ سے جواب دو مہوش“ میں آج تمہارے منہ سے جانا چاہتا ہوں کہ تم نے میری محبت اور وفا کو کتنا جانا تھا کتنا سمجھا تھا۔“ میں نے اپنے ضبط کیے ہوئے آنسو جو بار بار میرے حلق میں اٹک رہے تھے تھوگ نکلتے ہوئے انہیں اپنے اندر اتارتے ہوئے سوال کیا۔

”میرا پیار مجھ سے کہہ رہا ہے کہ تم نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے؟ تم بھی تنہا ہو۔“ اس نے ایک سسکی لیتے ہوئے کہا تو میں اسے تنکٹا رہا۔

”تم مرد ہوشاہ زمان اپنی ذات پر اختیار رکھتے ہو اپنے فیصلے خود لے سکتے ہو لیکن میں ایک لڑکی ہوں نہ اپنی ذات پر اختیار رکھتی ہوں نہ اپنے فیصلے خود کر سکتی ہوں۔ اگر ہم اپنے فیصلے خود کر لی ہیں تو باقی کہلائی ہیں اور امین ہو وفادار ہو لیکن میں تم سے محبت کا دعویٰ کرنے کے باوجود بے وفا نکلی۔“

تمہاری امانت کی حفاظت نہ کر سکی۔ میرا یہ جسم میرا نہیں رہا اس کا حق دار رئیس خان بن گیا اور اس کی اجازت میں نے اسے خودی نکاح نامے پر سائن کر کے۔“ اس نے دھکی لہجے میں کہا۔

”ایسا تم کہو مہوش مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے ہم پھر سے ایک ہو سکتے ہیں اگر تم چاہو تو۔“ میں نے امید بھری نگاہوں سے اسے دیکھا تو اس نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ”وہ کبھی بھی مجھے نہیں چھوڑے گا۔“

میں خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔ ریسٹورنٹ سے تقریباً لوگ جا چکے تھے سارا ہال ہی خالی ہو چکا تھا۔ ہماری اسنیک بھی ٹھنڈے ہوئے ویٹر بھی ہماری ٹیبل کی جانب آتا اور چلا جاتا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔

”رئیس خان کے اس پیر کا نام کیا ہے؟“ ”یہ تو مجھے نہیں معلوم۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”بھئی میں بھی اس سے دل کے سکون کے لیے دم کروالیتا۔“ میں نے بات کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

”دلوں کو سکون اس طرح تھوڑی ملتے ہیں یہ بے قراری کیا ہوتی ہے یہ لوگ کیا جانیں۔“ اس کے لہجے میں گہری اداسی کھلی تھی۔

تب ہی ویٹر ہماری میز کے پاس آیا اور آہستہ سے بولا۔

”آئی ایم سوری سر ریسٹورنٹ بند ہونے کا ٹائم ہو گیا ہے۔ اگر آپ.....!“ اس نے کھانے کی جانب دیکھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔ تب میں نے گھڑی میں ٹائم دیکھا حرات کا ایک بجنے والا تھا۔ ”ارے بہت دیر ہو گئی ہے مجھے واپس جانا چاہیے

اور پھر تیزی سے وہ مجھے خدا حافظ کہہ کر میری جانب دیکھے بنا آگے بڑھ گئی اور میں اسے جانے ہوئے دیکھتا رہا۔ ویٹر بل لے آیا تو میں نے پیسے ٹیبل پر رکھے اور ”نپ دی پلےز“ کہہ کر باہر نکل آیا۔

مہوش کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک اسی جگہ گم صم کھڑا رہا۔ تقدیر بھی ہمارے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ مہوش کا باپ سنگدل راجہ بھی اس حال کو بھی پہنچ سکتا ہے اور پھر مجبور ہو کر وہ مجھ سے مہوش کی شادی پر بھی تیار ہو سکتا ہے لیکن میں نے خود اپنے اوپر اپنی خوشی سختی کے سارے دروازے ہی بند کر ڈالے تھے اپنی شناخت کو ہی منوں مٹی تلے دبا دیا تھا اپنے جاننے والوں کے لیے تو میں دنیا ہی سے چلا گیا تھا۔

ان دنوں میری ذہنی حالت ایسی تھی کہ میں نے اپنی جان اپنی زندگی کو بھی اپنے اس ٹانگ کی اپنے زندہ ہونے کی خبر نہیں دی شاید میں یہ چاہتا تھا کہ وہ مجھے بھول جائے۔

مہوش کے بارے میں سوچتا ہوا میں بے خیالی میں سمندر کی جانب چلا آیا۔ سمندر کی ٹھنڈی تپ ہو ا میں میرے جسم کو چھوٹی ہوئی تیزی سے گزر جاتیں۔ یہی ہوا میں جب سارے جسم کو چھوتی ہیں تو عجیب طرح کا احساس ہوتا ہے اور اگر اندر سے دل کی دنیا خالی ہو تو یہی ہوا میں جسم و جان کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

میری کیفیت بھی کچھ اسی طرح کی تھی۔ مجھے رہ رہ کر پچھتاوا سا ہونے لگا کہ کاش میں نے مہوش کو یہی اعتماد میں لیا ہوتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا، لیکن آج یوں اچانک اسے اپنے سامنے دیکھ کر اس کی روداد سن کر میرا دل ایک بار پھر تڑپ اٹھا تھا۔ کاش وہ مجھے ملی

کہیں ایسا نہ ہو کہ رئیس آجائے مجھے غائب پا کر نجانے کیا کیا سوچ لے گا اور پھر مجھے اس کی طنزیہ باتیں سننا اور برداشت کرنا پڑیں گی۔“ مہوش بھی ٹائم دیکھ کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔

”کھانا تو یوں ہی پڑا رہ گیا۔“ میں نے کہا۔

”تم سے ملاقات ہو گئی آج رات شریک برسوں بعد میں سکون سے سو سکوں یا شاید لمحہ بھر بھی نہ سو سکوں میرے لیے یہی احساس کافی ہے کہ تم زندہ ہو۔“ مہوش نے کہا۔

”میں نے ویٹر کو اشارہ کیا کہ وہ بل لے آئے تو وہ چلا گیا۔“ اچھا میں چلتی ہوں۔“ مہوش نے کہا اور آگے قدم بڑھا دیے۔

”مہوش ایک منٹ روکو گی پلیز۔“ میں نے کہا تو وہ رک گئی۔

”اپنا کوئی کونٹیکٹ نمبر تو جاؤ۔“

”میرے پاس موبائل فون نہیں ہے میرا ہے ہی کون جس سے مجھے بات کرنا ہوتی ہے۔“ اس نے کہا۔

”اچھا دینی والے گھر کا نمبر ہی دے دو کبھی اگر تم سے بات کرنے کا دل چاہا تو.....!“ میں نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”رئیس کو اگر تمہارے بارے میں پتا چلا تو یہ اچھی بات نہیں ہوگی۔“ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں بار بار تنگ نہیں کروں گا کبھی نہ کبھی اشد ضرورت کے تحت..... اگر تم سے رابطہ کرنا پڑا تو اسی صورت میں۔“ میں نے التجائیہ انداز میں کہا۔

”تم ایسا کرو کہ تم مجھے اپنا نمبر دے دو۔“ اس نے کہا تو میں نے اسے اپنا نمبر دے دیا جسے اس نے اپنے ذہن میں سیف کر لیا۔

ہی نہ ہوتی۔ میں اپنے خیالوں اور خوابوں میں اپنی مہوش کے ساتھ زندگی گزارتا رہتا لیکن آج.....! لیکن آج جب وہ مجھ سے ملی ہے تو اس نے اپنی زندگی کی جو کہانی مجھے سنائی ہے وہ میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ کاش وہ اس حال میں مجھے ملتی کہ اس نے اگر گھر بسایا لیا ہوتا تو وہ اپنے شوہر کے ساتھ بہت خوش ہے۔

شوہر کا خیال آیا تو میں چونک پڑا۔ اب میرا ذہن نئے سرے سے اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

نجانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ مہوش کا شوہر رئیس اپنے جس پیر کے پاس آیا ہے وہ یہی نواب سوط ہے۔ پھر مجھے یاد آیا کہ جمعرات کو ”محفل“ کے اختتام کے بعد میں تنہا ہی واپس آیا تھا اور نواب وہیں رہ گیا تھا مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ نواب کے کوئی مہمان دینی سنے ہوئے ہیں اور وہ ان کے ساتھ مصروف ہے ہوسکتا ہے کہ وہ مہمان یہی ہو۔

لیکن ایک سوال پھر ذہن میں ابھرا کہ آخر رئیس کا ایسا کون سا کام ہے جس کے لیے وہ نواب کے پاس آیا ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں حشام جس خفیہ رپورٹ پر کام کر رہا تھا اس کا تعلق رئیس سے ہی ہو۔ لیکن رئیس تو پاکستان میں رہتا ہی نہیں ہے۔

میرا ذہن الجھنے لگا، ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ خفیہ رپورٹ کیا تھی اور کس کے متعلق تھی۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رئیس ہی کے خلاف وہ رپورٹ ہو اور اس نے نواب سے کہا ہو کہ وہ اسے اس مسئلے سے نجات دلائے۔

بہت سے سوالات تھے جو بار بار ابھر کر سامنے آ رہے تھے کبھی رئیس کا تعلق حشام والے مسئلے سے لگتا کبھی معاملہ بالکل منفرد دکھائی دیتا۔

میرا سر بری طرح دکھنے لگا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس سارے معاملے کی کھوج لگا کر رہوں گا۔

اس شخص کی تصویر میں سرمئی کودے آیا تھا۔ بلکہ طلال واحدی صاحب نے وہ تصویر کرنل مشتاق کو دے دی ہوگی۔ پھر ساری بات کھل جائے گی۔

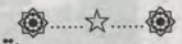
میں نے واپس کے لیے قدم بڑھائے۔ میں سمندر کے آگے بنی ہوئی چھوٹی سی باؤنڈری وال پھلانگ کرواپس آیا تو دیکھا میری گاڑی وہاں موجود نہیں تھی۔

میں ٹھک گیا اور سوچنے لگا کہ میری گاڑی کہاں چلی گئی میں نے نہیں تو پارک کی تھی پھر خیال آیا کہ سمندر کی ٹھنڈی ریت پر سوچوں کے بخور میں ڈوبا ہوا میں چلتے چلتے اس جگہ سے بہت دور نکل آیا تھا۔ اس لیے آگے پیدل چلنا شروع کر دیا۔

اس وقت ساحل پر تقریباً سناٹا ہی تھا رات کا نجانے کون سا پہر تھا میں نے اپنی کلائی پر ہنسی رسٹ واپس پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ ج کے چار بجنے والے تھے گویا ساری رات گزر گئی میں نے ایک گہری سانس لی اور آگے بڑھ گیا۔

دور سے ہی مجھے اپنی گاڑی کھڑی دکھائی دے گئی تو میرے قدموں میں مزید تیزی آ گئی میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالی اور فرنٹ ڈور کی جانب بڑھا اور پھر جیسے میرے قدموں کو بریک لگ گیا۔

دروازے کے ساتھ ایک انسانی جسم مڑی مڑی حالت میں پڑا تھا۔



حشام کی طبیعت میں بہتری آ رہی تھی ڈاکٹر نے اسے آئی سی یو سے روم میں شفٹ کر دیا تھا۔ اس کے کمرے کے باہر بھی بہت سخت سکیورٹی تھی۔ ایک

سکیورٹی گارڈ اس کے روم میں میل نرس کی حیثیت سے ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔

میں نے ڈاکٹر ذیشان سے التجا بھی کی کہ وہ مجھے حشام کے ساتھ اس کے روم میں رہنے دیں لیکن انہوں نے ہنستے ہوئے انکار کر دیا کہ ہمارے اسپتال کا یہ رول نہیں ہے۔ مریض کی دیکھ بھال ہمارا مقرر کردہ اسٹاف ہی کرتا ہے اور مریض جب حشام جیسا ہو تو پھر تو ساری ذمہ داری اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ البتہ انہوں نے اس بات کی اجازت دی کہ میں روزانہ حشام سے ملنے کے لیے اسپتال آ سکتی ہوں۔ میرے پاس اس بات کو ماننے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

میں سونے کے لیے اپنے بیدروم میں آ گئی اور اپنے بستر کو دیکھ کر ایک دم حشام کا خیال آ گیا۔ وہ اسپتال کے بستر پر ہوگا۔ اس نے کتنی تکلیف اٹھائی ہے اور اٹھا رہا ہے۔ جب وہ منہ سب سے کی گولی اس کے جسم میں پیوست ہوئی ہوگی تو اسے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔ پھر آپریشن..... دوا میں انجکشن اس کے بازو انجکشن کی وجہ سے پھلنی ہو رہے تھے۔

میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا زریو پاور کا بلب آن کر کے ساری لائٹس آف کر دیں اور امی سے کہہ دیا تھا کہ میں سو رہی ہوں مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔ حالانکہ امی بے چاری کیوں مجھے جگاتیں۔ بلکہ وہ تو میرے لیے فکر مند ہو رہی تھیں کہ میں مسلسل جاگ رہی ہوں بار بار کہہ بھی رہی تھیں کہ تم اپنا بھی خیال رکھو۔ ذرا آئینے میں خود کو دیکھو تمہاری رنگت زرد ہو رہی ہے آنکھوں کے گرد حلقے پڑنے لگے تھے اور ان کی چمک ماند پڑ رہی ہے اور میں نے بے زاری سے جواب دیا کہ امی ایک بار حشام صحت یاب ہو کر اسپتال سے گھر آ جائے تو میں خود بخود ٹھیک ہو جاؤں

گی۔ حشام کے بارے میں سوچتے سوچتے میں غنبد کی گہری وادیوں میں اتر گئی۔

آنکھ کھلی تو سورج کی تیز روشنی چاروں جانب پھیل چکی تھی۔ میں نے ٹائم دیکھا میں پورے چودہ گھنٹے تک سوئی رہی تھی۔

اودہ مائی گاڈ میں اتنا زیادہ کیسے سو سکتی ہوں۔ حشام تو میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی میں ایک جھلانگ مار کر بستر سے اٹھ گئی۔ نیم گرم شاور لیا تو بالکل فریش تھی۔ میں نے آج پہننے کے لیے حشام کا پسندیدہ لائٹ پنک کلر کا ڈریس نکالا اور پوری طرح تیار ہو کر باہر آئی۔

اماں اور امی باتوں میں مشغول تھیں۔ مجھے تیار دیکھا تو امی مسکرانے لگی اور بولیں۔

”تم سو رہی تھیں اس لیے میں نے تمہیں جگایا نہیں صبح سے دو مرتبہ طلال بھائی کا فون آچکا ہے وہ تمہارا پوچھ رہے تھے۔ میں نے بتایا کہ تم سو رہی ہو تو بولے۔ اسے سونے دو اٹھے تو اسپتال بھیج دینا حشام بار بار پوچھ رہا ہے۔“

”جی امی میں اسپتال جانے کے لیے تیار ہو رہی ہوں۔“ میں نے جواب دیا اور چائے مانگی۔ میرے منہ سے نکلا ہی تھا کہ اماں چائے لے آئیں۔

میں نے جلدی جلدی چائے حلق میں اندلی اور آصف کو آواز لگائی۔

”ارے ناشہ تو کرتی جاؤ بیٹا۔“ امی نے کہا۔

”ٹھیک ہے امی بالکل بھی بھوک نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”ایسے کیسے بھوک نہیں ہے بیٹا ذرا سوچو تو کب سے ایک لقمہ بھی نہیں کھایا ہے تم نے۔“

امی نے ناراضی بھرے لہجے میں کہا تو مجھے یاد آیا کہ ہاں واقعی میں نے کب سے کھانا ہی نہیں کھایا تب

ہی میرے پیٹ نے فریاد کی تو میں ناشتا کرنے لگی۔ آصف گاڑی کے ساتھ ریڈی تھے تو میں گاڑی میں بیٹھ گئی۔ آصف بہت شاندار ڈرائیونگ کرتے تھے میں نے خلوص دل سے ان کی ڈرائیونگ کو سراہا تو وہ مسکرانے لگے۔

آصف کوئی عام یا معمولی لڑکے نہیں تھے وہ ایک پڑھے لکھے تھے۔ کمانڈو کی ٹریننگ انہوں نے اپنے ذاتی شوق اور دلچسپی سے حاصل کی تھی اور اس لیے انہوں نے کرنل مشتاق کو جوان کیا تھا اور ان کے خفیہ انٹیلی جنس کے گروپ میں شامل ہوئے تھے۔ میری کار کا ڈرائیور بنا بھی ان کا کوئی اہم آپریشن کا حصہ تھا۔ ”آپ مجھے بھی اپنی طرح ڈرائیونگ کرنا سیکھا دیں۔ میں بہت بری ڈرائیونگ کرتی ہوں۔ حشام کے ساتھ جب بھی بیٹھتی ہوں ہمیشہ اس سے ڈانٹ کھاتی ہوں۔“ میں نے آصف سے کہا تو وہ جواباً بیک مرر میں مجھے دیکھتے ہوئے مسکرانے لگے۔

اور پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ بار بار مرر میں میری جانب دیکھ رہے ہیں۔ جیسے ہی میری نگاہیں ان کی نگاہوں سے ٹکرائیں ان کے گھٹی موچھوں سے بھرے بھرے لب دھیرے سے مسکرا دیتے اور میں گھبرا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی۔ اچانک وہ بولے۔ ”حشام آپ کے بیسٹ فرینڈ ہیں؟“

”جی۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔ ”صرف فرینڈ ہیں یا اس سے بڑھ کر کوئی اور بات بھی ہے؟“ اس نے سامنے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ مجھے آصف کا یوں بے تکلفی سے اس قدر ذاتی سوال پوچھنا ناگوار گزار اور میں نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تھوڑی دیر تو میرے بولنے کا منتظر رہا پھر بولا۔

”آپ کو شاید میرا اس قدر ذاتی سوال کرنا اچھا

نہیں لگا اسی لیے آپ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔۔۔ آئی۔۔۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔۔۔!“ اس نے کہا میں نے تب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ میں سر جھکا کر چپ چاپ بیٹھی تھی اور ارد گرد کی مجھے کوئی خبر نہیں تھی۔ تب ہی اچانک آصف کے منہ سے نکلا۔

”ہیلو ایلازم بیک پر ہی ہونا“ میں نے محسوس کیا ہے ایک بلیک کی گرولا میرا پیچھا کر رہی ہے اور۔۔۔۔۔!“ اس جملے کے ساتھ ہی میں بری طرح چونک اٹھی اور گھبرا کر آصف سے پوچھا۔ ”کیا ہوا آصف؟ کیا کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔“

”آپ ریلیکس رہیں اور ہاں اپنا سر قدرے جھکا کر بیٹھیں میں اس کو جھانسا دے کر نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ اس سے کہا۔

”لیکن یہ کون لوگ ہیں اور ہمارا پیچھا کیوں کر رہے ہیں؟“ میں نے تیشوں کے پار دیکھنے کی کوشش میں اپنا سر قدرے اونچا کرتے ہوئے پوچھا۔

”پلیز میم میں نے آپ سے درخواست کی ہے کہ اپنا سر نیچے رکھیں اور خاموش بیٹھیں۔“ آصف نے بدلے ہوئے لہجے میں تحسانہ انداز میں کہا تو میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اب میری سمجھ میں آنے لگا کہ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جنہوں نے حشام کو نشانہ بنایا تھا۔ شہروز بھائی نے بھی مجھے بتایا تھا کہ میری ذات بھی ان کی نگاہوں میں ٹھک رہی ہے۔

اس وقت ہم کنکشن کے پل کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ پھر آصف نے بہت تیزی کے ساتھ وہ پل عبور کر لیا۔ تب ہی میں نے دو گاڑیوں کو اپنے دائیں اور بائیں تیزی کے ساتھ قریب آتے ہوئے دیکھا۔

ساری گاڑیاں بہت برق رفتاری سے دوڑ رہی

تھیں۔ اس وقت سڑک تقریباً ویران ہی تھی۔ اکا دکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ پھر آصف نے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ اپنی گاڑی کو ان گاڑیوں سے آگے نکال لیا۔ مجھے حیرانی یہ تھی کہ اتنے قریب آنے کے بعد بھی ان لوگوں نے کوئی فائر نہیں کیا۔ اگر وہ مجھے مارنا چاہتے تو فائر کر سکتے تھے لیکن شاید وہ لوگ مجھے مارنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ شاید مجھے اغوا کرنا چاہتے تھے مجھے آصف کی آواز سنائی دی وہ کسی سے بات کر رہا تھا۔

”اس وقت صرف تعاقب ہو رہا ہے وہ ہمارے نزدیک بھی آگئے تھے لیکن انہوں نے فائر نہیں کیا پھر چند لمحوں دوسری جانب سے بات سننے کے بعد وہ پھر بولا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے اس طرح مجھے معلوم رہے گا کہ تم کیا کر رہے ہو اور تمہاری پوزیشن کیا ہے۔“ ابھی آصف کی کسی سے بات چیت جاری تھی کہ پیچھے سے ہماری کار کی سمت کیے بعد دیگرے دو فائر کیے گئے۔ آصف نے اس بات کی خبر اپنے ساتھی کو دی پھر کہا۔ ”ہم تین تلوار سے گزر رہے ہیں ساحل قریب ہی ہے امید ہے میں ان تعاقب کرنے والوں سے جلد پیچھا چھڑا لوں گا۔“

دوسری جانب سے آصف کو کوئی اور ہدایت دی گئی تو اس نے ”اوکے“ کہا اور سامنے ہی دو تلوار کے چوراہے سے آگے بھٹنے والی دو سڑکوں میں سے بائیں جانب جانے والی روڈ پر گاڑی دوڑانے لگے۔ آگے سڑک دور تک صاف تھی۔ آصف کسی جیٹ طیارے کی مانند کار کو اڑائے لیے جا رہا تھا کہ پیچھے سے شدید قسم کی فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ دو طرفہ فائرنگ تھی۔ فائرنگ کی آوازیں کر آصف نے خوشی سے سرشار انداز میں اپنے دونوں ہاتھ زور سے اسٹیرنگ پر مارے اور خوشی میں اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔

”یہ فائرنگ کہاں ہو رہی ہے؟“ میں نے سر جھکائے جھکائے پوچھا۔

”خطرہ ٹل گیا ہے اب آپ سیدھی ہو کر بیٹھ سکتی ہیں۔“ آصف نے مطمئن لہجے میں کہا تو میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”پلیز مجھے بتائیے تو آخر یہ سب کیا ہے پیچھے اتنی شدید فائرنگ ہو رہی ہے اور آپ اتنے مطمئن بیٹھے ہیں۔“ میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

”ہمارا تعاقب کرنے والوں کو میرے دوسرے ساتھیوں نے سنبھال لیا ہے اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں ہے بس میں ابھی تھوڑی ہی دیر میں آپ کو اسپتال پہنچا دیتا ہوں۔“ آصف نے اس طرح کہا جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہ ہو تب میں نے کہا۔

”آصف کہیں یہ وہ لوگ تو نہیں تھے جنہوں نے حشام کو نقصان پہنچایا ہے۔“

”ہو سکتا ہے ویسے آپ اپنے دماغ پر اتنا زور نہ ہی دیں تو بہتر ہے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں تو پھر کس بات کی فکر ہے آپ کو آپ تو جائیں اور اپنے فرینڈ کی تیمارداری کریں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اور میں اس لڑکے کے آہنی اعصاب کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھی کہ اس طرح کی پتھویشن میں بھی یہ قطعی پریشان نہیں ہوا اور اب بھی کتنا مطمئن ہے اور مسلسل مسکرا رہا ہے۔ میں پریشان صورت لیے بیٹھی تھی تو وہ بولا۔ ”اپنے چہرے پر بشارت لے آئیے آپ تو بیمار کی عیادت کے لیے جا رہی ہیں خود ہی بیمار لگیں گی تو بیمار بچارے کیا کریں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے ہلکا سا فہقہ لگایا۔

آصف اتنے دنوں سے میرے ساتھ تھا لیکن آج کھل کر مجھ سے اتنی بات کی تھی۔ اس کے چپکنے کی

وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔

وہ نہ جانے کن راستوں سے گاڑی نکال کر لایا مجھے قطعی اندازہ نہ ہو سکا۔ میں جب چونکی جب گاڑی نے اسپتال کے گیٹ کے سامنے بریک لگائے۔

”نیچے جناب اسپتال آ گیا تشریف لے جائیے اور ہاں واپسی میں آج میں خود آپ کو یہاں سے لے کر جاؤں گا۔ برائے مہربانی تنہا کہیں جانے کی کوشش مت کیجیے گا۔“ اس نے گردن موڑ کر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”طلال انکل کے ساتھ بھی نہیں۔“ میں نے معصومیت سے سوال کیا۔

”جی نہیں ان کے ساتھ بھی نہیں بھول گئیں کہ ابھی کیا ہوا تھا لگتا ہے کہ وہ لوگ اب حرکت میں آگئے ہیں آپ کو بہت محتاط رہنا ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں ایک گھنٹے میں آتی ہوں۔“ میں نے کہا اور دروازہ کھولنے لگی تو وہ تیزی سے اتر آیا اور میری جانب کا دروازہ کھول دیا اور پہلی بار میں نے اس کی پرسنائی کا جائزہ لیا وہ لمبے قد کا باڈی بلڈنگ والی جسامت اور گوری رنگت کا سرخ و سفید پٹھان تھا۔ چہرے پر گھنی مونچھیں اس کی مردانہ وجاہت میں اضافہ کر رہی تھیں۔

”کیا یہ دیکھ رہی ہیں کہ آپ کا باڈی گاڑ آپ کی حفاظت بھی کر سکے گا یا نہیں۔“ اس نے مجھے اپنا جائزہ لیتے ہوئے دیکھ کر کہا تو میں کوئی بھی جواب دیے بنا تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

کمرے میں داخلے سے پہلے باہر موجود گاڑوں کو میں نے ڈاکٹر ذیشان کا جاری کردہ کارڈ دکھایا تو انہوں نے مجھے اندر جانے دیا۔

اندر بیڈ پر حشام آنکھیں موندے لیٹا تھا میں آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس کے سر ہانے جا کر

کھڑی ہو گئی حالانکہ میں نے معمولی سی بھی آہستہ نہیں ہونے دی تھی۔ پھر بھی حشام کی آنکھ کھل گئی وہ مجھے دیکھ کر دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔

”کیسی ہو؟“

”تم بتاؤ کہ تم کیسے ہو؟“ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں تمہارا انتظار کر رہا تھا پتا چلا کہ تم سو رہی ہو میں نے سوچا کہ اچھا ہے تم تھوڑا آرام کرو لیوں نے کتنا پریشان کیا ہے نا تم سب کو۔“ اس نے محبت پاش نگاہوں سے مجھ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو حشام..... تم ہو تو میں ہوں..... اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں کیسے زندہ رہتی۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”سچ کہہ رہی ہو۔“ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”آخر کب تمہیں اعتبار آئے گا اب اگر ایسی بات کی نا تو میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔“ میں نے حسب عادت کہا۔

”اور کتنا توڑو گی پہلے ہی اتنی ساری ٹوٹ پھوٹ ہو چکی ہے رحم کرو مجھ غریب پر۔“ حشام نے ہنسنے ہوئے کہا پھر اس کے منہ سے ایک تیز سسکی نکل گئی۔

ہنسنے سے اس کی ناگوں میں تکلیف ہونے لگی تھی۔

”حشام.....“ میں نے تڑپ کر کہا۔ ”کیا کرتے ہو ابھی پہلوان نہیں بنے ہو اس لیے چپ چاپ لیٹے رہو۔“

پھر مجھے روم میں موجود اس گاڑ کا احساس ہوا تب میں نے اس سے کہہ وہ تھوڑی دیر کے لیے نہیں اکیلا چھوڑ دے تب وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

حشام کی صرف ایک سسکی سن کر میرا دل اس طرح تڑپا تھا کہ میں محبت سے بھی اس کی پیٹوں کو بہت نرمی سے سہلانے لگتی تھی اس کے بازو اور شانوں کو پھرنے

جانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے جھک کر اپنا چہرہ حشام کے چہرے پر رکھ دیا اور سر گوشی میں کہا۔

”مجھ سے آج ایک وعدہ کرو کہ ہمیشہ صرف مجھ سے محبت کرو گے اور مجھے میرے حصے کی محبت کرنے دو گے۔“

چہرے پر چہرہ تھا سانسوں سے سانسیں الجھ رہی تھیں۔ میری ہر سانس کی گرامہٹ اس کے اندر زندگی کی حرارت پہنچا رہی تھی۔ زخموں سے چور چور ہونے کے باوجود میری پیار بھری قربت اس پر سحر طاری کرنے لگی۔ کمزوری کے باعث اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

وہ بڑی فقاہت سے بولا۔ ”میں نہیں جانتا سمری کہ میں تمہیں کتنا پیار کرتا ہوں لیکن تمہاری محبت کا یہ انداز مجھے نئی زندگی اور نئی سانسیں دے رہا ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ تم مجھے کتنی اچھی کتنی پیاری لگ رہی ہو۔ بس اتنا جان لو کہ جس وقت مجھے گولیاں لگیں اور میں ہوش و حواس سے بے گانہ ہوا تو میری آنکھوں میں صرف تمہارا چہرہ تھا صرف تمہارا ہی تصور تھا۔“

بولتے بولتے اس کی آواز ڈوبنے لگی۔ میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں بڑے جذب کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔ آج میں بہت خوش تھی۔ بہت ہی زیادہ میں اسے سرتا پا دیکھ رہی تھی زندہ سلامت، میں ہولے ہولے اس کے جسم کو سہلاتی رہی۔ میرے ہاتھ اسے سرور بخش رہے تھے۔ پھر میں نے اس کے گھٹنگھے والے بالوں کی ایک لٹ جو پیشانی پر جھول رہی تھی نرمی سے اسے ہٹا کر اس کی پیشانی پر انے لب رکھ دیے۔

”آپ نے خاصی انرجی میرے اندر انجٹ کر دی ہے۔ اب اگر زیادہ ڈوز دیا تو میری طبیعت خراب ہو جائے گی۔“ حشام نے آنکھیں موندے موندے

نکسافق 99

مسکرا کر کہا تو میں بری طرح جھینپ گئی اور بے ساختہ کہا۔

”حشام کے بچے.....!“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ”ساری گڑ بڑ ہو گئی ورنہ ہم تو کوشش کر رہے ہوتے اب تک۔“ اس نے آنکھیں کھول کر شوخ لہجے میں کہا تو میں اس کے جملے کا مطلب سمجھ کر ہنس پڑی اور اس وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ڈاکٹر ذیشان اندر آ گئے اور آتے ہی بولے۔

”باہر عمران کو دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ آپ اندر تشریف فرما ہیں۔“

عمران وہ سیکورٹی گارڈ تھا جو اندر حشام کے ساتھ کمرے میں ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ ڈاکٹر ذیشان کا اشارہ اس کی جانب تھا میں اب بھلا ان کی بات کے جواب میں کیا کہتی مسکرا کر سر جھکا لیا پھر ڈاکٹر ذیشان مسکراتے ہوئے حشام کی جانب بڑھے اور بولے۔

”ہاں جوان اب کیا حال ہیں۔“ انہوں نے لفظ ”اب“ پر زور دیتے ہوئے معنی خیز لہجے میں پوچھا تو حشام بولا۔

”آپ دیکھ سکتے ہیں ڈاکٹر صاحب میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ میری اصل ڈاکٹر تو یہ ہے اسے میرے پاس ہی رہنے دیں لیکن آپ نے میری بات نہیں مانی۔“

جواب میں ڈاکٹر ذیشان مسکراتے ہوئے حشام کا چیک اپ کرتے رہے پھر پیچھے ہٹتے ہوئے بولے۔

”ہوں اچھا ہے جتنی تیزی سے تمہارا خون تمہاری نسلوں میں گردش کرے گا تمہارا زخم اتنی جلدی ٹھیک ہوگا۔“

ڈاکٹر ذیشان چیک اپ کے بعد چلے گئے تو میں پھر حشام کے نزدیک آ گئی۔ حشام کے پاس آ کر میں ذرا دیر پہلے والی ٹینشن بھی بھول گئی تھی لیکن میں یہ

نکسافق 99

بات اسے بتانے والی نہیں تھی کہ ابھی کچھ دیر قبل میرے اوپر بھی قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔

ابھی میں حشام سے باتیں ہی کر رہی تھی کہ طلال انکل اور آنٹی بھی آ گئے۔ آنٹی بھی بے حد خوش تھیں کیونکہ حشام انہیں پہلے کے مقابلے میں کافی بہتر دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے حشام اور آنٹی کو باتوں میں مصروف دیکھ کر طلال انکل کو باہر آنے کا اشارہ کیا تو وہ سمجھ گئے اور یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلے گئے کہ وہ ابھی ڈاکٹر ذیشان سے مل کر آتے ہیں۔ ذرا دیر بعد میں بھی انکل کو بلانے کے بہانے باہر نکل گئی۔

”کیا بات ہے سمری بیٹا تم نے مجھے باہر کیوں بلایا ہے۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟“ انکل نے فکر مندی سے پوچھا تو میں نے انہیں ساری بات بتادی۔

”اوہ مائی گاڈ!“ انہوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ لوگ تمہارے پیچھے پڑ گئے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں اغوا کرنا چاہتے ہیں اور اس سے ان کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تمہارے ذریعے اس ویڈیو کیسٹ کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے بیٹا کہ تمہارا گھر سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“

”خطرہ تو ہے انکل، لیکن میں ان لوگوں کے ڈر سے گھر میں چھپ کر تھوڑا بیٹھوں گی اور پھر اچانک ہی ایک خیال بجائی کی طرح میرے دماغ میں آیا اور میں نے سچان خیر لہجے میں کہا۔

”انکل نہیں ایسا نہ ہو کہ میری غیر موجودگی میں یا پھر میرے ہوتے ہوئے بھی وہ لوگ گھر میں زبردستی گھسنے کی کوشش کریں اور اس ویڈیو کیسٹ کو گھر میں تلاش کریں۔“

”ایسا بہت ممکن ہے۔“ انکل نے کہا پھر چند لمحوں سوچنے کے بعد بولے میں ابھی کرنل مشتاق سے

رابطہ کر کے انہیں یہ بات بتاتا ہوں۔

اور پھر اسی جگہ کھڑے کھڑے انکل نے کرنل مشتاق کو فون کیا اور ساری بات بتائی۔ پھر کچھ دیر دوسری جانب کی بات سنتے رہے پھر مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے فون بند کر دیا۔

”انکل! کرنل مشتاق نے کیا کہا؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”بیٹا ان لوگوں کا نیٹ ورک بہت مضبوط اور مربوط ہے جس وقت یہ معاملہ پیش آیا تھا انہیں اسی وقت اس سارے واقعے کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ ان کے پیش نظر بھی یہ بات تھی کہ وہ تمہارے گھر پر بھی حملہ کر سکتے ہیں تم فکر نہ کرو گھر کی سکیورٹی بڑھادی گئی ہے۔“

”لیکن امی تو پریشان ہو گئی ہوں گی۔“ میں نے فکر مندی سے کہا۔

”نہیں بیٹا تمہارے گھر میں ڈھیر سارے لوگ اکٹھے نہیں کیے گئے ہیں۔ گھر کے باہر ہی ایسے لوگوں کو تعینات کیا گیا ہے جو ہر لمحے تمہارے گھر پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور کسی بھی غیر معمولی صورت حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ تم بالکل بھی کسی بات کی فکر نہ کرو اب یہ معاملہ کرنل مشتاق نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوگا۔“

پھر انہوں نے مزید بتایا کہ کرنل مشتاق کل کی وقت آئیں گے انہوں نے بھی کچھ بتا لگایا ہے۔ میں نے انہیں جو تصویر بھیجی تھی وہ اس کے بارے میں کچھ بتانے والے ہیں۔

اسپتال میں ملاقات کے لیے آنے والوں کا نام ختم ہو گیا تھا اس لیے ہم سب نے حشام کو اللہ حافظ کہا اور باہر آ گئے باہر آصف الرٹ کھڑا تھا۔ انکل نے کچھ دیر رک کر اس سے کچھ باتیں کیں۔ جب ہم چلنے

لگے تو میں نے چلتے ہوئے انکل سے کہا کہ ”میں چاہتی ہوں جب انکل مشتاق آئیں تو میں بھی موجود ہوں۔“ انکل نے ہامی بھری کہ وہ مجھے ان کے آنے کا وقت بتا دیں گے۔

میں گھر کی جانب چارہی تھی۔ تب ہی میرے سیل فون پر جاوید کی کال آئی اور اس نے مجھے ایک ایسی خبر سنائی کہ جسے کر میں بری طرح چونک گئی۔

اس نے بتایا کہ رمضان صاحب جو ہمارے چوبیل کے بیورو چیف ہیں انہیں کچھ نامعلوم لوگوں نے اغوا کیا اور پھر تشدد کا نشانہ بنایا ہے انہیں بعد میں چھوڑ دیا گیا ہے وہ زخمی حالت میں اسپتال میں ایڈمٹ ہیں لاگھ پوچھنے پر بھی وہ ان افراد کے بارے میں کچھ بھی نہ بتا سکے جنہوں نے انہیں اغوا کیا اور تشدد کا نشانہ بنایا۔

”تمہاری کچھ سمجھ میں آ رہا ہے جاوید کہ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔“ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ کیونکہ جو بات میں اور جاوید جانتے تھے وہ کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ ان فیکٹ میں اپنے ایک خدشے کا اظہار اس روز انکل کے سامنے کرنا چاہ رہی تھی۔ شرموز بھائی بھی ہمارے ساتھ تھے لیکن وہ بات اذھوری رہ گئی۔

”میں کچھ کچھ اس مسئلے کو سمجھ تو رہا ہوں ابھی کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔ پہلے تم بتاؤ تمہارے خیال میں وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔“ جاوید نے گول مول سا جواب دیا۔

”پہلے مجھے تم یہ بتاؤ کہ حماد کہاں ہے کیا اسے بھی اغوا کیا گیا تھا اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے کیونکہ میرا خیال ہے کہ حماد رمضان صاحب کا راز داں ہے اور اسے بھی ساری بات معلوم ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”حماد کے بارے میں تو مجھے کچھ علم نہیں ہے کیونکہ وہ تو چھٹیوں پر ہے اس بات کا پتا کرنا پڑے

محبت

☆ محبت انسان میں خوداری پیدا کرتی ہے۔
☆ محبت پاکیزہ ہے تو عبادت ورنہ جہنم کی آگ ہے۔
☆ محبت خدا سے ہو تو زندگی بن جاتی ہے۔
☆ محبت نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔
☆ محبت انسان کو پاگل کر دیتی ہے۔
☆ محبت اگر پاکیزہ ہو تو امر بن جاتی ہے۔
☆ محبت اگر گچی ہو تو مثال بن جاتی ہے۔

گا۔ جاوید نے جواب دیا۔

”جاوید میرا خیال ہے کہ ہمیں حماد کے ذریعے اس سارے معاملے کا پتا چل سکتا ہے لیکن وہ ہمیں کیوں بتانے لگا؟ پھر میں نے اسے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر قبل میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میری بات سن کر وہ خاصا فکر مند ہو گیا اور بولا۔ ”سمری تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے ابھی تم کہاں ہو؟“

”میں گھر واپس جا رہی ہوں اور تم میری فکر مت کرو میں نے اپنی سکیورٹی کا پورا پورا بندوبست کیا ہوا ہے؟“ میں نے کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے حماد پر ہاتھ ڈالا جائے پھر اس سے سارا کچھ اگلا لیں گے۔“ جاوید نے کہا۔

”وہ کس طرح؟“ میں نے تیزی سے سوال کیا۔

”اٹھا لیتے ہیں اس کو ویسے بھی وہ ذرا دبو قسم کا بندہ ہے بہت جلدی سارا کچھ اگل دے گا۔“ جاوید نے دھیمی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”جاوید.....!“ میں نے شدید حیرت سے اس کا نام لیا۔ ”کیا تم اس قسم کے کام بھی کرتے ہو۔“

”میں نہیں کرتا لیکن ایسے لوگوں سے اچھی دعا سلام ہے جو پیسے لے کر ایسے کام کر لیتے ہیں۔“

جاوید نے کہا۔

”نہیں۔“ میں نے سختی کے ساتھ کہا۔ ”تم یہ کام رہنے دو میں دیکھتی ہوں کہ اس سلسلے میں کیا کیا جاسکتا ہے یہ ایک بہت اہم معاملہ ہے اور میں نہیں چاہتی کہ اس سارے معاملے کی جھنجھکی کسی اور کو پڑے ویسے رمضان صاحب کس اسپتال میں ہیں۔ میں لگے ہاتھوں ان کی خیریت بھی پوچھ لوں۔“ میرا لہجہ خود بخود طنزیہ ہو گیا۔

جواب میں جاوید نے مجھے اس اسپتال کا نام بتایا تو میں نے آصف سے کہا کہ وہ گاڑی کا رخ اس اسپتال کی جانب موڑ لے۔ کل کرنل مشتاق انکل طلال کے گھر آنے والے تھے اور وہاں میں بھی ان سے ملاقات کرنے والی تھی اس لیے یہ چاہ رہی تھی کہ میرے پاس کرنل مشتاق کو بتانے کے لیے بہت کچھ ہو۔

میں نے فون بند کیا تو آصف نے بیک مرر میں گہری نگاہوں سے میرا جائزہ لیا اور گاڑی کا رخ اسپتال کی جانب موڑ لیا۔

اسپتال پہنچی تو رمضان صاحب کے روم کے باہر پولیس کا پہرہ تھا۔ انہوں نے مجھے اندر جانے سے روک دیا۔ میں نے کہا کہ میں ان کے چینل میں کام کرتی ہوں اور ان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے آئی ہوں لیکن انہوں نے صاف جواب دے دیا کہ ہمیں آؤ رٹ ملا ہے کہ رمضان صاحب سے سوائے ان کی فیملی کے کوئی دوسرا فرد نہیں مل سکتا۔

میری اس پولیس مین سے بحث جاری تھی کہ اندر روم سے رمضان صاحب کی بیٹی باہر آئی وہ مجھے اچھی طرح سے پہچانتی تھی میں تیزی سے اس کی جانب بڑھی اور رمضان صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے پولیس مین سے کہا کہ انہیں اندر آنے دو۔ بیٹی کی سفارش پر پولیس مین نے کندھے اچکائے اور

ناگواری سے بولا۔ ”بی بی آپ لوگ ہماری ڈیوٹی میں مداخلت کر رہی ہو۔“ میں نے اس کو انور کیا اور چھپاک سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

رمضان صاحب بیڈ پر آنکھیں بند کیے لیے تھے۔ ان کے سر اور ہاتھوں پر پٹیاں بندھی تھیں۔ چہرے پر سوچن تھی اور ٹانگوں پر بھی سوچن اور نیل کے نشان تھے۔ وہ تقریباً ساٹھ برس کے آدمی تھے اتنی مار نے ان کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔

”رمضان صاحب!“ میں نے ان کے بیڈ کے سر ہانے جا کر دھیمی آواز میں انہیں پکارا تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحوں تک تو وہ میری جانب خالی خالی نظروں سے دیکھتے رہے پھر دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ مجھ سے لگا ہیں جڑا رہے ہوں۔

”کیسی طبیعت ہے سر آپ کی؟ یہ اس عمر میں کس سے جھگڑ پڑے آپ؟“ میں نے اپنے لہجے میں ذرا سی خوش مزاجی پیدا کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں اور ایک پھپکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر آ کر دم توڑ گئی۔

”اسی لیے میں آپ سے کہا کرتی تھی کہ غصہ کم کیا کریں اب کسی کو ڈانٹ دیا ہوگا اور اسی نے اس صورت میں آپ سے انتقام لیا ہے شکر کریں زندہ چھوڑ دیا۔“

میں نے اپنی سابقہ عادت کے تحت ان سے اس قسم کی مزاح پر ہی کی جیسی مجھے کرنی چاہیے تھی۔

”بہت بول رہی ہو بول ڈاؤ آج تمہارا دن ہے۔“ انہوں نے نفاہت بھرے لہجے میں کہا۔

”سوری رمضان صاحب میں تو مذاق کر رہی تھی۔“ چلیے سیریس ہو جاتی ہوں بتائیے تو یہ سب کیا ہوا کیسے ہوا اور کس نے کیا؟

”مجھے نہیں پتا“ میں ان لوگوں کو قلعی نہیں جانتا۔“

رمضان صاحب نے دوسری جانب منہ پھیر کے جواب دیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے کم آپ انہیں نہیں جانتے لیکن اگر ان لوگوں نے آپ کو اغوا کیا تھا تو اس کا کوئی نہ کوئی سبب تو ہوگا“ کیا وہ کوئی بات آپ سے معلوم کرنا چاہتے تھے اور آپ کے نہ بتانے پر انہوں نے آپ پر تشدد کیا۔“ میں نے کہا جواب میں رمضان صاحب کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔

”تم تو جانتی ہو کہ میرا تعلق نیوز چینل سے ہے بہت سے سیاسی لیڈران اور دوسرے بیوروکریٹس کے بہت سے قیمتی راز ہمارے پاس ہوتے ہیں وہ لوگ مجھ سے ایک سیاسی شخصیت کے بارے میں بہت سے سوالات کر رہے تھے وہ کہہ رہے تھے کہ تمہارے پاس اس کے خلاف کرپشن کے جتنے بھی ثبوت ہیں وہ سب ہمیں دے دو میں نے انکار کیا کہ میرے پاس ایسے کوئی ثبوت نہیں ہیں تو انہوں نے مجھ پر تشدد شروع کر دیا اور جب میں ان کے بے پناہ تشدد کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تو انہوں نے مجھے ایک پارک میں پھینک دیا۔“ رمضان صاحب اتنی بات کر کے بری طرح ہانپنے لگے۔ میں نے ان کی خواہش پر انہیں پانی پلایا تو وہ پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔

”سر پھر تو آپ کو اس سیاسی لیڈر سے اپنا انعام وصول کرنا چاہیے۔ جن کی پردہ پوشی کرتے ہوئے آپ نے اپنا یہ حال کر لیا۔“ میں نے ہلکے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”طنز کر رہی ہو مجھ پر؟“ وہ میرے طنز کو محسوس کرتے ہوئے بولے۔

”تو بے شکجیسے میری بھلا اتنی جرأت میں تو مذاق کر رہی تھی ویسے وہ کس کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”ملک شہباز اعوان کے بارے میں پوچھ رہے

کاش کوئی ایسا ہو

میں جو کبھی کسی غم کے.....

گہرے صدیے سے

بہت اداس ہوتی ہوں جی چاہتا ہے!

رورو کر اشک بہادوں

سب غموں کو خود سے دور کر دوں

انہیں سکھنے پر مجبور کر دوں

تب سوچتی ہوں.....

کوئی ایسا ہو سچا سا پسنا ہو

بہتے ہوئے رنگوں سے

ستاروں کی کندوں سے

مہکتی ہوئی فضاؤں میں

کھل کر پلا ہو

کوئی ایسا ہو جس کے

بازوؤں پر سر رکھ کر

اپنے سارے غم بہادوں

اپنی حیات اس کے

دامن میں سما دوں

کاش کوئی ایسا ہو.....!

جو مجھے مجھ سے پُرا لے

میرے ہاتھ میں خوشی تھما دے

ہاں سوچتی ہوں کاش

کاش کوئی ایسا ہو!!!

(عائشہ سحر مر تضحی)

تھے۔“ رمضان صاحب نے کہا۔

”ویسے آپس کی بات ہے سر کیا واقعی ملک شہباز اعوان کے کرپشن کے ثبوت آپ کے پاس ہیں۔“ میں نے قدرے سستے گے جھکتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔

”ارے نہیں بھئی۔“ وہ حسب عادت بری طرح جھنجھلا گئے۔ ”میرے پاس کسی کے بھی کوئی ثبوت

نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو بتا کر اپنی جان چھڑا لیتا یہ درگت نہ بنواتا۔“

”ہاں واقعی!“ میں نے خاصے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”آپ کسی کے لیے کیوں اپنی جان ہلاکت میں ڈالتے آپ کو تو ہر حال میں صرف اور صرف اپنا مفاد ہی عزیز ہونا چاہیے..... ہے نا.....!“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ انہوں نے ناگوار لہجے میں کہا۔

”چلیں چھوڑیں اس بات کو، یسے مجھے ایک بات کا خیال آ رہا ہے کہ کہیں ان لوگوں کا تعلق ان لوگوں سے تو نہیں جنہوں نے حشام کو بھی نشانہ بنایا تھا۔ ویسے اللہ رحم کرے آج کل ساری صحافی برادری پر برے دن آئے ہوئے ہیں۔“

میں نے بظاہر بے پروا انداز میں یہ جملہ کہا لیکن میری پوری توجہ رضانی صاحبہ پر تھی۔ میرا جملہ سن کر لکھ بھر کو ان کی آنکھیں پھیل گئیں اور چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرا کر روپوش ہو گیا اور میرے اس ایک جملے نے سارا کام آسان کر دیا میں نے وہ سچ جان لیا جو رضانی صاحبہ مجھ سے چھپا رہے تھے۔

”تم نے بول بول کر میرے سر میں درد کر دیا ہے اب تم جاؤ اور ہاں ان تمام باتوں کا کسی اور کے سامنے ذکر مت کرنا جو میں نے تم سے کہی ہیں۔ حد یہ کہ میں نے پولیس تک کو یہ باتیں نہیں بتائی ہیں۔ اس لیے کہ پولیس والے بال کی کھال نکالتے ہیں اور پھر میرے لیے اور بھی مسائل پیدا ہو جاتے۔“

”آپ بے فکر ہیں سر..... آپ نے مجھ پر اعتماد کیا ہے میں ان ساری باتوں کو نہیں چھوڑے جارہی ہوں یوں سمجھیں ہمارے درمیان کوئی بات ہوئی ہی نہیں.....!“ پھر میں نے انہیں تسلی دی اور صحت یابی کی دعا کی اور وہاں سے چلی آئی۔

راستے میں مزید کوئی اور مسئلہ نہیں ہوا میں خیریت سے گھر پہنچ گئی۔ گھر کے باہر میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو مجھے کوئی غیر معمولی بات دکھائی نہیں دی جیسا کہ کرنل مشتاق نے کہا تھا کہ گھر کے باہر مزید سیکرٹ کا انتظام کر دیا ہے لیکن مجھے تو کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ میں گھر کے اندر داخل ہو گئی۔ اماں نے بڑی مزے دار مسالے والی بریانی بنائی ہوئی تھی۔ میں نے کھانا کھایا اور کھانے کے دوران حشام کو یاد کرتی رہی کیونکہ اتفاق سے ہم دونوں کو ہی مسالے والی چٹ پٹی بریانی بہت پسند تھی۔ اماں اور امی بھی اس حوالے سے حشام کو یاد کرتی رہیں اماں نے ہنستے ہوئے مجھ سے کہا۔

”ارے بیٹا، تم کو کہتے ہیں کہ تم ہم سے بریانی بنانا سیکھ لو اپنے حشام میاں کو پسند بھی تو بہت ہے جب ان کا دل چاہے گا بنا کر کھلا دینا۔“

”مجھے اس بھٹیڑے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے جب حشام کا دل چاہے گا ہم آپ کے پاس آ جائیں گے آپ بنا کر کھلا دیجیے گا۔“

”اے لو میں بوڑھی بھلا کب تک جیوں گی۔ تم سیکھو بلکہ میں تو کبھی ہوں اچھے اچھے کھانے بنانا سیکھو میاں کے دل میں اترنے کا راستا اس کے معدے سے ہو کر جاتا ہے۔“ اماں نے کہا تو میں نے ہنستے ہوئے اماں کے گلے میں بائیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”ارے واہ اماں ابھی سے مرنے کی باتیں شروع کر دیں ابھی تو میری شادی آپ کو کرنی ہے پھر میرے بچے کی کرنی ہے ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے..... نری جوان ہیں۔“

اٹھاتے ہوئے بولے۔

”تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے مولا۔ تو نے اس گھر میں دوبارہ سے میری بچی کی ہنسی کی آواز سنائی۔ اللہ سیری بچی کو بے پناہ خوشیاں عطا کرے۔“ بابا آبدیدہ ہو گئے تو امی تشکر آمیز نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

آج میں واقعی بہت خوش تھی۔ حشام سے بہت اچھی گفتگو رہی۔ تب ہی میرے سیل فون کی بیل بجی میں نے فون کی اسکرین پر نمبر دیکھا تو وہ طلحہ انکل کا تھا۔ میں فون ہاتھ میں لے کر اسے کمرے میں آ گئی تو انکل نے بتایا کہ کل دوپہر کو کرنل مشتاق آئیں گے۔ بلکہ صبح گیارہ سے بارہ بجے تک کا ٹائم اسپتال میں ملنے کا ہے تو میں اور تمہاری آنٹی گیارہ بجے اسپتال پہنچ جائیں گے اگر مناسب سمجھو تو تم بھی آ جاؤ پھر ہم ساتھ ہی گھر چلیں گے۔

”ٹھیک ہے انکل میں ان شاء اللہ کل گیارہ بجے اسپتال پہنچ جاؤں گی کل اتوار تھا اور اتوار کو اسپتال کے ٹائمنگ الگ ہوتے ہیں۔“

میرے پاس کرنے کو اور تو کوئی کام نہیں تھا میں گزری ہوئی باتوں کے بارے میں سوچنے لگی۔ حماد کے بارے میں میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس کے بارے میں کرنل مشتاق کو بتاؤں گی وہ خود اس سے سب اگلو الیں گے۔ وہ یقیناً یہ بات جانتا ہوگا کہ رضانی صاحبہ کے اغوا کار کون لوگ تھے اور حشام کے معاملے میں رضانی صاحبہ کا کیا کردار ہے۔

ان ہی باتوں کے بارے میں سوچتے سوچتے میں سو گئی۔ رات کا وہ نہ جانے کون سا پہر تھا جب میری آنکھ کھلی۔ ابھی میں پوری طرح جاگی بھی نہیں تھی نیند کے غمار میں ڈوبے ہوئے میں نے بائیں جانب کروش لی اچانک ہی فائر کی آوازیں سن کر میری آنکھیں

کھل گئیں اور پھر یکے بعد دیگرے فائر کی آوازیں آئیں باہر گلی میں بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں ابھریں پھر دوطرفہ فائرنگ کی زبردست آوازیں آنے لگیں۔ میں پوری طرح بے وار ہو کر بیٹھ گئی۔ سمجھ میں نہیں رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے چھت پر بھی بھاگنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ فائرنگ بہت نزدیک ہو رہی تھی۔ بلکہ شاید ہمارے گھر سے بھی ہو رہی تھی۔

اچانک ہی کسی نے کمرے کا دروازہ زور زور سے پیٹ ڈالا۔ ساتھ ہی امی کی گھبراہٹی ہوئی آواز بھی آئی وہ میرا نام لے کر پکار رہی تھیں۔

میں نے تیزی سے اٹھ کر دروازہ کھولا تو امی پریشان صورت لیے کھڑی تھیں۔ بابا اور اماں بھی لاؤنچ میں کھڑے تھے۔

”بیٹا یہ کیا ہو رہا ہے لگتا ہے ہمارے گھر پر فائرنگ ہو رہی ہے اور جواب میں آصف اور عثمانی بھی فائرنگ کر رہے ہیں۔ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔“ امی نے روہانے لہجے میں میرا بازو تھام کر کہا۔

”آپ گھبرا میں مت امی..... سب پتا چل جائے گا۔ دروازے وغیرہ تو سارے لاک ہیں نا۔“ میں نے امی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”دروازے تو سارے بند ہی ہیں لیکن یہ سب کیا ہو رہا ہے میرا دل بہت گھبرا رہا ہے بیٹا۔ اللہ تعالیٰ خیر کرے۔“ میں نے امی کے جسم پر لرزش محسوس کی تو انہیں اپنی ہانہوں میں سنبھال لیا۔

”میرا خیال ہے میں اوپر آصف سے جا کر پوچھتا ہوں۔“ بابا نے کہا۔

”نہیں بابا آپ اوپر مت جائیے آصف کو فی الحال ڈسٹرب مت کریں جو بھی ہوگا وہ خود بتا دیں گے۔“ میں نے بابا کو منع کیا۔

”بیٹا کیا تم جانتی ہو کہ یہ کون لوگ ہیں۔“ بابا نے

نہ جانے کیسے اندازہ لگالیا۔

”جی بابا یہ سارا سلسلہ حشام والے معاملے سے جڑا ہے۔“ میں نے کہا۔

”شک..... کیا مطلب بیٹا..... کیا اب وہ لوگ حشام کے بعد تمہارے پیچھے پڑ گئے ہیں یا اللہ میری بیٹی کی حفاظت کرنا۔“ امی نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

”امی آپ خواہو اتنی پریشان ہو رہی ہیں کچھ نہیں ہوگا کچھ لوگ یوں ہی نہیں ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دیکھیں اب فائرنگ کی آواز بھی رک گئی ہے۔“ میں نے ماحول میں خاموشی کو محسوس کر کے کہا۔

فائرنگ کا سلسلہ رک گیا تھا تب ہی آصف اوپر سے اتر آئے ہم سب کو لاؤنچ میں پریشان کھڑے دیکھا تو نزدیکی آ گئے۔

”آصف بیٹا یہ سب کیا تھا کون لوگ تھے اور کیا چاہتے تھے۔“ امی نے تیزی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں آئی نہ جانے کون لوگ تھے اور کیوں آئے تھے وہ گھر میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے تب عثمان نے فائر کر دیا پھر انہوں نے مسلسل فائرنگ کی تو ہمیں بھی فائرنگ کرنا پڑی۔ میرا خیال ہے ہماری جوابی فائرنگ سے ان کا ایک بندہ بھی زخمی ہوا ہے۔ جسے اٹھا کر وہ بزدل بھاگ نکلے ہیں۔ اب سب خیر ہے آپ لوگ سو جائیں۔ جب میں اور عثمان ہیں تو آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔“

آصف نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”لیکن بیٹا پھر بھی پتا بھی تو چلے۔“

ابھی امی کا جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ باہر سے پولیس کی موبائل کا سائرن سنائی دیا اور پھر باہر سے چند لوگوں کی آوازیں آنے لگیں۔

”فائرنگ کی آوازیں سن کر شاید مقامی پولیس

متوجہ ہو گئی ہے۔“ آصف نے کہا اور اس کے ساتھ ہی گھر کی بیل بجنے کے ساتھ ہی ہمارا گیٹ بھی زور سے پینا جانے لگا۔

”میں دیکھتا ہوں آپ لوگ اندر ہی رہیں لاؤنچ کا دروازہ بند کر لیں۔“ آصف نے کہا تو بابا بھی آصف کے ساتھ باہر چلے گئے۔

”آصف سنیں آپ پولیس سے کیا کہیں گے کہ کون لوگ تھے۔“ میں نے آصف کو جاتے دیکھا تو کہا۔

”بہت سہل بات کہہ دیں گے ڈاکو آئے تھے ہمارے گھر کے سیکیورٹی گارڈ نے فائرنگ کی تو وہ بھی فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئے۔ اس کے آگے ہم کچھ نہیں جانتے۔“ آصف نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

”ہاں یہی کہنا ٹھیک رہے گا۔ آپ جاییں اور عثمان کو بھی یہی بات بتائیے گا۔“ میں نے باہر جھانک کر دیکھا ابھی تک عثمان نے گیٹ نہیں کھولا تھا

آصف نے چند لمحے رک کر عثمان سے بات کی اور پھر گیٹ کھول دیا۔

عثمان اور آصف نے پولیس والوں کو مطمئن کر دیا وہ تھوڑی دیر تک ان لوگوں سے مختلف سوالات کرتے رہے پھر چلے گئے۔

میں نے اس بات کی اطلاع طلال انگل کو دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ میں جانتی تھی کہ آصف نے کرنل مشتاق کو ساری بات بتادی ہوگی۔

میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ اگر کرنل مشتاق کے یہ کمانڈر آج یہاں نہ ہوتے پتھر نہ جانے کیا ہوتا۔ آج دن میں بھی میرے اوپر حملہ ہوا اور یہ چند گھنٹوں کے بعد دوسری کارروائی ہے۔

بقیہ ساری رات ہماری جاگتے ہوئے گزری۔ صبح ہونے میں ویسے بھی زیادہ دیر نہیں تھی۔ امی بہت

زیادہ پریشان تھیں۔ وہ تو انہیں دن میں ہونے والی کارروائی کے بارے میں پتا نہیں تھا ورنہ تو ان کا نجانے کیا حال ہوتا۔

صبح کی نماز پڑھنے کے بعد میں ذرا دیر کے لیے سو گئی۔ صبح دس بجے مجھے اسپتال کے لیے بھی نکلنا تھا۔ حشام سے ملاقات کے بعد طلال انگل کے ساتھ ان کے گھر جانا تھا اور کرنل مشتاق سے ملاقات کرنی تھی۔ حشام سے ابھی تک اس سارے معاملے کے بارے میں کوئی بھی گفتگو کسی نے بھی نہیں کی تھی کیونکہ ڈاکٹر ذیشان کی ہدایت تھی کہ حشام کے سامنے کوئی بھی ایسی بات نہ کی جائے جس سے اس کے اعصاب پر برا اثر پڑے۔ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا

کہ تنہائی میں حشام اس بارے میں کچھ سوچتا ہے یا نہیں۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا ہوگا کہ میں اس سارے معاملے سے بالکل بے خبر ہوں۔

میں صبح نو بجے بے دار ہو گئی اور گرم پانی سے شاور لے کر لباس تبدیل کر کے باہر آ گئی۔ میں نے آصف کو کال کر کے بتادیا تھا کہ صبح دس بجے اسپتال جانا ہے۔

میں نے امی کو بہت پریشان صورت لیے بیٹھے دیکھا۔ ان کی آنکھیں متورم تھیں اور لب خشک تھے۔

”کیا ہے امی آپ کیوں اتنی پریشان ہیں۔ آپ سرمئی کی ماں ہیں اور بہادر بیٹی کی ماں کو بھی بہادر ہونا چاہیے۔“ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

”نہیں بیٹا میں بہادر نہیں ہو سکتی۔ میں اندر سے بہت کمزور ہوں۔ میری جان جس بیٹی کی جان بچانے کے لیے میں نے اپنی زندگی تنہا کر گزاری دی۔ اپنے آپ سے جدا کرنے کا اتنا کڑا فیصلہ کر لیا میں یوں اسے اب کھوئے نہیں دوں گی۔ یہ دنیا والے ہمارا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ ہمیں چین سے جینے کیوں نہیں دیتے۔ ہم کسی سے کچھ کہہ تو نہیں

رہے ہیں۔“ امی بے چارگی سے بات کرتے کرتے رو پڑیں تو میں نے امی کو سینے سے لگالیا اور کہا۔

”امی آپ کی بیٹی ایک مجاہدہ ہے۔ برے لوگوں اور برائی کے خلاف جہاد کر رہی ہے اور یہ کام اتنا آسان نہیں ہے امی لیکن اگر آپ کی ڈھیر ساری دعائیں ہمہ وقت میرا احاطہ کیے رہیں گے تو مجھے کبھی بھی کچھ نہیں ہوگا۔ آپ صرف اللہ پر بھروسہ کریں اور دعا کریں۔“

”میری تو ہر سانس تمہاری سلامتی کے لیے دعائیں کرتی ہیں۔“ میں نے امی کا دھیان بٹانے کے لیے کہا تو وہ چونک کر میری جانب دیکھنے لگیں۔

مجھے ان کی آنکھوں میں خوف اور اپنے لیے ڈھیروں فکر دکھائی دی۔

”اللہ پر بھروسہ رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہے امی ہمارا ایمان ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اللہ کی جانب سے ہوتا ہے اور اس کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں مل سکتا۔ تو جب آپ لوگوں کی دعائیں ہر دم میرے ساتھ ہیں تو کوئی کسے مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

میں نے ایک نرمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو امی کچن کی جانب جانے لگیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ امی کچن میں جائیں اماں ناشتے کی ٹرے اٹھاے ہوئے کچن سے باہر آ گئیں اور امی اور اماں ایک ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر آ گئیں۔ میں نے خود بھی ناشتا کیا اور زبردستی امی کو بھی کرایا۔

”میرا تو خیال ہے بیٹا کہ آج تم رہنے ہی دو۔“ امی نے پھر مجھے باہر جانے سے روکنا چاہا اور میں انہیں جواب دینے ہی والی تھی کہ میرے سیل فون پر طلال انگل کی کال آ گئی میں نے فون ریسو کیا اور کہا۔

”السلام علیکم انکل۔“

”وعلیکم السلام جیتی رہو تم اب تک وہیں ہو کیا؟“

انہوں نے پوچھا۔

”ہاں یہاں تو خیریت ہی ہے لیکن میں نے سنا ہے کہ رات تمہاری طرف حاضی گڑبڑ ہوئی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ آج تم متاؤ احتیاط اچھی چیز ہوئی ہے۔“

”کیا ہو گیا ہے انکل آپ کو؟ آپ بھی امی کی زبان بولنے لگے۔ کچھ نہیں ہوتا میں بس نکل رہی ہوں آپ کو تو معلوم ہے کہ حشام میرا انتظار کر رہا ہوگا اور اگر میں نہیں گئی تو وہ ہزاروں سوالات کرے گا۔“ میں نے کہا۔

”دو ٹھیک ہے بیٹا لیکن جس طرح کل دو مرتبہ تمہارے اوپر حملہ ہوا ہے اور تمہیں ہراساں کرنے کی کوشش کی گئی ہے میں اس وجہ سے تمہارے لیے فکر مند ہوں۔ بیٹا اب میرا اسٹیمنا جواب دے گیا ہے۔ ابھی تو حشام بھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا ہے۔ میں تمہارا معمولی سا بھی نقصان برداشت نہیں کر سکتا،“ انکل کے لہجے میں تشویش تھی۔

”انگل میں کب تک گھر میں قید رہوں گی۔ آج نہیں تو کل مجھے باہر نکلنا ہے انہیں جو کرنا ہے وہ کل کریں گے لیکن اس طرح چھپ کر بیٹھنے سے انہیں اس بات کا احساس ضرور ہوگا کہ میں ان کی ان ہزدلانہ کارروائیوں سے خوف زدہ ہوگئی ہوں۔ مقابلہ کرنا ہے تو سامنے میدان میں آ کر کریں تیا چل جائے گا کون کتنے پانی میں ہے۔“ میں بول رہی تھی اور امی آنکھیں میٹھاے مجھ دیکھ رہی تھیں جھٹ بولیں۔

”بھائی صاحب اسے آپ ہی سمجھائیے میری تو کوئی بات سن ہی نہیں رہی ہے۔“

انکل نے امی کا جملہ سن لیا اور بولے۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تم اپنی بہادر ہو اور ہر طرح کے حالات کو فیس کرنا جانتی ہو اور گھبراہٹی بھی نہیں ہو، لیکن اپنی امی کا خیال کرو۔ وہ بہت زیادہ بریشان لگ رہی ہیں۔“

”مائیں تو ایسی ہی ہوتی ہیں آنٹی کا حال نہیں دیکھتے آپ لیکن کم از کم آپ جذبات سے ہٹ کر ٹھنڈے دل و دماغ سے میری بات پر غور کریں تو آپ کو بھی اندازہ ہوگا کہ میری سوچ بالکل ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک سے بیٹا! میں تم سے اور حشام سے ہار گیا ہوں۔“ اس نے بھی اس رپورٹ کو تیار کرنے میں میرا کہنا نہیں مانا تھا اب تم بھی وہی کچھ کہہ رہی ہو جیسا وہ کہتا تھا چلو پھر آ جاؤ اپنا خیال رکھنا، انہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے بات ختم کی اور فون بند کر دیا۔ پھر میں نے اپنا بیگ اور موبائل اٹھایا امی کے گلے لگ کر ان کی پیشانی کو چوما اور یہ کہتی ہوئی باہر آ گئی کہ راستے میں آپ کو کال کرنی رہوں گی اور اسپتال پہنچ کر بھی کال کر دوں گی۔

آصف باہر الٹ کھڑے تھے مجھے دیکھ کر گاڑی میں بیٹھ گئے اور میرے پیٹھے ہی کا راشٹ کر دی۔ راستے میں آصف نے مجھ سے پوچھا کہ میں پریشان تو نہیں ہوں تو میں نے جواب دیا کہ کیا میں آپ کو پریشان دکھائی دے رہی ہوں میرا جواب سن کر اس کے لبوں پر اس کی مخصوص مسکراہٹ آگئی تھوڑا فاصلہ طے ہو جانے کے بعد میں نے امی کو کال کر کے بتایا کہ میں بالکل خیریت سے ہوں آپ فکر مت کریں۔ اچانک ہی چلتے چلتے روڈ پر ہمیں لوگوں کا رش دکھائی دیا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے سڑکوں پر ٹائز بھی جلائے ہوئے تھے اور روڈ پر بہت سے پتھر پڑے تھے ادھر سے ٹریفک بند تھا۔

”ارے یہاں کیا ہو گیا؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔
”کچھ نہیں یہ جو سامنے پینک کی عمارت دکھائی دے رہی ہے یہاں دو گھنٹے قبل ڈاکھس آئے تھے

بینک میں موجود گارڈز نے جب مزاحمت کی تو ڈاکوؤں نے فائرنگ کر دی۔ جس سے گارڈز کے ساتھ بینک میں موجود عام افراد جو اپنے کام کے سلسلے میں بینک آئے ہوئے تھے ہلاک ہو گئے۔ جبکہ بینک سے صرف سونے دوڑ پولیس موبائل کھڑی تھی اور ہمیشہ کی طرح پولیس والوں نے ڈاکوؤں کو روکنے یا ان کا تعاقب کرنے کی زحمت نہیں کی۔ ظاہر ہے اس سے لوگ مشتعل ہو گئے انہوں نے پولیس کی گاڑی پر پتھرؤ کیا اور انہیں بھگا دیا اور احتجاجاً روڈ پر ٹائر جلا کر روڈ کو ہلاک کر دیا۔

”مجھے لوگوں کے رویے پر شدید کسرت ہوئی ہے۔ یہ روڈ پر ٹائر جلا کے روڈ بلاک کر کے یہ کس قسم کا احتجاج کر رہے ہیں۔ دکانیں بند ہیں اس طرح سے تو عام لوگوں کو پریشانی ہو رہی ہے۔ نہ پولیس اور نہ ڈاکوؤں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ملک اور اس کے لوگ کہاں جا رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”جانی کی جانب۔“ آصف نے رخ کچھ میں کہا۔
 ”اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔“ میں نے کہا تو آصف
 نے گاڑی کو دوسرے روڈ پر لے لیا۔ پھر ہم لوگوں کے
 اس قسم کے رویوں کے متعلق باتیں کرے رہے۔
 بقیہ راستا خیریت سے کٹ گیا اور کوئی مسئلہ نہیں ہوا
 اسپتال پہنچی تو انکل اور کمرل مشتاق پہنچ چکے تھے
 حشام کے سامنے ہم نے اس سارے معاملے پر کوئی
 بھی گفتگو نہیں کی۔ البتہ انکل نے حشام کی نگاہ بچا کر
 مجھ سے اشارے سے پوچھا کہ راستے میں تو خیریت
 رہی میں نے بھی اشارے سے سب خیریت کا
 جواب دے دیا۔

آنٹی حشام کو اپنے ہاتھوں سے سوپ پلا رہی تھیں
مجھے دیکھا تو ہنس کر بولیں۔ ”لو بھئی مجھ سے تو یہ خرے

ہدایت اور اصلاح کا روشن چراغ

ملک منفرد دینی و اصلاحی رسالہ

ما قبله
السلام
كلمة

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

ممتاز مفکر و دانشور مشاق احمد قریشی کی زیر ادا رت

قیمت: 20 روپے

دینی مسائل کا حل: مولانا سعید احمد جلال پوری
روحانی مسائل: حافظ شبیر احمد

اسلام اخوت بھائی چارے اور تہذیب شناسکی کا مذہب ہے۔
اپنے دین کو جاننا اور سمجھنا ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔

اسلام ایک مکمل منابطہ حیات ہے، ہمیں اسے صحیح سمجھنے کی ضرورت ہے۔
اس پر عمل کر کے ہی ہم آخرت میں سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔

قارئین کی مشکلات کو مد نظر رکھتے ہوئے الاسلام میں کچھ ایسے سلسلے شروع کیے گئے ہیں جن سے عام لوگوں کو دینی مسائل سمجھنے میں آسانی ہو سکے گی۔

دنیاۓ اسلام کے تمام مسالک متعلق
علماء کرام کی نگارشات اور آراء پر مشتمل

اسب کے خلاف جاننا اور پڑھنا چاہتے ہیں

یتا: کمرہ نمبر 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

فون: 35260771/2 فیکس: 35260773

alislamkhi@gmail.com

کر رہا ہے تم پلاؤ شاید پی لے۔“ میں جھینپ کر آگے بڑھی تو انکل اور کرنل مشتاق ہنس پڑے۔

کرنل مشتاق ذرا دیر بیٹھنے کے بعد چلے گئے۔ البتہ ہم نے گھنٹا پورا کیا میں اس بات پر حیران ہو رہی تھی کہ کرنل مشتاق کو تو ہمارے ساتھ جانا تھا پھر وہ چلے کیوں گئے لیکن حشام کے سامنے میں نے کچھ بھی پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

لیکن جب ہم باہر آئے تو کرنل مشتاق ہمیں باہر مل گئے۔ پھر وہاں سے ہم تینوں اپنی اپنی گاڑیوں میں ساتھ ساتھ حشام کے گھر کی جانب چل دیے۔ راستا بخیریت گزرا اور ہم اطمینان سے گھر پہنچے تو آئی نے محبت پاش نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”اب تم پھر سے اپنے انکل کے ساتھ مصروف مت ہو جانا۔ ذرا دیر کو میرے پاس تو بیٹھو۔“

”میری پیاری مٹی میں ضرور آپ کے پاس بیٹھوں گی۔ ذرا انکل کے ساتھ مجھے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ آپ دیکھ رہی ہیں نا کہ کرنل مشتاق بھی آئے ہیں۔“ میں نے محبت سے آئی کے گلے میں بانٹیں ڈال کر کہا۔

”مجھے تمہارا یوں مٹی کہنا بہت اچھا لگا اب سے آئندہ تم مجھے مٹی ہی کہنا آئی مت کہنا آئی نے میرے رخسار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو میں نے ایک شرمیلیں مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلادیا اور ان سے الگ ہو کر ان سے اجازت مانگی۔

”اب میں جاؤں مٹی؟“

”بھئی تمہیں کرنل مشتاق کی موجودگی میں ایسی کون سی ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ آئی نے ہلکی سی خفگی بھرے لہجے میں کہا۔

”بات دراصل یہ ہے مٹی۔“ میں ان کے نزدیک

بیٹھ گئی اور گہری سنجیدگی سے کہا۔

”آپ تو یہ بات جانتی ہیں کہ حشام کے اوپر قاتلانہ حملہ ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔ وہ گولیاں اسے اتفاقاً یا حادثی طور پر نہیں لگی ہیں بلکہ اسے جان بوجھ کر اس جگہ بھیجا گیا ہے اور اس کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ اسپتال میں بھی اس کی جان لینے کی کوشش کی گئی ہے اس کے لیے ڈاکٹر فیشان کو ایک بہت بڑے اماؤنٹ کی پیش کش بھی کی گئی تھی لیکن وہ ایک بہت اچھے انسان ہیں اور وہ انکل کو ایک بے لاگ صحافی کی حیثیت سے بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے انکل کو فوراً آخر درکار دیا۔ حشام کی بہت زیادہ سیکورٹی کی ضرورت تھی۔ اس لیے انکل نے کرنل مشتاق سے رابطہ کیا انہوں نے حشام کی سیکورٹی کا بھی فوری بندوبست کیا۔ ساتھ ہی میرے گھر بھی سیکورٹی کے لیے اپنی انجمنی کے دو بہترین کمانڈوز کو بھیجا۔ آصف اور عثمان کوئی عام لڑکے نہیں ہیں وہ کمانڈوز ہیں۔ اب ہم مل کر ان لوگوں کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس سازش کے پیچھے کون لوگ ہیں۔“ میں نے بہت دھیمے لہجے میں انہیں آہستہ آہستہ سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہائے میرے اللہ۔“ آئی نے جھٹ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ”یا اللہ تو میرے بچے کو اپنی حفظ و امان میں رکھنا اور دشمنوں کی نگاہ سے ہر لمحے اسے بچائے رکھنا۔“ آئی نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”آمین ثم آمین۔“ میں نے صدق دل سے کہا پھر بولی۔

”آپ پریشان بالکل بھی نہ ہوں۔ اللہ سب خیر کرے گا۔ آپ صرف دعا کرتی رہیں۔“

”میری تو ہر سانس ہر لمحے اپنے بچے کے لیے اور تمہارے لیے خیر کی دعا کرتی ہے۔“ آئی نے فکرمند

لہجے میں کہا۔

”اب گھر جاؤں.....!“ میں نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو انہوں نے دھیرے سے بلایا۔ تو میں چائے کی ٹرے کچن سے لے کر اوپر چلی گئی چائے ملازمہ نے تیار کر لی تھی۔

اوپر طلال انکل کی اسٹڈی میں پہنچ کر میں نے دونوں کو چائے سرو کی تو کرنل مشتاق خوش ہو کر بولے۔

”بھئی سر مٹی بیٹی یہ کام تم نے زبردست کیا ہے۔“

”کون سا کام انکل؟“ میں نے پوچھا۔

”بھئی یہی چائے پلانے والا۔“ کرنل مشتاق نے خوش دلی سے ہنستے ہوئے کہا تو میں اور انکل طلال بھی ہنس پڑے۔

چائے کے دوران ہلکی پھلکی باتیں ہوتی رہیں کرنل مشتاق انکل سے کہہ رہے تھے کہ حشام کے صحت یاب ہوتے ہی وہ ٹائف مجھے دلہن بنا کر اپنے گھر لے آئیں یہ سن کر میرے چہرے پر حیا آلود سرخی چھا گئی اور میں نے شرما کر سر جھکا لیا۔

”بالکل ایسا ہی کریں گے ان شاء اللہ ابھی تو ہم باقاعدہ ان کی امی کے سامنے اپنی جھول پھیلا میں کے اور سر مٹی بیٹی کو اپنے حشام کے لیے مانگیں گے۔“ طلال انکل نے کہا۔

”انکل اب ہم کام کی باتیں کر لیں۔“ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”اوہ ہاں تم ایسا کرو کہ پہلے اسٹڈی روم کا دروازہ بند کر آؤ۔“ انکل نے کھلے دروازے کی جانب اشارہ کیا تو میں دروازہ بند کر کے دوبارہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ تب انکل نے کرنل مشتاق سے کہا۔

”ہاں بھئی کرنل اب بتاؤ کہ میں نے تمہیں جو تصویر پیش کی تھی تم اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“

”اس تصویر کو دیکھ کر میں تو حیران رہ گیا۔ یہ شخص

ظلم

یہ عمر تمہاری ایسی ہے جب آسمان سے تارے ٹوڑے کے لے آنا بھی سچ ممکن لگتا ہے شہر کا ہر آباد علاقہ اپنا آئین لگتا ہے یوں لگتا ہے جیسے ہر دن ہر اک منظر تم سے اجازت لے کر اپنی شکل معین کرتا ہے جو چاہو وہ ہو جاتا ہے جو سو چوہ ہو سکتا ہے لیکن اسے اس کچی عمر کی بارش میں مستانہ پھرتی چنچل لڑکی

یہ بادل جو آج تمہاری چھت پر کرک کر تم سے باتیں کرتا ہے اک سایہ ہے تم سے پہلے اور تمہارے بعد کے ہر اک موسم میں یہ ہر اک چھت پر ایسے ہی اور اسی طرح سے دھوکے بانٹا پھرتا ہے صبح ازل سے شام ابد تک ایک ہی پھیل اور ایک ہی منظر دیکھنے والی آنکھوں کو ہر بار دکھایا جاتا ہے اے سپنوں کی بچ پر سونے جانے والی لڑکی تیرے خواب جنیں لیکن اتنا دھیان میں رکھا جیوں کی اس خواب سرا کے

سارے منظر وقت کے قیدی ہوتے ہیں جو اپنی رو میں ان کو ساتھ لیے جاتا ہے اور ہمیز کیے جاتا ہے دیکھنے والی آنکھیں پیچھے رہ جاتی ہیں دیکھو۔ جیسے..... میری آنکھیں (محمد تقی صابر لنگاہ۔ لاہور موٹر پرائیڈ ناٹو)

نئے افق 111

aanchal.com.pk

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں



ملک کی مشہور معروف قلم کاروں کے سلسلے دار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے موزون ایک جدید گہرے دلچسپی و صرف ایک ہی رسالے میں ہے۔ ناول کی آسودگی کا باعث ہو سکتا ہے اور وہ صرف اور صرف آج ہی اپنی اپنی بک کرالیں۔

کراچی جھیل کا تھانہ سہارا کی پوری سیر اور حقیقت گندی نازینہ کی نازی کا لکھنا سلسلہ

ایک جھیل کا تھانہ سہارا کی پوری سیر اور حقیقت گندی نازینہ کی نازی کا لکھنا سلسلہ

ایک جھیل کا تھانہ سہارا کی پوری سیر اور حقیقت گندی نازینہ کی نازی کا لکھنا سلسلہ

ایک جھیل کا تھانہ سہارا کی پوری سیر اور حقیقت گندی نازینہ کی نازی کا لکھنا سلسلہ

35620771/2 فون: 35620771/2

بارے میں جتنا بھی جانتی تھی اتنا انہیں بتا دیا میں ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی۔ میں طلال انکل کی بات پر غور کر رہی تھی کہ انہوں نے یہ کیوں کہا کہ رمضان نے یہ سب ڈراما کیا ہے آخر انہیں یہ ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

”کس سوچ میں گم ہو بیٹی مجھے بس ایک دو دن دوں میں ساری معلومات کر کے تمہیں بتا دوں گا۔“ کرنل مشتاق نے کہا۔

”کچھ نہیں۔“ میں نے دھیرے سے سر جھٹکا پھر طلال انکل سے پوچھا۔

”انکل اب تو بتا دیں کہ حشام کس کے خلاف کون سی رپورٹ بنا رہا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”تو تم یہ بات جان کر ہی رہو گی۔“ طلال انکل نے کہا تو میں سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی تو انکل نے خاصے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”تم اور ہم سب اپنے ملک کے بہت زیادہ اہم اور بگڑتے ہوئے حالات کی وجہ سے بہت زیادہ فکر مند ہیں۔ ملک جل رہا ہے اور حکمران سب ٹھیک ہے کا غرہ لگا رہے ہیں۔ آج ہمارے ملک کے ہر ادارے کا بیڑہ غرق ہو چکا ہے۔ مہنگائی عروج پر ہے ایک عام آدمی اور سفید پوش کا عزت سے زندگی گزارنا مشکل ترین ہو گیا ہے۔ ملک میں آئے دن لسانی فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ اغوا، قتل، ڈکیتیاں، بم پلاسٹ، ہڑتالیں غرض کہ لوگوں کا جینا محال ہے۔ آج اگر کسی ایک صوبے کی زبان بولنے والا مار دیا جاتا ہے تو اس کے بدلے میں چار دوسری زبان بولنے والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ اس کے قاتل کی گرفتاری کے لیے جلاؤ کھیراؤ اور ہڑتالیں ہوتی ہیں۔ شیعہ مار دیا جاتا ہے تو سنی پر الزام لگتا ہے۔ غرض کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس ملک میں رہنے والے ایک اللہ ایک رسول

کہ تمہیں اپنے چیلنجر پر کسی پر شک ہے۔“

”میں تو بعد میں بتاؤں گی لیکن پہلے آپ بتائیں کہ آپ کو حشام نے کیا بتایا تھا کہ اس کی اس خفیہ رپورٹ بنانے کی خبر اس نے کس کو دی تھی۔“ میں نے پوچھا۔

”رمضانی صاحب کو۔“ انکل نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر میری جانب اس طرح دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں اب تم بتاؤ۔

”مجھے بھی رمضانی صاحب اور ایک لڑکا ہے حماد نامی ان دونوں پر شک ہے۔“ پھر میں نے دونوں پر اپنے شک کی وجہ بھی بیان کر دیں۔

”رمضانی صاحب کو تو سنا ہے کہ کچھ لوگوں نے اغوا کر لیا تھا۔ یہ کیا سلسلہ ہے۔“ کرنل مشتاق نے پوچھا۔

”جہ جانے کیوں مجھے اس بات کا یقین نہیں ہے کہ کسی نے اسے اغوا بھی کیا اور مار پیٹ کرنے کے بعد اتنی آسانی سے چھوڑ بھی دیا مجھے یہ سب اس کا ڈراما لگ رہا ہے۔“ طلال انکل نے کہا تو میں بھی سوچ میں پڑ گئی اچانک ہی کرنل مشتاق بولے۔

”یہ حماد کون ہے اور کہاں ملے گا۔۔۔۔۔؟“

”کیوں خیریت؟“ انکل طلال نے چونک کر پوچھا۔

”اگر سر می بیٹی کو اس پر شک ہے تو پھر کیوں نہ اسے چند دنوں کے لیے اپنا مہمان بنالیں، اچھی طرح میزبانی کریں گے اور پھر ساری معلومات لے کر چھوڑ دیں گے۔“ انہوں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”سوچ لیں انکل ایسا کرنا ٹھیک ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”فکر نہ کرو اس کے غائب ہونے کی کسی کو خبر نہیں ہوگی ہم سارا انتظام کر لیں گے۔“ کرنل مشتاق نے مطمئن لہجے میں کہا تو میں نے حماد کے

کسی زمانے میں ڈاکو ”پرویز جٹ طیارہ“ کے نام سے مشہور تھا بعد میں اس گروہ کے قلع قمع ہونے کے بعد یہ دوبارہ منظر پر آیا اور تمہیں یاد ہوگا کہ اس پر چار ڈمیوں کے قتل کا الزام تھا اور یہ مفروضہ ہو گیا تھا پولیس نے اس کو اشتہاری قرار دے دیا تھا لیکن یہ کسی کے ہاتھ نہیں لگا اور اب اس شخص کو اس لڑکے نے کیا نام تھا اس کا۔“ کرنل مشتاق نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”شہروز۔۔۔۔۔!“ میں نے جھٹ کہا۔

”ہاں شہروز“ شہروز نے اسے نواب سطوت کے پاس آ کر معذرت کرتے ہوئے دیکھا اور سنا ہے اور ان دونوں کے درمیان ہونے والی جو گفتگو آپ نے مجھے سنائی تھی اس سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ساری گفتگو حشام اور سر می کے بارے میں ہو رہی تھی۔“

کرنل مشتاق نے اپنی بات ختم کی اور خاموش ہو گئے۔

”انکل آپ نے ویڈیو میں موجود اس شخص کی تصویر جو فائر کر رہا ہے اور نواب سطوت کے پاس آنے والے اس ڈاکو کی تصویر کو ملایا ہے کیا یہ دونوں ایک ہی شخص ہیں یا الگ الگ ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ دونوں ایک ہی شخص ہیں اور اسی وجہ سے میں اتنے اعتماد سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ حشام پر فائرنگ نواب سطوت ہی کے کہنے پر کی گئی ہے۔“

انکل نے معنی خیز لہجے میں کہا اور طلال انکل چونک کر میری جانب دیکھنے لگے اور میرا دل شدت سے یہ چاہ رہا تھا کہ میں ابھی جا کر اپنے باپ نواب سطوت کا گریبان پکڑ لوں اور اس سے کہوں کہ تو انسان نہیں زہریلا ناگ ہے جو اپنے ہی بچوں کو کھا جاتا ہے۔

میرے چہرے کا رنگ متغیر دیکھا تو انکل طلال نے جھٹ بات کو سنبھالا اور بولے۔

”سر می تم اس روز مجھے یہ بات بتانے والی تھیں نا

اور ایک قرآن کو ماننے والے ایک دوسرے کے دشمن اس لیے ہو گئے ہیں کہ محض وہ پنجابی بولتا ہے یا سندھی اور پشتو بولتا ہے دوسری جانب صوبائی زبانیں بولنے والے اردو زبان بولنے والوں کے دشمن ہیں۔ شیعہ سنی کا جانی دشمن ہے تو سنی شیعہ کا۔

کل یہی ملک تھا اور اس میں رہنے والے بھی یہی لوگ تھے۔ ان میں محبت اور بھائی چارہ تھا۔ سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں بھی شریک ہوتے تھے لیکن آج ایسا کیوں ہو رہا ہے کون ہے ایسا جو اس ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہا ہے۔

جب یہ سوال اپنے آپ سے کیا تو جواب یہی آیا کہ ایک رسول کے ماننے والے ایسا ابھی نہیں کر سکتے کوئی ہے ابن ابلیس جو ایسا کر رہا ہے۔

عہد نبوی سے ہی یہودیوں عیسائیوں اور کفار کو آج تک یہ بات ہضم نہیں ہوئی کہ مسلمان اس دنیا کے نقشے پر ابھریں روز اول سے جو ہمارے ساتھ دشمنیاں نبھا رہے ہیں اور جیسا کہ سب ہی جانتے ہیں کہ پاکستان وہ واحد ملک ہے۔ جیسے بہت جدوجہد اور قربانیوں کے بعد انگریزوں اور کافروں سے اسلام کے نام پر حاصل کیا ہے وہ اپنی جلن اور حسد میں اس کو پھلتا پھولتا اور پھینتا ہوا کیسے دیکھ سکتے ہیں۔

بس پاکستان کو مٹانے کے لیے یہ یتیموں اسلام دشمن قوتیں اکٹھی ہو گئیں اور انہوں نے ہمارے اندر سے ہی میر جعفر کو تلاش کر لیا۔ اس بات سے مسلمانوں کی تاریخ بھری پڑی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے اندر موجود میر جعفر جیسی فطرت رکھنے والوں نے ہی نقصان پہنچایا ہے۔

آج جبکہ مہنگائی نے پاکستانیوں کے منہ سے روٹی چھین لی ہے تو ان دشمنیوں نے اس چیز کا فائدہ اٹھایا اور ایسے ہی کمزور ضمیر لوگوں کو اپنا آلہ کار بنالیا اور

ان لوگوں کے اوپر ان کے کسی بڑے کا ہاتھ ہے۔ پاکستان کو ختم کرنے کے لیے ہندوؤں کی بدنام زمانہ ”عظیم“ ”را“ اور یہودیوں کی ”عظیم“ ”موساد“ نے گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔

بہت عرصے سے میں اس سلسلے پر کام کر رہا تھا اور میرے ساتھ حشام میری مدد کر رہا تھا۔ ہم اپنے ملک میں موجود اس کالی سیاہ ترین بھیڑ کا سراغ لگانے میں کامیاب رہے۔ وہ ایک سیاستدان ہے جو پردے کے پیچھے ہے اس کا باز و ایک دوسرا شخص ہے جو ملک سے باہر ایک برنس مین کے طور پر رہتا ہے۔

حشام ان سارے لوگوں کے نام جاننے کے بعد ایک بہت مربوط اور مستحکم رپورٹ تیار کر کے اسے منظر عام پر لانا چاہتا تھا اور اس نے یہ بہت بھیانک غلطی کی کہ اپنے نیوز چینل کے ہیڈورڈ چیف مسٹر رضضانی پر اعتماد کرتے ہوئے اس رپورٹ کے بارے میں بتا دیا۔

ایسا لگتا ہے کہ تمہارے رضضانی صاحب نے یا تو ان میں سے کسی کو بلیک میل کر کے کچھ رقم ہتھیلے کی کوشش کی ہوگی یا پھر ان کا تعلق بھی ان ہی لوگوں سے ہے لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر رضضانی صاحب کا تعلق ان لوگوں سے ہوتا تو ہم سے یہ بات چھپی نہ رہتی۔ اس لیے یہی سمجھ میں آ رہا ہے کہ رضضانی صاحب نے زرد صحافت اپناتے ہوئے کسی کو بلیک میل کیا ہے اور رہی بات حماد کی تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حماد ان کے ساتھ اس طرح کے کام پہلے بھی کرتا رہا ہو۔“

انکل بول رہے تھے اور میں سکتے کی کیفیت میں یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ رضضانی صاحب اندر سے اتنے گھٹیا آدمی نکلیں گے میں یہ بات مر کر بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ میں نے اسی لمحے اپنے دل میں عید کیا کہ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر میں رضضانی صاحب کو بھی

نہیں چھوڑوں گی انہوں نے صحافت جیسے معزز پیشے کے ماتھے پر کال ل دی ہے اور میں انہیں لوگوں کے سامنے اسے ہی چینل پر بے نقاب کر کے اس کا لک کو دھونے کی کوشش کروں گی۔

”انکل آپ کا کیا خیال ہے کیا نواب سطوت بھی ملک کو بیچنے والوں میں شامل ہے۔“ میں نے نفرت انگیز لہجے میں پوچھا۔

”نہیں میرا خیال ہے وہ ان لوگوں میں شامل نہیں ہے اس کے ذریعے حشام کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔“ انکل نے جواب دیا۔

”انکل آپ نے اس سیاست دان کا نام نہیں بتایا۔“ میں نے پوچھا۔

”سردار شیر افضل۔“ انکل نے سرسراہٹ ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”یہ صوبائی اسمبلی کا ممبر ہے اور اس کے ”را“ اور ”موساد“ والوں سے تعلقات ہیں اور اس کے پورے پورے ثبوت ہمارے پاس موجود ہیں۔“

میں ایک بات اور سوچ رہی تھی اس لیے انکل سے کہا۔

”انکل حشام کی وہ رپورٹ تو اس کے لیپ ٹاپ میں تھی اور اس کے لیپ ٹاپ کو تباہ کر دیا گیا ہے تو کیا حشام کی ساری محنت اکارت ہو گئی؟“

”ایسا بھی نہیں ہے۔“ انکل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ رپورٹ میرے پاس یو ایس بی میں محفوظ ہے اور یو ایس بی میرے لاکر میں ہے۔“

انکل کا جواب سن کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ کرنل مشتاق اتنی دیر سے بالکل خاموشی رہ کر میری اور انکل کی گفتگو سن رہے تھے کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

”اچھا ابھی طلال مجھے اجازت دو مجھے ایک بہت ضروری ملاقات کرنی ہے۔ ورنہ میں مزید کچھ دیر تم

لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہوں یہ وعدہ ہے کہ ایک دو دن میں تمہیں ایک مکمل رپورٹ پیش کر دوں گا۔“

”حماد کے ذریعے۔“ میں نے استفسار یہ انداز میں کہا تو کرنل مشتاق ”یو ڈیٹ اینڈ وائچ“ کہہ کر آگے بڑھنے لگے تو میں اور انکل بھی ان کے ساتھ نیچے اتر آئے۔

میں آنٹی کے پاس آئی تو انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔ ”پتا چلا کہ وہ بد بخت بد ذات کون ہے۔“

آنٹی کے اس طرح سوال کرنے پر انکل نے چونک کر میری جانب دیکھا تو میں نے اپنی نگاہیں چرا لیں اور دانستہ یہ ظاہر کیا جیسے میں ان کی نگاہوں میں پھلتے ہوئے اس سوال کو کہ کیا تم نے ماما کو تمام باتوں سے آگاہ کر دیا ہے محسوس ہی نہیں کیا ہے۔

”ابھی نہیں ماما ابھی تو ساری فقیئت جاری ہے یہ بھی جلد ہی پتا چل جائے گا ان شاء اللہ۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔

”ان شاء اللہ۔“ آنٹی نے صدق دل سے کہا پھر بولیں۔ ”تم کتنی اچھی ہو کہ تم نے مجھے تمام باتوں سے آگاہ کیا ورنہ تمہارے انکل تو مجھے کچھ بھی بتانے والے نہیں تھے۔“ انہوں نے انکل کی جانب شکوہ کنناں لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں بھی تو سنوں کہ کیا بتایا ہے آپ کی لاڈلی بیٹی نے۔“ انکل بیٹھتے ہوئے بولے۔

”اب چھوڑیں اس بات کو جب آپ نے مجھے کسی قابل ہی نہیں سمجھا آپ نے تو مجھے ہمیشہ کم عقل ہی سمجھا۔“ آنٹی کی کھٹکی بدستور جاری تھی۔

”بات کم عقل سمجھنے کی نہیں ہے ماما۔۔۔۔۔!“ انکل اپنی جگہ سے اٹھ کر آنٹی کے پاس آن بیٹھے اور بہت رسان بھرے لہجے میں انہیں سمجھاتے ہوئے بولے۔

”میں صرف اس قسم کی باتوں کو تم سے شیر نہیں

رقیب

جناب ایڈیٹر عمران احمد

تسلیمات!

یہ حقیقت ہے کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود انسان اپنی فطری کمزوریوں کے باعث چمک کے پیچھے بھاگتا ہے اور ٹھوکر کھاتا ہے۔ یہ کہانی بھی ایک ایسے نوجوان کی ہے جس نے ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو کر اپنی زندگی میں تلخیاں بھری تھیں۔ اس میں ہماری آج کی نسل کے لیے خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی ایک سبق ہے۔

امید ہے یہ کہانی آپ کے اور قارئین کے معیار پر ضرور پوری اترے گی۔

والسلام

ریحانہ سعیدہ

لاہور

”آئی سیر کہاں ہے آج کل نظر ہی نہیں آتا۔“ شادی وادی تو نہیں کر لی۔ کیونکہ ہم کنواروں کا ٹولہ تو اسی طرح وقت گزار رہا ہے۔ ”

”پہلے بیٹھ تو جاؤ پھر پچھر دینا۔“ سیر نے علی کے لیے جگہ بنائی۔ پھر بولا۔

”جواب کے بعد ٹائم ہی نہیں ملتا۔“

”یار جاب تو ہم سب کر رہے ہیں اور ایک مہینہ پہلے تک تو تمہارا بھی وہی شیڈول تھا جاب بدل لی ہے کیا اور ٹائم لگا رہے ہو؟“

”نہیں یار جاب تو وہی ہے۔۔۔۔۔!“

”تو پھر آئی سیر کہہ رہی ہیں یہ کمپیوٹر ہی تمہیں ہم سب سے دور کر رہا ہے۔ یاد کرو ہم سب کا وعدہ تھا کہ شادی سے پہلے روز ایک گھنٹہ مال روڈ پر جمع ہو کر انجوائے کریں گے۔ اب تم نہیں ہوتے سب تمہیں مس کرتے ہیں۔ فیس بک کو ایک گھنٹہ سے زیادہ استعمال نہ کیا کرو۔“

”دراصل چیٹنگ کرتے وقت کا پتا ہی نہیں چلتا۔“ سیر نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

”گلتا ہے جناب لڑکیوں سے چیٹنگ کر رہے ہیں آج کل۔۔۔۔۔!“

غائب ہو۔ سب کہہ رہے تھے کہ پتا کرو سیر نے

”جی۔۔۔۔۔ جی انکل۔۔۔۔۔ سب خیریت تو ہے۔۔۔۔۔!“

”خیریت ہی تو نہیں ہے بیٹی۔“ انکل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ابھی ابھی میرے پاس اطلاع آئی ہے کہ اسپتال میں حشام پر حملہ ہوا ہے۔۔۔۔۔!“

کہ حشام رات میں پتا نہیں سوتا بھی تھا یا نہیں۔ مجھے بار بار کال کرتا تھا میں نیند میں جھنجھلا جاتی تو خمار آلود لہجے میں کہتا۔

”کیا کروں جانم جب تمہاری مددھڑ آواز سے ڈرا دیر ہو جاتی ہے تو میری سانسیں رک گئی ہیں۔“

اور اس کی یہ بات سن کر میرا دل کہتا ”تو پھر جلدی سے مجھے اپنے پاس بلا کیوں نہیں لیتے۔“ لیکن میں یہ بات اس سے بھی کہہ نہ سکی۔ وہ جتنا کھل کر صاف صاف لفظوں میں اپنی محبت کا اظہار کرتا میں اتنا ہی اپنا حال دل اس سے چھپاتی اور جب میں نے اپنا یہ راز اس پر آشکار کیا کہ میں تو نجائے کب سے اس کی محبت میں پور پور ڈوبی ہوئی ہوں تو چند دن بھی ہم نے پیار بھرے نہیں گزارے اور یہ سب ہو گیا۔

میں بہت گہری نیند میں تھی تب میرے موبائل کی بیل نے شدید شور مچا کر مجھے بے دار کر دیا میرا دل ایک بارگی دھڑک اٹھا۔ اس وقت مجھے کس نے فون کر دیا چیٹل سے بھی فون نہیں آ سکتا کیونکہ میں چیٹیوں پر ہوں۔ میں نے جلدی سے سائیڈ ٹیبل پر رکھے موبائل کی جانب ہاتھ بڑھایا اور اس کی روشن اسکرین پر نگاہ ڈالی۔ طلال انکل کا نمبر روشن تھا میں نے تیزی کے ساتھ آنسٹر کا بٹن پیش کیا اور کپکپائے ہوئے لہجے کہا۔

”جی۔۔۔۔۔ جی انکل۔۔۔۔۔ سب خیریت تو ہے۔۔۔۔۔!“

”خیریت ہی تو نہیں ہے بیٹی۔“ انکل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ابھی ابھی میرے پاس اطلاع آئی ہے کہ اسپتال میں حشام پر حملہ ہوا ہے۔۔۔۔۔!“

”جی۔۔۔۔۔ جی انکل۔۔۔۔۔ سب خیریت تو ہے۔۔۔۔۔!“

”خیریت ہی تو نہیں ہے بیٹی۔“ انکل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ابھی ابھی میرے پاس اطلاع آئی ہے کہ اسپتال میں حشام پر حملہ ہوا ہے۔۔۔۔۔!“

”جی۔۔۔۔۔ جی انکل۔۔۔۔۔ سب خیریت تو ہے۔۔۔۔۔!“

”خیریت ہی تو نہیں ہے بیٹی۔“ انکل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ابھی ابھی میرے پاس اطلاع آئی ہے کہ اسپتال میں حشام پر حملہ ہوا ہے۔۔۔۔۔!“

”جی۔۔۔۔۔ جی انکل۔۔۔۔۔ سب خیریت تو ہے۔۔۔۔۔!“

”خیریت ہی تو نہیں ہے بیٹی۔“ انکل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”لو کیوں سے نہیں صرف ایک لڑکی سے۔“ سمیر نے آنکھیں بند کر کے جذب کے عالم میں کہا۔
”من موہنی سی پیاری لڑکی.....!“

”میاں بچنوں تم کہاں ملے اس سے.....؟“
”ملا تھوڑی ہوں یار فیس بک پر فرینڈ شپ ہوئی ہے اور اس نے اپنی تصویریں بھی سینڈ کی ہیں۔“

”یار آج کل فیس بک پر ایک لڑکا دس لڑکیوں سے اور ایک لڑکی دس لڑکوں سے فرینڈ شپ کرتی ہے۔ سیریس کوئی نہیں ہوتا۔ سب ٹائم پاس کرتے ہیں۔ اس لیے تم بھی اسے سیریس مت لو۔“

”علی تم ہر کسی کو ایک ہی لالچی سے نہیں ہانک سکتے۔ ایک مہینے سے ہم ایک دوسرے میں انوا لو ہیں اور ہم میں اتنی انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی ہے کہ کچھڑنے کا سوچ لیں تو جینا محال لگتا ہے۔ اس کے والدین راضی ہیں اور مجھے بس اماں کو راضی کرنا ہے۔ یار تم میری مدد کرو گنا۔“

”کیوں آنٹی کا کہیں اور ارادہ ہے۔“
”پتا نہیں لیکن وہ لڑکی کراچی کی ہے اور ہم لاہور کے ہو سکتا ہے اماں دور کی وجہ سے نہ مانیں۔ اس لیے تم نے میری بھرپور مدد کرنی ہے۔“

”ہم تو یاروں کے یار ہیں تو خوش تو میں بھی خوش۔“ علی نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

●.....☆.....●
”بیٹا سمیر مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے ادھر میرے پاس بیٹھو آ کر۔“ امتیاز بیگم نے اسے اپنے کمرے میں جاتے دیکھ کر کہا۔

”جی اماں۔“ سمیر نے ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا تم اور سنیہ میری اکلوتی اولاد ہی ہو۔ اب سنیہ یونیورسٹی جاتی ہے واپسی بھی دیر سے ہوتی ہے۔

تم بھی آفس چلے جاتے ہو۔ میں بورھی جان گھر میں اکیلی رہ جاتی ہوں۔ خاموشی اور گھر کی تنہائی سے میرا دم گھٹتا ہے۔ تمہاری جاب بھی ماشاء اللہ ٹھیک ہے اس لیے تمہارے ابو اور میں چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی کر دیں۔ ویسے بھی سنیہ کی تعلیم مکمل ہوتی ہی اس کی بھی شادی کا ارادہ ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ بہو کے آنے سے گھر میں رونق ہو جائے گی۔ ہم نے تمہارے ابو کے دوست کی بیٹی پسند کی ہے اس نے ابھی ایم اے کیا ہے میں چاہتی ہوں تم ہمارے ساتھ چل کر ایک نظر اسے دیکھ لو تو ہم جلد ہی شادی کر دیں کیونکہ انہیں بھی شادی کی جلدی ہے۔“ امتیاز بیگم نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن امی مجھے اس لڑکی کو نہیں دیکھنا۔“
”کیوں بیٹا.....!“ امتیاز بیگم کو بیٹے کا جواب سن کر حیرت ہوئی۔

”سوری امی زندگی میں نے گزاری ہے اس لیے لڑکی بھی میری پسند کی ہوئی چاہیے اور مجھے فرما پسند ہے۔“
”ٹھیک ہے بیٹا ہمیں کوئی اعتراض نہیں تمہاری پسند پڑو لڑکی رتنی کہاں ہے حسب نسب کیا ہے تم کیسے جانتے ہو اسے.....؟“ امتیاز بیگم نے محل سے پوچھا۔
”وہ امی میری میٹ پر اس سے دوستی ہوئی تھی اور وہ کراچی میں رہتی ہے۔“ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”پر بیٹا نہ اس کے خاندان کا اتنا پتا نہ ان لوگوں کا کہ کیسے لوگ ہیں اور سب سے بڑی بات کہ لڑکے لڑکیاں خود اپنی شادی کے فیصلے کر رہے ہیں۔ اس لیے میں میٹ پر دوستی کے خلاف ہوں۔“

”پلیز اماں آپ میری اچھی ماں ہیں نا زندگی میں نے گزاری ہے میری اس سے اتنی اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے وہ بہت اچھی اور خوش مزاج

ہے آپ اس کے ساتھ رہ کر اپنی تنہائی بھول جائیں گی۔“ سمیر نے ماں کو قائل کرنا چاہا۔

”تم میرے ایک ہی بیٹے ہو اور تم خود رکھ رکھاؤ والے بچے ہو۔ ہمارا گھر مہمان نوازی کے لیے مشہور ہے اس لیے مجھے بہو بھی سلیقہ شعار اور سلجھی طبیعت کی لانی سے اس لیے تمہارے ابو کے دوست کی بیٹی مجھے پسند آئی تھی۔ شہرہ ماشاء اللہ شکل و صورت سے تو خوب صورت ہے ہی کھانے پکانے میں بھی ثانی نہیں رکھتی۔ تم اس سے ایک بار مل لو۔“

”پلیز اماں میں نے اس لڑکی سے شادی کا وعدہ کیا ہے اور میں اس کا دل نہیں دکھانا چاہتا۔“
”اچھا تو اس لڑکی کے لیے ماں کا دل دھکی کر دو گے۔“

”اماں پلیز میں ایسا بھی نہیں چاہتا وہ آپ کی خدمت کرے گی آپ مجھ پر بھروسہ تو رکھیں۔ دیکھیے گا سارا خاندان آپ کی بہو کی تعریف کرے گا اور سارے خاندان میں اس کی سلیقہ مندی کے چرچے ہوں گے۔“

●.....☆.....●
”علی بیٹا! تم ہی سمیر کو سمجھاؤ فیس بک سے خود ہی کوئی لڑکی ڈھونڈ لی ہے اور اب اتنا اتنا ولا اور پاگل ہو رہا ہے کہ بس بارات لے کر چلیں۔ نہ خاندان کا نہ حسب نسب کا پتا بلا ہی بالا رشتے طے کرتی پھر رہی ہے آج کل کی نسل۔ اب تم ہی بتاؤ ایک دو بار تو کسی کے گھر رشتے کے لیے جانا ہی پڑتا ہے نا۔ دیکھ رکھ کر کرنی پڑتی ہے۔“ امتیاز بیگم نے علی کے سامنے اپنا دکھڑا رویا۔

”آنٹی میں نے بھی اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی ہے پر اس پر تو عشق کا بھوت سوار ہے۔ ورنہ مجھے بھی شادی کا یہ طریقہ پسند نہیں۔ امی بچی میری شادی کرنا چاہتی ہیں انہوں نے بھی مجھ سے میری پسند پوچھی تھی پر میں نے ان پر ہی یہ فیصلہ چھوڑ دیا ہے۔ آنٹی نے جو لڑکی تمہارے لیے دیکھی تھی

دیا اب خود ہی لڑکیاں ڈھونڈ رہی ہیں۔“
”سعادت مند اولاد لایا ہی ہوئی ہے۔ سمیر بھی اتنا ہی سعادت مند تھا ایک مہینے میں ایسا بگڑا ہے کہ.....!“
”چھوڑو آنٹی زندگی اسی نے گزاری ہے خود بھگتے گا۔“ علی نے امتیاز بیگم کو پریشانی سے بچانے کے لیے کہا۔

”بیٹا میں نے تو خود تمہارے انکل کے دوست کی بیٹی کو پسند کر لیا تھا۔ شہزہ اتنی پڑھی لکھی خوب صورت سلیقہ مند اور سلجھی ہوئی ہے کہ..... ارے تم ایسا کرو کہ اپنی امی سے میری بات کراؤ میں انہیں وہ لڑکی دکھا دیتی ہوں۔“
”چلیں آنٹی آپ امی سے بات کریں میں سمیر سے مل لوں۔“ علی یہ کہتا ہوا سمیر کے کمرے کی جانب چل دیا۔

”او پار تم نے آنٹی کو پریشان کیا ہوا ہے اور خود یہاں لیٹی سے چیٹ کر رہے ہو چلو مجھے بھی بھابھی کی تصویر دکھاؤ۔“
”میں اسی سے بات کر رہا ہوں یہ لو دیکھو فردا کی تصویر۔“
”ارے بھابھی تو بالکل ماڈل لگ رہی ہیں۔ مصنوعی اتنے میک اپ کے ساتھ۔“
”بھئی لڑکیاں تو ایسی ہی اچھی لگتی ہیں۔“
”تمہاری سوچ گلیمرس ہے ورنہ میرا آئیڈیل تو معصوم اور سادہ سی لڑکی ہے۔“
”لڑکیاں تو مجھے بھی ایسی ہی پسند ہیں لیکن فردا کو میک اپ کا شوق ہے۔ پھر ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔ یار تو امی سے میری سفارش کرنا۔“ سمیر نے علی نے منت کرتے ہوئے کہا۔
”آنٹی نے ابھی ابھی تمہارا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ آنٹی نے جو لڑکی تمہارے لیے دیکھی تھی

اس پر میں نے اپنی رضا مندی دے دی اور تیرے لیے یہ فیئر بندہ قربانی کا بکرا بن گیا ہے۔ تمہاری راہ کے کانٹے صاف کیے ہیں۔ اب بھابھی سے چیٹ کرنا بند کرو اور مجھے آکس کریم کھلاؤ۔“ علی نے خوش گوار موڈ میں کہا۔

”یہ تو واقعی تم نے مجھ پر احسان کیا ہے کہ اس لڑکی کے لیے ہاں کر دی ورنہ تو امی کو اپنے لاڈ سے زیادہ وہ لڑکی پیاری ہوگئی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے اس کی تعریف۔“

☆.....☆.....☆

کچھ ہی دنوں میں دونوں دوستوں کی شادیاں ہو گئیں۔

”سمیر اب تم بہو کو کہو کہ ویسے تو ہمارے پاس نہیں بیٹھتی کم از کم کھانے کے وقت ہی اپنے کمرے سے نکل آ کرے کیونکہ تم جانتے ہو کہ کھانا کٹھنہ کھانے کی ریت ہمارے گھر شروع سے ہے ہم کتنی کے چند لوگ ہیں۔ وہ بھی اپنے اپنے کمروں کے کلمین ہو جائیں تو گھر گھر نہیں رہتا۔ میرا گھر تو بہولا کر بھی سونا رہا۔“

”امی میں اس سے کہتا ہوں آپ ٹینشن نہ لیں۔“

”فروا تم امی کے پاس بیٹھا کرو اور گھر کے کاموں میں بھی ان کی مدد شروع کر دو۔“

”ابھی ہماری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو تم اپنی ماں کے کہنے میں آ کر اپنی محبت سے دستبردار ہو رہے ہو۔ بوڑھوں کے پاس بیٹھنے سے مجھے الجھن ہوتی ہے اور سمیر میں اپنے امی ابو کے پاس بیٹھتی تو تمہیں چیٹ کیسے کرتی۔“ فروا نے منہ نہاتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

”امی بھابھی اتنی خوب صورت تو نہیں جتنی تصویروں میں نظر آتی تھی۔ رنگ بھی ڈارک ہے اور دلی پتلی تو نہیں بلکہ سوکھی سڑی ہیں۔“

”بری بات سنیہ صورت سے زیادہ سیرت پر نظر رکھتے ہیں صورت تو اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔ سیرت انسان کی شخصیت اور سوچ کو ظاہر کرتی ہے۔“ علی بھی ہے میرے بیٹے کی پسند ہے۔“

”امی شمرہ آپ کی کتنی خوب صورت اور خوب سیرت ہیں۔ بھائی نے چٹائیں کیوں آپ کی بات نہیں مانی۔“

سمیر نے امی اور سنیہ کی باتیں سنی تو کھڑے کھڑے فردا کی سوچ سے موازنہ کرنے لگا۔

”یا اللہ یہ میں نے کیا کر دیا فردا واقعی ویسی نہیں جیسی نظر آتی ہے۔ نہ شکل میں نہ سوچ میں اور میری امی کتنی اچھی سوچ کی مالک ہیں کہ انہوں نے میری نافرمانی کو بھی معاف کر دیا اور میری پسند جان کر ہی اس میں کوئی نقص نہیں نکالتی۔ یا اللہ فردا کو ہدایت دے کہ میری امی کی محبتوں کی قدر کر سکے۔“

☆.....☆.....☆

”بیٹا تم اور فردا ایک دفعہ علی کی طرف چکر لگا آؤ وہ دو دفعہ آیا تھا تو تم دونوں گھر پر نہیں تھے۔ آج اتوار ہے وہ لوگ بھی گھر پر ہوں گے تم دونوں بھی چلے جاؤ علی کی امی بھی تمہیں یاد کر رہی ہیں۔“

”اچھا امی۔۔۔۔۔!“

”فروا تیار ہو جاؤ آج علی کی طرف جانا ہے۔“

سمیر نے میک اپ کرتی فردا کو کہا۔

”آپ آدھا گھنٹہ رکیں میں تیار ہو جاؤں ابھی تم نے اور تیار ہونا ہے۔“ سمیر نے فروا کے اچھے خاصے میک اپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ بھی نا سمیر بس آدھا گھنٹہ ہی لوں گی۔“

فروا نے لاڈ سے کہا۔

پھر ایک گھنٹہ بعد سمیر اور فردا علی کی طرف گئے۔

”کیسی ہیں آنٹی آپ اور علی کہاں ہے۔“

”میں ٹھیک ہوں آؤ اندر آؤ۔“ سمیر آنٹی کے

ساتھ چلتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ صاف ستھرا گھر اور کچن سے آتی اشتہا آمیز خوشبوئیں سمیر نے ایک نظر میں کمرے کا جائزہ لیا۔ انکل اور علی کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے ایک مضموم خوب صورت ہلکی لپ لگائے لڑکی۔

”امی علی۔۔۔۔۔!“

”شمرہ یہ سمیر ہے میرا دوست امتیاز انکل کا بیٹا اور یہ اس کی وائف فردا۔“

”السلام علیکم!“ شمرہ نے مدھر آواز میں سلام کیا۔

”آپ بیٹھیں پلیز۔“ شمرہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں ابھی آتی ہوں آپ انکل آنٹی کے ساتھ گپ شپ لگائیں۔“

”فروا بیٹی تم کیسی ہو اور سمیر تم تو بالکل ہی رستا بھول گئے ہمارے گھر کا۔ ہم نے دوبار چکر لگایا تو تم لوگ پر نہیں تھے۔ پھر مجھے بھی موقع نہیں مل سکا کہ ان کو دیکھنے کا۔ کیونکہ ہمارے گھر بھی مہمان ابھی تک رہن کو دیکھنے آ رہے ہیں۔ بلکہ یہ تو ابھی تک گھومنے پھرنے بھی نہیں جاسکی اور اسے کچن بھی سنبھال پڑ گیا۔“

”بس آنٹی لوگ تو ایسے ہی تنگ کرنے آ جاتے ہیں نئی نئی شادی ہو تو میاں بیوی کے اپنے بھی پلانز ہوتے ہیں۔“ فروا نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔

”نہیں بیٹا لوگ بھی خوشی میں شامل ہونے کے لیے آتے ہیں۔“ شمرہ مڑالی دھکیلتے ہوئے اندر آئی۔

”چڑھیں سر دکر کے بعد وہ علی کی امی کے پاس بیٹھ گئی۔

”کباب تو بہت مزے کے ہیں اور چاٹ بھی۔“

آپ نے کس دکان سے چیزیں منگوائی ہیں۔ میں اور

سمیر بھی واپسی پر لیتے جائیں گے۔ مجھے تو بہت مزے کی لگی ہیں دونوں چیزیں کیوں سمیر۔“

”چاٹ اور کباب تو آپ لے جائیے گا لیکن یہ کسی دکان سے نہیں بلکہ میں نے خود بنائے ہیں۔“

شمرہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

”سمیر مہمان نوازی تو ہمارے گھر کی تمہیں پتا ہے میری جان بلکان ہوتی تھی پھر اب تو بڑھاپے کی وجہ سے بازار سے چیزیں منگوانی پڑتی ہیں۔ اب ماشاء اللہ شمرہ بیٹی ریفرشمنٹ کی چیزیں بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اب مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ میں نے تو تمہاری امی کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا تھا کہ جنہوں نے شمرہ کی شکل میں مجھے پیاری سی خدمت گزار بیٹی دے دی۔“

”اور اچھی باورچن بھی۔“ علی نے گلزار جوڑتے ہوئے کہا۔

”باورچن کیوں یہ تو میرے گھر کی رونق ہے۔“

انکل نے بہو کو خراج تحسین پیش کیا۔ ”اس کی وجہ سے مجھے شطرنج کا حریف مل گیا ورنہ دوستوں میں جا کر کھیلتا تھا اور پھر تمہاری آنٹی کی باتیں سنتا تھا۔ اب اپنا شغل بھی برقرار ہے اور تمہاری آنٹی کی نظروں کے سامنے رہتا ہوں۔“ اور وہ سب مسکرانے لگے۔

سمیر نے ایک مطمئن اور خوش خاندان کو دیکھ کر ایک نظر اپنی سانولی ڈھیروں میک اپ کیے ایف اے پاس تک چڑھی بیوی کی طرف دیکھا اور پھر علی کے ساتھ بیٹھی ہوئی خوب صورت سادہ اور ایم اے پاس شمرہ کو اور افسردہ سی ہنسی ہنس دیا۔

آج اسے عملی طور پر سمجھا یا تھا کہ ہر چھکتی چیز سونا نہیں ہوتی اور دور کے ڈھول واقعی سہانے ہوتے ہیں۔

☆.....☆.....☆



برادر عم عمران قریشی صاحب
السلام علیکم!

حوصلہ افزائی کا شکریہ! ایک اور کورٹ کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ حمیرا آنٹی جیسے کردار شہر کی ہر دوسری بستی اور آبادیوں میں پائے جاتے ہیں۔ جو اپنی چمک دمک چرب زبانی کے باعث لوئر مڈل کلاس کے گھرانوں کو اپنا گرویدہ بنا کر ایسے کھیل کھیلتے ہیں کہ لوگ سالوں منہ چھپائے روئے نظر آتے ہیں۔ یہ تو اتفاق ہے پولیس کی بروقت کارروائی نے ایک واقعہ کو بے نقاب کر کے مجرموں کو کفر کردار تک پہنچایا ورنہ ایسے کیسوں میں دمنی سامنے آنا بھی پسند نہیں کرتے امید ہے یہ کہانی آپ کو اور قارئین کو ضرور پسند آئے گی۔

خلیل جبار
حیدر آباد

”اتنی دیر لگادی میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“ حمیرا آنٹی نے عکاشہ کو دیکھ کر کہا۔
”بس آنٹی میک اپ میں دیر ہوئی تھی ورنہ میں کب کی آ جاتی۔“ عکاشہ نے ہنستے ہوئے کہا۔
”اچھا چلو ہمیں باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے بازار چلنا چاہیے۔“ حمیرا آنٹی نے کہا۔
”ہاں ٹھیک ہے۔“ عکاشہ نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

حمیرا آنٹی عکاشہ کی سگی آنٹی نہیں تھیں انہیں محلے میں آئے ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے لیکن تھوڑے ہی عرصے میں محلے بھر کی خواتین میں اس طرح گھل مل گئی تھیں جیسے برسوں سے یہیں رہتی ہوں ہر ایک کے دکھ درد میں کام آنا ان کا معمول تھا۔ اپنے ہنس مکھ انداز سے روتے کو ہنس دینے کا فن بھی انہیں آتا تھا اکثر وہ جب بھی اپنے کام سے بازار جاتیں تو عکاشہ کو ساتھ لے جاتی تھیں اس کی امی عکاشہ کو آنٹی کے ساتھ جانے سے کبھی منع نہیں کرتی تھیں ایسے آنٹی پر پورا بھروسہ تھا۔ اس لیے ساتھ بازار بھیج دیتی تھی۔
آنٹی عکاشہ سے بہت محبت کرتی تھیں بازار میں جو

”بڑی زبردست فلم آئی ہے تمہارا دل خوش ہو جائے شرط منظور ہے؟“
”ہاں شرط منظور ہے لیکن شرط ہارنے والے پر گا۔“ وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔

”اچھا! کسی بات ہے پھر تو میں یہ فلم لازمی خریدوں گی۔“ حمیرا آنٹی بھی جواباً مسکرائیں۔
”مجھے کھانے پینے کا شوق ہے اس لیے جو ہارے گا وہ جیتنے والے کی پسند کی چیز اسے کھلائے گا بولو منظور ہے؟“

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے فلم نہیں بدلے گی؟ یہی فلم رہے گی؟“
”کیوں نہیں اپنی آنٹی پر اعتماد نہیں ہے۔“ آنٹی حمیرا نے کہا۔

”ارے نہیں آنٹی! ایسی بات نہیں میں تو مذاق کر رہی تھی۔“
”ارے بولو باتوں باتوں میں گھر آ گیا۔“ آنٹی نے گھر کا دروازہ کھولتے ہوئے اندر داخل ہو گئیں۔

”اچھا آنٹی میں چلتی ہوں۔“ عکاشہ نے کہنے کو یہ بات کہہ دی تھی لیکن اس کا ذہن اس فلم میں اٹکا ہوا تھا وہ اس وقت فلم دیکھنا چاہ رہی تھی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

آنٹی حمیرا نے جس انداز میں وہ فلم خریدی تھی اس نے عکاشہ کے دل میں تجسس پیدا کر دیا تھا اور وہ چاہ رہی تھی کہ جلد سے جلد فلم دیکھ لے۔

”اتنی بھی کیا جلدی ہے چلی جانا تم نے کون سا گھر جا کر باندی چوہا سنبھالنا ہے۔“ آنٹی حمیرا نے کہا۔
عکاشہ کی ہمت بندھ گئی اور وہ گھر جانے کی بجائے آنٹی کے گھر میں داخل ہو گئی۔

”عکاشہ بیٹی! ایسا کرتے ہیں میں باندی چوہا سنبھالتی ہوں تم فلم دیکھ لو اس طرح کم وقت میں ہرجیت کا فیصلہ ہو جائے گا۔“ آنٹی حمیرا نے کہا۔

”آنٹی کیا تم فلم نہیں دیکھو گی؟“
”تمہارے اکل گھر میں آتے ہی کھانا مانگتے ہیں

”اگر تم نے پوری فلم دیکھ لی تو دیکھ لی اور پھر ہو کر نہیں آئیں تو میں تجھوں کی تم کو اتنی جوانی ہو اور تم نے فلم انٹرویو دیکھی پھر اس کا مطلب ہوگا کہ تم ابھی بچی ہو

اس لیے کھانا تیار کرنا ضروری ہے فلم میں بعد میں دیکھ لوں گی ویسے بھی یہ خاص فلم ہے اس کیلئے دیکھنا اچھی لگتی ہے۔“ آنٹی حیرا سکرائی۔

”آنٹی اس طرح کی باتیں کر کے تجسس پیدا کر رہی ہو میرا دل نہ چاہتے ہوئے بھی یہ فلم دیکھنے کو چاہ رہا ہے۔“ عکاشہ نے کہا۔

”ہاں دیکھ لو فلم تمہیں کس نے روکا ہے۔“ آنٹی حیرا ڈی وی ڈی لگا کر بار بار چلی خانے میں چلی گئیں۔

عکاشہ نے ڈرتے اور تجسس سے مجبور ہو کر ڈی وی ڈی پلیئر میں فلم لگا دی، فلم شروع ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ عکاشہ کی حیرت کے مارے انہیں بھٹی کی بھٹی رہ گئیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ یہ کس قسم کی فلم ہے اس طرح کی فلم عکاشہ نے بھی نہیں دیکھی تھی اس لیے زیادہ حیرت ہو رہی تھی ان کے گھر

میں ہمیشہ صاف ستھری فلمیں دیکھی جاتی تھیں اس لیے یہ فلم دیکھتے ہوئے زیادہ حیرت ہو رہی تھی ساتھ ہی معصوم فرشتہ صفت آنٹی کی سوچ اس پر آشکار بھی ہو رہی تھی کہ وہ کسی قسم کے ذوق کی مالک ہیں۔ عکاشہ نے اپنی سہیلیوں کی زبانی سنا ضرور تھا کہ اس طرح کی فحش فلمیں بازار میں ملتی ہیں لیکن کبھی دیکھی نہیں تھیں۔

ابھی وہ اس سوچ میں تھی کہ فلم بند کر کے گھر بھاگ جاؤں ایسے میں آنٹی کمرے میں داخل ہوئیں۔

”آ... آ... آنٹی... یہ سب کیا ہے؟“

”ارے بھئی تم اتنی خوف زدہ کیوں ہو رہی ہو تمہارے چہرے سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے تم نے کوئی خوف ناک بلا دیکھ لی ہو۔“ آنٹی نے انہاں سے سوال کر ڈالا۔

”آنٹی یہ کیسی فلم ہے؟“ عکاشہ نے پھر سوال کیا۔

”میں نے کہا تھا کہ تم شرط بار جاؤ گی دیکھ لو تم فلم دیکھتے ہی پریشان ہو گئی ہو۔“ آنٹی نے چہرے پر

پراسرار مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

”آنٹی مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس طرح کی فلمیں بھی دیکھتی ہو۔“

”میری جان کبھی کبھی اس طرح کی فلمیں دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔“

”کیا...؟“ عکاشہ ابھی تک حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

”اچھا آنٹی میں چلتی ہوں۔“ وہ گھبرائی گھبرائی سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں کھانا تیار کر رہی ہوں کھانا کھا کر جانا۔“ آنٹی نے کہا۔

عکاشہ ان کی بات سنی ان سنی کرتی چلی گئی اس کے جانے پر آنٹی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

دوسرے تیسرے روز بلانے پر بھی جب عکاشہ نہیں آئی تو پھر آنٹی خود ہی گھر چلی آئیں اسے دیکھ کر عکاشہ کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

”عکاشہ بیٹی! بہت مصروف ہو گئی ہے اسے آنٹی سے ملاقات کا وقت ہی نہیں مل رہا۔“ آنٹی کے عکاشہ کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے تم بلاؤ اور عکاشہ آئے۔“ امی جان نے بھی جوابا مسکراتے ہوئے کہا۔

”کالج سے آ کر میں نوٹس تیار کر رہی تھی اس لیے فرصت نہیں مل سکی ورنہ ضرور چلی جاتی۔“ عکاشہ نے کہا۔

”ابھی کیا کر رہی ہو؟“ آنٹی نے پوچھا۔

”ابھی... ابھی کچھ بھی نہیں کر رہی۔“

”پھر آ جاؤ میرے گھر۔“ آنٹی نے سکراتے ہوئے کہا۔

”آنٹی کے چہرے پر ایک خاص مسکراہٹ دوڑ رہی تھی جسے عکاشہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

”عکاشہ بیٹی! چلی جاؤ تمہاری آنٹی گھر میں آ سکی ہوتی ہیں نا اس لیے بور ہو رہی ہوں گی۔“ امی جان نے کہا۔

عکاشہ آنٹی کے ساتھ نہ جانے کا کوئی بہانہ سوچ رہی تھی لیکن اس کا دماغ ساتھ نہیں دے رہا تھا مجبوراً اسے آنٹی کے ساتھ جانا پڑ گیا۔

”عکاشہ کیا مجھ سے ناراض ہو جو تم میرے بلانے پر نہیں آئیں؟“ آنٹی صوفے پر بٹھتے ہوئے بولیں۔

”میں کالج کے نوٹس تیار کر رہی تھی۔“ عکاشہ نے بات بنائی۔

”یہ بات تم نے اپنی امی کے سامنے بھی کہی تھی لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا ہے ضرور کوئی بات ہے جیسی تم نہیں آئیں؟“ آنٹی نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔

”دور ہو جائے۔“

”نہیں آنٹی! میرا فلم دیکھنے کا موڈ نہیں ہے۔“ عکاشہ فلم کا سن کر گھبرا گئی۔ آنٹی نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے ڈی وی ڈی پر فلم چلا دی۔ عکاشہ سمجھ چکی تھی وہ کس طرح کی فلم ہے اس لیے اس کا چہرہ فحش ہو گیا اور وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”آنٹی... مم... میں چلتی ہوں مجھے گھر پر کام ہے۔“

”ارے بھٹو بھٹی کام ہوتے رہیں گے تم فلم دیکھو ایمان سے بڑے مڑے کی ہے۔ میں تین دفعہ یہ فلم کو دیکھ چکی ہوں پھر بھی بار بار دیکھنے کو جی کرتا ہے۔“

عکاشہ الجھ کر رہ گئی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے وہ فلم غیر اخلاقی ضرور تھی لیکن اس فلم کے سحر نے عکاشہ کو جکڑ لیا تھا اور وہ بھی آنٹی کی طرح ابتداء سے اینڈ تک بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ فلم کے ختم ہو جانے پر آنٹی کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔

جسے عکاشہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

اس رات عکاشہ رات بھر سو نہ سکی۔ وہ رہ کر فلم کے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتے رہے۔ اسے اپنے جسم میں ایک عجیب سے اٹھن کا احساس ہو رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے چیونٹیاں ہی رینگ رہی ہوں اس کا حلق یار بار خشک ہو رہا تھا۔ وہ اس کیفیت کو سمجھ نہیں پار رہی تھی۔

آنٹی حیرا اسے بہانے بہانے سے گھر بلاتیں اور غیر اخلاقی فلمیں دکھاتیں اور فلمیں اس نے کیا دیکھیں پھر اسے بھی ایسی فلمیں دیکھنے کا چکا لگ گیا۔ وہ آنٹی سے فرمائش کر کے ایسی فلمیں منگواتی اور دیکھتی۔ آنٹی بھی عکاشہ کے اس عمل سے خوش تھی۔

ایک دن جب عکاشہ خوش گوار موڈ میں تھی آنٹی بولیں۔

نوشہ بنانے سے تمہارے ذہن پر جو ٹھکن ہو گئی ہے وہ

”عکاشہ میری بات کا برا نہیں منانا میں یہ بات تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں تم آئندہ جب میرے پاس آؤ تو گھر پر اپنی کسی فرضی سہیلی کا نام لے کر آیا کرو۔“

”وہ کیوں آئی؟“ عکاشہ چونکی۔

”ارے بھئی تم دودھ پیتی بچی نہیں ہوئے بات تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ ایسی فلمیں چھپ کر دیکھنے کی ہوتی ہیں روز روز میرے پاس دیر تک بیٹھنے پر تمہارے والدین کو شک ہو سکتا ہے تم میرے پاس اتنی دیر بیٹھ کر کوئی ایسا کام کر رہی ہو جو گھر پر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے تمہارا محتاط رہنا ضروری ہے۔“

”ہاں آئی تم سچ کہہ رہی ہو امی مجھ سے ایک دن پوچھ رہی تھیں کہ تم ان دنوں گھر میں کم آنی کے گھر زیادہ رہنے لگی ہو کیا امتحانات میں فیل ہونے کا ارادہ ہے۔“ عکاشہ نے کہا۔

”یہ چکا ہی ایسا بدل ہی نہیں بھرتا اس بنا پر میں نے تمہیں مشورہ دیا ہے کہ میرا نام لے کر نہ آیا کرو۔“ آئی نے کہا۔

”ٹھیک ہے آئی میں ایسا ہی کروں گی جیسا تم کہو گی۔“

”شباباش۔“ آئی نے اس کے شانوں پر تھکی دی۔

عکاشہ آئی کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے گھر سے اپنی کسی سہیلی کا نام پتا کر نکلتی اور آئی کے گھر پہنچ جاتی۔

آئی بھی اس سے بہت خوش تھیں وہ عکاشہ کی بہت خاطر مدارت کرنے لگی تھیں۔ عکاشہ بھی حیران تھی کہ

اس میں ایسی کیا خوبی آئی نے دیکھ لی ہے جو ضرورت سے زیادہ خاطر مدارت کر رہی ہیں۔ آئی اب فلم کے دوران باہل اس سے چپک کر بیٹھتی تھیں اور بعض

اوقات وہ غیر محسوس انداز میں اس کے جسم پر ہاتھ پھرتیں تو عکاشہ کو ایک انوکھے سرور کا احساس ہوتا۔ پھر

ایک روز آئی نے ایک عجیب سی فرمائش کی عکاشہ نے چاہتے ہوئے بھی بہک گئی اس کے بعد وہ آئی کے ساتھ یہ کھیل ہر دوسرے روز کھیلنے لگی۔

ایک روز جب وہ فلم دیکھ رہی تھی ایک نوجوان پارک کمرے میں داخل ہوا اس وقت آئی چکن میں تھیں

عکاشہ اسے دیکھ کر گھبرا گئی اور نورانی وی بند کر دیا۔ آئی نے بتایا کہ یہ کاشف ہے میرا بھانجا۔ اگلے دن جب وہ دوبارہ آئی کے گھر گئی تو گھر صرف وہ لڑکا ہی تھا آئی

موجود نہ تھیں۔ کاشف نے بتایا کہ آئی پڑوس میں ہیں۔ اس نے اسے فرنیج سے لوک کو بوتل نکال کر دی جسے پیتے ہی عکاشہ کو اپنا سر گھومتا محسوس ہوا پھر اس کے

ساتھ جو کچھ ہوا وہ خود کو روک نہ سکی اور جذبات کے سمندر میں بہتی چلی گئی۔ آئی جب لوٹیں تو وہ کاشف کے ساتھ بستر پر تھی آئی منہ سے کچھ نہ بولیں لیکن ان کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی۔

عکاشہ انجام سے بے خبر آئی کی چکنی چیری باتوں میں آ کر اس کی ہر بات پر اپنا سر تسلیم کر لیتی تھی۔ غیر اخلاقی فلمیں دیکھنے کا چمکا جس انسان کو پڑ جائے وہ

بے شرم سا ہو جاتا ہے اچھائی اور برائی کا فرق جانتا رہتا ہے یہی کچھ عکاشہ کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ وہ گراہی کی

طرف چل نکلی تھی اسے اپنی عصمت گنوا دینے پر کوئی ملال نہیں تھا آئی اس کی سادگی کا فائدہ اٹھا کر لوگوں سے خوب پیسے بٹور رہی تھیں عکاشہ کو جب اس معاملے

کی بھنک پڑی جن دوستوں کے ساتھ وہ تنہائی کے لمحات گزارتی ہے اس کا بھرپور معاوضہ آئی وصول کر رہی ہیں اس نے سخت احتجاج کیا۔ آئی ایسے

معاملات کو سلجھانے کی ماہر تھیں معاوضے سے کچھ کم اس نے عکاشہ کو بھی دینی شروع کر دی تھی رقم بے بری

لگتی ہے وہ بھی رقم ملنے پر خوش ہو گئی اور اس نے آئی کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ وہ معاوضے کے معاملات خود ہی

اس کے دوستوں سے طے کر لیا کرے جن دوستوں سے اس کا موبائل فون پر رابطہ ہو جاتا تھا وہ ساری رقم

عکاشہ کی جیب میں چلی جاتی تھی یہ بات کب تک آئی سے چھپی رہ سکتی تھی جیسے ہی انہیں یہ بات پتا چلی وہ

نے ساگ بگولہ ہو گئیں۔ ”عکاشہ تمہیں ایسا میں ہرگز نہیں سمجھتی تھی۔“ آئی

حیران کر جتے ہوئے بولیں۔ ”میں نے ایسا کیا کر دیا جو تم اتنی خفا ہو رہی ہو؟“

عکاشہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”عکاشہ بچ کے پوچھو پانی میں تیر نامت سکھاؤ۔“

”مجھے پتا تو چلے کہ میرا کیا قصور ہے؟“ ”تم نے مجھ سے استادی دکھائی شروع کر دی ہے

اپنے یاروں کے پاس مجھ سے پوچھے بنائی جارہی ہو اگر تمہیں جانا ہے ضرور جاؤ لیکن میرا حصہ ضرور دے دیا

”آئی کچھ شرم کرو تم نے مجھ سے کتنی رقم کمائی ہے اس کا کچھ اندازہ ہے مجھے سب علم ہو گیا ہے کہ تم نے کتنا

کمایا ہے اور مجھے کتنا کم معاوضہ دیا اب اگر میں اپنے طور پر کچھ کمادی ہوں تو تمہیں کس بات کی جیسی ہو رہی

ہے۔“ ”عکاشہ تم ابھی بچی ہو تم یہ نہیں جانتیں کہ زمانہ کس

قدر خراب ہے اپنے طور پر کسی سے ملاقات نہ کیا کرو بلاوجہ مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔“ آئی حیرانے اس کا

سخت لہجہ دیکھ کر اپنا لہجہ دھیمہ کر لیا تھا۔ ”حیرا آئی بہت چالاک تھیں اسے یہ اچھی طرح

معلوم تھا کہ ایسے مواقع پر سختی کرنے سے عکاشہ اس کے ہاتھ سے نکل سکتی ہے اور وہ اسے کسی صورت میں

گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ ”میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں مہربانی کر کے

آئندہ مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کرنا۔“ عکاشہ نے

قدرے سخت لہجے میں کہا۔

آئی حیرا کو عکاشہ سے اس طرح کے سخت رویے کی ہرگز امید نہیں تھی اس لیے اسے سخت دھچکا پہنچا تھا

ایسے موقع پر عکاشہ سے سخت رویہ اپنانا نقصان دہ تھا۔ عکاشہ نے آئی کے جیب سادھ لینے پر اپنا کام کھل

کر کرنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے تھوڑا بہت آئی کی جاکو خوف تھا وہ بھی جاتا رہا تھا۔ آئی بھی اس کی سرگرمیوں سے

غافل نہیں تھیں اسے پل پل کی خبریں ملتی رہتی تھیں کہ عکاشہ اپنے کن کن دوستوں کے پاس وقت گزار کر کتنا

معاوضہ وصول کر رہی ہے۔ اس کا شیطانی ذہن عکاشہ سے انتقام لینے کے لیے پرتول رہا تھا۔ عکاشہ اس کے

لیے سونے کی چڑیا تھی جواب ہاتھوں سے نکل جا رہی تھی۔

عکاشہ صبح سو کر اٹھی ہی تھی کہ موبائل فون بج اٹھا۔ اسکرین پر آئی کا نمبر جگمگا رہا تھا اس کا دل نہیں چاہ رہا

تھا کال اوکے کرے اس لیے کال کاٹ دی۔ دوسری اور تیسری بار کال کٹنے پر چوٹی بار کال آنے پر عکاشہ کو کال

اینڈ کرنا ہی پڑی آج اس کا گھر پر آرام کرنے کا موڈ پر کچھ کمادی ہوں تو تمہیں کس بات کی جیسی ہو رہی

ہے۔ ”کیا بات ہے عکاشہ! کال اینڈ نہیں کر رہی تھیں۔“ آئی نے کال اینڈ ہونے پر کہا۔

”آئی آج گھر سے باہر جانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔“ عکاشہ نے دل کی بات کہہ دی۔

”ارے میری جان بہت ہی ٹکڑا مرغا تمہارے لیے پھانسا ہے اس سے مل کر تمہارا جی خوش ہو جائے گا۔“ آئی قہقہہ مارتے ہوئے بولیں۔

”بس رہنے دو آئی! تم ہر بار ایسے ہی کہتی ہو۔“ عکاشہ نے منہ بنایا۔

”میری جان کا اگر اس مرغے سے دل خوش نہ ہو تو پھر کبھی میرے بلانے پر نہ آنا۔“

”کیا واقعی؟“ عکاشہ چونکی۔

”ہاں ہاں میں کیا جھوٹ بولوں گی۔“

”ٹھیک ہے میں کوئی بہانہ کر کے گھر سے نکلتی ہوں۔“ عکاشہ نے کہا۔

”بہانہ کیوں؟“

”کیا ہو گیا آئی! تمہیں نہیں معلوم کہ آج اتوار ہے اور اتوار کو کالج کی چھٹی ہوتی ہے۔“

”ارے ہاں واقعی میں یہ بھول ہی گئی تھی خیر تم جلدی سے تیار ہو کر میرے پاس آ جاؤ میں تمہیں صدر کے علاقے میں ہی ملوں گی۔“

”اوکے آئی۔“ عکاشہ مسکراتے ہوئے بولی۔

اسے معلوم تھا کہ آئی صدر کے علاقے میں کہاں ملیں گی اس لیے عکاشہ تیار ہو کر وہاں پہنچ گئی آئی ایک بڑی سی کار میں بیٹھی ہی کار بڑک پر دوڑنے لگی وہ معنی خیز انداز سے عکاشہ کو دیکھ رہی تھی جب اس سے نہ رہا گیا تو وہ پوچھ بیٹھی۔

”آئی آج بہت خوش نظر آ رہی ہو، کیا بہت بڑا مہرغا بھنس گیا ہے۔“

”ہاں چھوٹے چھوٹے مہرغے جھنٹے ہی رہتے ہیں بڑا مہرغا جھنٹے پر زیادہ خوشی ہوتی ہے۔“ آئی نے زور دار قبضہ لگایا۔

”اچھا جی جی تم اتنی خوش نظر آ رہی ہو۔“ عکاشہ نے بھی جواباً قبضہ مارتے ہوئے بولی۔

”خوشی کی بات ہے جی میں خوش ہوں۔“

کار مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی ایک بڑے سے بنگلے کے گیٹ پر رکی۔ بنگلے کا گیٹ کھلتے ہی کار بنگلے کے اندر چلی گئی۔ عکاشہ بنگلہ دیکھ کر دنگ رہ گئی آئی بھی اسے ایسی جگہ نہیں لائی تھیں وہ دل ہی دل میں آئی کو داد دے رہی تھی کہ آج اس نے اچھی جگہ ہاتھ مارا ہے

اسے معاوضہ اچھا ملنے کی توقع تھی۔

”آئی تمہیں داد دینے کو دل چاہ رہا ہے۔“ عکاشہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے ابھی زیادہ باتیں نہیں کرو یہ باتیں خیر کر لیں گے۔“ آئی نے مختاط انداز سے کہا۔

”ارے آئی میں جلدی میں اپنا موبائل گھر ہی بھول آئی۔“ عکاشہ نے اپنا پرس کھول کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ارے چھوڑو تمہارا موبائل کہیں بھاگتا توڑی جا رہا ہے گھر پر ہی ہے نا۔ کہیں راستے میں گر جانے پر پریشان ہونا چاہیے۔“ آئی نے بے پرواہی سے کہا۔

عکاشہ بھی یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ موبائل گھر پر ہی ہے اس لیے کم ہونے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

بنگلہ باہر سے جتنا خوب صورت تھا اتنا ہی اندر سے بھی خوب صورت تھا۔ وہ دبیز قالین پر چلتی ہوئی اندر داخل ہوئیں ڈرائنگ روم میں ایک صحت مند پٹھان بیٹھا ہوا تھا کندھے پر گن لگی ہوئی تھی تین ملازم ہاتھ پاندھے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے کندھوں پر گنیں تھیں ان دونوں کو پٹھان نے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا ان کے صوفے پر بیٹھنے پر وہ ان سے مخاطب ہوا۔

”آئی تم نے ہمارا دل خوش کر دیا ہے جیسا مال کہا تھا وہاں ہی لائی ہو۔“

”لالہ فیروز! میرا کام ہی تمہاری خدمت کرنا ہے اس لیے میں تمہاری سوچ سے بھی زیادہ اچھا مال لائی ہوں۔“ آئی نے زور سے کہی۔

”ہاں یہ بات تمہاری سو فیصد درست ہے ابھی تک جتنے بھی ہیرے لائی ہو وہ ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔“

لالہ فیروز نے کہا۔

اس کے ایک اشارے پر ایک ملازم نے ہزار ہزار روپے کی پانچ گڈیاں آئی کے حوالے کر دیں۔ نوٹ

دیکھ کر آئی کی بانجھیں کھلی جا رہی تھیں۔ اس سے زیادہ حیرت عکاشہ کو ہو رہی تھی کہ اتنی بڑی رقم اس نے آج تک نہیں دیکھی تھی وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی لالہ فیروز سے اس کی پہلے ملاقات ہوئی ہوئی تو یہ ساری رقم اس کی جیب میں ہوئی رقم ملتے ہی آئی نے پرس میں ٹھونس لیا اور باہر جانے کا ٹھکڑی ہوئی۔

”آئی اتنی جلدی کیا ہے ساتھ ہی چلیں گے۔“ عکاشہ نے گھبراتے ہوئے کہا۔

عکاشہ کی ٹونوں کو دیکھ کر نیت خراب ہو رہی تھی اور وہ چاہ رہی تھی اس رقم سے اپنا زیادہ حصہ وصول کرے۔ آئی کی حیثیت ملاقات کر دینے کی تھی پھر وہ آدھے حصے کی شریک کیوں ہو۔

”بے ڈوف لڑکی! میں نے تیرا سودا کر دیا ہے اب تجھے لالہ فیروز کے پاس ہی رہنا ہے جب اس کا تجھ سے دل بھر جائے گا یہ تجھے ماسی بنا کر رکھے گا یا کسی اور کے ہاتھ بیچ دے یہ لالہ فیروز کی مرضی پر منحصر ہے۔“

آئی کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔

”تو کون ہوئی ہے میرا سودا کرنے والی؟ چل کہیں کی میں جا رہی ہوں دیکھتی ہوں مجھے کون روکتا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے عکاشہ باہر کو دوڑی دروازہ بند ہو چکا تھا۔ وہ صرا کر فرار ہونے کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگی فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا دو رخ افراد نے آگے بڑھ کر عکاشہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”میری مرضی کے خلاف کوئی زبردستی نہیں کر سکتا“

مجھے جانے دو۔“ وہ زور سے چیخی۔

”لڑکی یہاں سے کوئی بھی اپنی مرضی سے نہیں جاتا اور جاتا ہے وہ میری مرضی سے ہی باہر جاسکتا ہے۔“

لالہ فیروز نے گرجتے ہوئے کہا۔

”آئی تم نے یہ اچھا نہیں کیا میں تمہیں دیکھ لوں گی۔“ عکاشہ نے غصے سے آئی کو گھورا۔

”اور کر مجھ سے بغاوت یہ سب ہونے میں تیری گستاخی ہے تمہارے محلے کی نائلا انیلہ فرحانہ اور یاسمین نے بھی مجھ سے بغاوت کی تھی دیکھ لے کیا انتقام میں نے ان سے لیا ہے ان کے والدین انہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں لیکن وہ ان کی گردن کو نہیں پہنچ سکے پھر تو میرا کیا لگاڑے گی۔“

”کیا.....؟ انہیں بھی تم نے بیچ دیا ہے؟“

”ہاں میرا یہی کام ہے کسی بھی غریب علاقے میں جا کر لڑکیوں کو دھندے پر لگا دینا جو بغاوت پر اترے اس کا سودا کر دینا اور جیسے ہی مجھے محسوس ہو جائے کہ علاقے والے مجھے شک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں علاقہ بدل دیتی ہوں۔“ آئی نے شعلہ برسانی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

عکاشہ حیرت سے بت بنی اسے دیکھتی رہ گئی۔ لالہ فیروز کے آدمیوں نے عکاشہ کو پکڑ کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ آئی خوش خوش وہاں سے رخصت ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

”استاد پیارے کہاں ہو نظر ہی نہیں آ رہے ہو؟“ جیسے ہی میری نظر استاد پیارے پر پڑی میں نے کہا۔

”کورٹ میں رکھا ہی کیا ہے آج کل میں باہر ہی باہر پیدا کر رہا ہوں آج صبح ہی صبح آٹھ سو روپے کی پیدا کر لی ہے کورٹ میں اتنی پیدا کہاں ہو سکتی ہے۔“

استاد پیارے نے جپکتے ہوئے کہا۔

”استاد پیارے تم بہت اچھے جا رہے ہو۔ تم ہم لوگوں کی طرح نہیں ہو جو خبروں کی تلاش میں مارے مارے پھرے نعیم بھائی کو ہی دیکھ لو دھوپ میں رپورٹنگ کرتے ہوئے کس قدر کالے ہو گئے ہیں آئے دن گرمیوں میں بیمار پڑ جاتے ہیں حالانکہ یہ عمر ان کی گھر میں آرام کرنے کی ہے۔“

”ہاں یہ بات بالکل ٹھیک ہے لیکن یہ عمر آپ کے

بھی آرام کرنے کی ہے اور آپ باہر ہی باہر پیدا کر رہے ہیں۔“ میں نے استاد پیارے کو چھیڑا۔

”میں اکیلا آدمی ہوں گھر میں پڑے پڑے بور ہو جاتا ہوں اس لیے کام میں مصروف رہتا ہوں تاکہ بور نہ ہوں یہ بڑھاپا ہے نہ یہ بڑھاپا نہیں براپا ہے جو کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔“ استاد پیارے نے کہا۔

”ہاں استاد پیارے تم نے بالکل درست کہا ہے۔“ نعیم قریشی نے ہمارے قریب آ کر کہا۔

”خلیل جبار اب جلدی سے چائے پلانے کا بندوبست کرو، نعیم بھائی بھی آ گئے ہیں۔“ استاد پیارے نے چپکتے ہوئے کہا۔

”استاد پیارے میرے پاس پیسے کہاں ہیں جو تمہیں چائے پلاؤں۔“ میں نے اپنی جان چھڑانے کو کہا۔

”وہ سینیٹن والا ادھار بھی دے دیتا ہے۔“ استاد پیارے نے کہا۔

”میں ہی چائے پلاؤں استاد پیارے کیوں نہیں؟“

”خلیل جبار سمجھا کرو اپنی بھی جیب خالی ہے۔“

”اور صبح جوتا تھو سو روپے کی پیرا کی بھی وہ کہاں ہے؟“

”ارے بھئی وہ میں گھر رکھ کر آ گیا ہوں خواجوا اتنا وزن جیب میں لیے کہاں پھروں گا۔“ استاد پیارے نے بات بنائی۔

”استاد پیارے کچھ رقم جیب میں رکھ لیتے اب چائے پینے کا مسئلہ پیدا ہو گیا نا۔“ نعیم قریشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نعیم بھائی میں اب تمہیں کیا کہوں کچھ دیر استاد پیارے کو خوش ہو لینے دیا کرو میری خوشی تمہیں ذرا بھی عزیز نہیں۔“

”کیوں میں نے کیا کر دیا۔“ نعیم نے مصروفی گھبراہٹ کا اظہار کیا۔

”یہ بات تمہیں بھی معلوم ہے ہمیں رپورٹنگ میں کیا ملتا ہے دوستوں پر ایسے ہی کچھ دیر عجب ڈالے ہو پیرا کی بات کر کے جی خوش کر لیتے ہیں آنکھوں سے روپے کی رقم اتنی زیادہ بھی نہیں کہ جب بھاری ہو جائے بس دل کی طرح پر یہ بات میں نے کہہ دی تھی ورنہ اس دور میں کوئی مفت میں اپنا بخار دینے کو تیار نہیں پھر کوئی مجھے تھوڑے سو روپے کیوں کر دے گا۔“ استاد پیارے نے کھسیانا ہوتے ہوئے کہا۔

”استاد پیارے پھر چائے کا کیا بنے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”استاد پیارے کے ہوتے ہوئے تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہر کام طریقے سے ہو گا چائے بھی ملے گی اور بسکٹ بھی ملیں گے۔“ استاد پیارے نے ایک پولیس افسر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ بات کی ہے استاد پیارے نے۔“ نعیم قریشی نے مسکرا کر کہا۔

”ایس ایچ او تسلیم بھائی کہاں ہو ذکیھو تم سے شہر کے بڑے بڑے صحافی ملتے ہیں۔“

”اچھا اچھا بڑی مہربانی آپ لوگوں کی۔“ ایس ایچ او تسلیم نے اپنی ڈھیلی پیٹت کرتے ہوئے کہا۔

”بس صرف مہربانی یہ کیسی مروت ہے۔“ استاد پیارے کا ایس ایچ او کی بات سن کر منہ بن گیا۔

”استاد پیارے حکم کرو میں تمہاری کیا خدمت کروں۔“ ایس ایچ او تسلیم نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اس وقت ہمارا چائے پینے اور بسکٹ کھانے کو دل کر رہا ہے۔“ استاد پیارے نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

”بس کوئی خبر وغیرہ لینے کا پروگرام نہیں ہے۔“

”ہاں ہاں خبر دیں ہم ضرور چھاپیں گے۔“ استاد پیارے کے چہرے پر خبر کا سن کر سرخی دوڑ گئی۔

”سینیٹن میں بیٹھتے ہی ایس ایچ او تسلیم نے میرے کچانے اور بسکٹ کا ڈرڈیا۔“

”حیدر آباد کے مختلف تھانوں کی حدود میں لڑکیوں کے اغواء کی وارداتیں بہت ہوتی ہیں ان لڑکیوں کو اغواء کرنے اور انہیں خریدنے والے گروہ کی پولیس کو بڑے دنوں سے تلاش بھی لیکن گروہ پولیس کے ہاتھ نہیں چڑھ رہا تھا رات ہی میں نے کامیاب چھاپے مار کر حمیرا آئی اور لالہ فیروز اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ ایک لڑکی عکاشہ کو بھی ان کے قبضے سے بازیا کر لیا ہے۔“ ایس ایچ او تسلیم نے بتایا۔

”واہ کیا بات ہے۔“ استاد پیارے نے چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھاتے ہوئے کہا۔

”یہ گروہ کس طرح آپ کے قابو آیا؟“

”مجرم ہمیشہ واردات بڑی صفائی سے کرتا ہے لیکن کبھی نہ کبھی اس سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جاتی ہے جو ان کی گرفتاری کا سبب بنتی ہے ایسا ہی اس بار ہوا ہے حمیرا آئی کسی طرح سے لڑکیوں کو گھیر کر بدکاری کے لیے استعمال کرتی تھی اس کی تفصیلات عکاشہ کے عدالت کو دیئے ہوئے 164 کے بیان سے مل جائے گی میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ گروہ کس طرح ہمارے قابو آیا۔ آئی کے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ عکاشہ گھر پر جو موہل بھول گئی ہے وہی اس کی گرفتاری کا سبب بنے گا آئی عکاشہ کا پانچ لاکھ روپے میں سودا کر کے مطمئن تھی اور گھر پر سکون کی نیند سو رہی تھی۔ عکاشہ کے والد اور بھائی اس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ ہسپتال عکاشہ کی سہیلیوں کے گھر بھی گئے ہر جگہ سے ماویں ہوئی مجبوراً انہیں تھانے کا رخ کرنا پڑا۔ میں نے سب سے پہلے عکاشہ کا موہل منگوا لیا اور اس پر آنے اور

جائے والی کال کو اپنے پاس نوٹ کیا اور ان نمبرز پر کال کر کے اپنے طریقے سے نفیشت کی آخری کال آئی حمیرا کی تھی میں نے فوراً آئی حمیرا کو حراست میں لے لیا۔ اس نے مجھے بھاری رشوت کی آفر بھی کی کہ بات کو میں دبا دوں۔ میں نے جب سختی کی اس نے سب کچھ اگل دیا۔ اس کی معلومات پر سب کو چھاپے مار کر گرفتار کر لیا گیا۔ لالہ فیروز کے گھر سے عکاشہ بازیاب بھی ہوئی، مزمان کا ہم نے تین دن کا ریمانڈ لے لیا ہے امید ہے کہ ہم دوسری اغواء کی گئی لڑکیوں کو بھی بازیاب کرالیں گے۔“

”تسلیم بھائی یہ بڑی تہلکہ خیز خبر ہے ہمارا اخبار اسے بہت نمایاں چھاپے گا۔“

”مجھے معلوم ہے یہ خبر تمہارے اخبار کے لیے بڑی خبر ہے اس لیے تمہارے کہنے سے پہلے خبر بتادی ہے۔“ ایس ایچ او تسلیم نے مسکراتے ہوئے اپنی موچھوں کو تالا دیا۔

استاد پیارے کی خوشی دیدنی تھی، سول عدالت میں ہماری ملاقات عکاشہ سے بھی ہو گئی جسے والدین کے حوالے کر دیا گیا تھا عکاشہ سے بات چیت کرنے اور اس کے 164 کے بیان سے اخبار کو ایک اچھی خبر مل گئی تھی استاد پیارے ہم سے زیادہ خوش نظر آ رہے تھے یہ خبر جہاں اخبار کے لیے اچھی خبر تھی وہیں ان والدین کے لیے لمحہ خیر بھی تھی جو چند دنوں کی ملاقات میں اجنبی لوگوں پر اعتماد کر کے اپنی لڑکیوں کو ان کے پاس جانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ یہ اندھا اعتماد ایک دن ان کے لیے بڑی شرمندگی کا بھی سبب بن جاتا ہے لیکن اس وقت پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے اور سوائے افسوس و شرمندگی کے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

نفسہ آفاق 131

نفسہ آفاق 130

ٹھوکریں

عزیزم عمران احمد قریشی
السلام علیکم!

ٹھوکر کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ کہانی کوئی نئی یا انوکھی نہیں بلکہ ایسی کہانیاں ہر روز ہمارے سامنے آتی ہیں لیکن ہم اس پر غور نہیں کرتے یا زیادہ سے زیادہ ایسے کرداروں پر لعنت بھیج کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس سے سیکھنے یا سبق حاصل کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے کیونکہ ہم سب کے اندر ایک انا پرست خود غرض شخص چھپا ہوتا ہے۔ جو صرف اور صرف آج کو دیکھتا ہے کل کیا ہوگا اس کے بارے میں سوچنا بھی پسند نہیں کرتا۔ میری درخواست ہے کہ قارئین خاص طور پر خوانین آسیہ کے کردار کا مطالعہ ضرور کریں۔ ہاگوں کی سنی حالت میں سڑکوں پر ماری ماری گھوم رہی ہے۔

والسلام
محمد سلیم اختر
راولپنڈی

غیاث الدین کا شمار اپنے علاقے کے امیر اور معزز لوگوں میں ہوتا تھا۔ دولت ان کے گھر کی باندی تھی جس میں زیادہ تر اوپر کی کمائی شامل تھی۔ وہ کسی ایسے سرکاری ادارے میں بطور کلاس اول آفیسر کے کام کرتے تھے۔ جہاں اوپر کی کمائی کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ غیاث صاحب نے لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو امیر لوگوں کی صف میں شامل کر لیا تھا۔ گھر میں ان کے علاوہ کوئی بزرگ نہ تھا۔ جو ان کو روک ٹوک کرتا اس لیے ان کو ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔ انہوں نے شادی بھی اپنی پسند کی تھی ان کی بیوی راشدہ بھی ان جیسی ہی نکلی دولت کی پجاری اور انتہائی فضول خرچ۔ اب تو غیاث صاحب نے دفتر میں آنے والے لوگوں کو اور بھی تنگ کرنا شروع کر دیا تاکہ ان کی آمدنی میں مزید اضافہ ہوتا رہے اور وہ اس میں کامیاب جا رہے تھے وہ حرام کی کمائی کا حصہ اوپر تک پہنچاتے تھے اس لیے کوئی ان کو پوچھنے والا نہ تھا۔ دونوں میاں بیوی ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے اور احساس کی

والے تڑپ اٹھتے یوں لگتا کہ تمام گھر والوں کی روحیں آسیہ کے اس ننھے جسم میں تحلیل ہو چکی ہیں اور اگر اسے کچھ ہو گیا تو یہ سب لوگ بھی زندہ نہ رہیں گے۔

ت کچھ اور سر کا آسیہ اب اسکول جانے لگتی تھی بے جا دل اور پیار نے اسے خود سر ضد بنا دیا تھا مگر اس کے گھر والوں کو اس کی یہ عادات اچھی لگتی تھیں۔ وہ اس کی ان اداؤں سے بھی پیار کرتے۔ اس کی ہر جائز اور ناجائز خواہش منٹوں میں پوری کر دی جاتی۔ آسیہ کو بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کے لیے ضرورت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے وہ بعض اوقات بلاوجہ ضد کرنے لگتی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کی ہر خواہش پوری کر دی جائے گی۔ اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ وہ امیر والدین کی بیٹی ہے جن کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے اس نے اپنی امیری کا رعب اپنی کلاس فیلوز پر بھی جمانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی ٹیچرز کو بھی معاف نہ کیا جس وجہ سے اس کا نام اسکول سے خارج کر دیا گیا۔ اس کے باپ نے اسے دوسرے اسکول میں داخل کر دیا مگر اپنی پوسٹ سے فائدہ اٹھا کر اس اسکول کی ہیڈ مسٹریس کی تبدیلی کی دوجہ کر ڈالی۔

یوں ہی دولت میں کھیلتے ہوئے آسیہ کالج تک جا پہنچی اس کے تینوں بھائی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے تینوں مختلف اداروں میں ملازمت کر رہے تھے دو کی تو شادی بھی ہو گئی تھی اور وہ اپنے اپنے گھروں میں خوش حال زندگی گزار رہے تھے جب کہ تیسرا بھائی اجمل اسی شہر میں سروس کر رہا تھا۔ اجمل کی ابھی تک شادی نہ ہوئی تھی اس لیے وہ والدین کے ساتھ رہ رہا تھا۔ دونوں شادی شدہ بھائی آسیہ کو کسی

ریٹائر ہو گیا، لہذا اب انہوں نے آسیہ کی شادی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا، اس سلسلہ میں غیاث نے اپنی بیوی راشدہ اور اجمل سے بات کی تو انہوں نے بھی اس فیصلہ کی تائید کی۔ لہذا لڑکے کی تلاش شروع ہو گئی، اجمل کے دفتر میں عادل نام کا ایک لڑکا کام کرتا تھا، پوسٹ بھی اچھی تھی اور وہ والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ زیادہ امیر تو نہ تھے مگر عادل بہت سلیخا ہوا اور شریف لڑکا تھا۔ ایک سال بعد اس کی پردوشن ہوئی تھی اور اس نے کلاس ون آفیسر بن جانا تھا۔ سب نے اس رشتہ کو پسند کیا کہ آسیہ یقیناً عادل کے ساتھ خوش رہے گی۔ غیاث صاحب ایک دن اجمل کے ہمراہ عادل کو دیکھنے اور ملنے گئے، عادل ان کو بھی اچھا لگا، انہوں نے تمام بات اجمل پر ڈالی کہ وہ ہی اس سلسلہ میں عادل کی مرضی معلوم کرے اور اسے اس رشتہ پر قائل کرے۔

آسیہ ان تمام باتوں سے بے خبر تھی کیونکہ وہ تو اپنی محبت کی دنیا میں گم تھی، گھر والوں نے اس کی رائے معلوم ہی نہ کی کہ وہ اس کی شادی عادل سے کرنا چاہتے ہیں، ادھر اجمل نے خود ہی عادل سے اس موضوع پر بات کی اور آسیہ کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ عادل کہنے لگا۔ ”میں اپنی ماں سے اس سلسلہ میں بات کروں گا۔“ یوں یہ سلسلہ چل نکلا پھر ایک دن آسیہ کی غیر موجودگی میں جب وہ کالج گئی ہوئی تھی، عادل کے ماں باپ اجمل کے ہمراہ اس کے گھر آ گئے اور پھر اسی دن عادل اور آسیہ کا رشتہ طے پا گیا۔ مگر وہ جن کو اوٹ بندھن میں باندھا جا رہا تھا یعنی عادل اور آسیہ وہ دونوں موجود ہی نہ تھے، البتہ عادل کو معلوم تھا جب کہ آسیہ تو بے خبر تھی۔ طے یہ ہوا کہ آسیہ جب بی بی اے کر لے گی اور عادل کلاس ون آفیسر بن جائے گا تو تب ان کی شادی کی جائے

گی۔ عادل کے ماں باپ نے کہا کہ اگلے ہفتہ وہ لڑکی دیکھنے آئیں گے اور آسیہ کو منگنی کی انگلی پہنا دیں گے۔

آسیہ جب کالج سے واپس آئی تو اس کی ماں نے اسے عادل اور اس کے ساتھ اس کی نسبت طے ہونے کے بارے میں بتایا، آسیہ یہ سن کر غصہ سے کھول اٹھی اور کہنے لگی۔

”آپ لوگوں نے مجھ سے پوچھے بغیر اور میری مرضی جانے بغیر کیوں ہاں کی ہے؟ میں آزاد خود مختار اور اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ عادل کون ہے؟ کیسا ہے؟ میں نہیں جانتی اور نہ ہی میں اس کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہوں، میں اپنے کلاس فیلو قیصر سے پیار کرتی ہوں، وہ بھی ہماری طرح امیر خاندان سے تعلق رکھتا ہے، میں تو شادی اس کے ساتھ کروں گی، اس لیے ابھی وقت ہے منگنی کی رسم ادا نہ کی جائے، آپ عادل کے گھر والوں کو جواب دے دیں ورنہ بعد میں پچھتاؤں گے، آپ آج ہی انکار کر دیں اور ان کو کہہ دیں کہ آج کے بعد وہ ہمارے گھر نہ آئیں ورنہ میں کوئی ایسا قدم اٹھا لوں گی کہ آپ کی ناک بھی کٹ جائے گی۔“

آسیہ کے ماں باپ اور بھائی نے اسے سمجھانا چاہا، مگر اس نے ان کی ایک نہ چلنے دی اور دھمکی دی کہ اگر انہوں نے اس کی بات نہ مانی اور اگر اسے مجبور کیا گیا تو وہ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔

اس کے ماں باپ نے جب آسیہ کے خطرناک تیور دیکھے تو وہ سوچ میں پڑ گئے، انہوں نے آج تک آسیہ پر سختی نہ کی تھی بلکہ اسے لاڈ اور پیار ہی دیا تھا اور اب وہ کسی قیمت پر آسیہ کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے، انہوں نے عادل کے والدین کو کھلوایا کہ وہ نہیں بے رشتہ منظور نہیں ہے، اس لیے آپ لوگ منگنی کی رسم ادا

کرنے نہ آئیں۔ اجمل عادل سے بے حد شرمندہ تھا لہذا دونوں میں بات چیت ختم ہی ہو گئی، عادل کو یہ دکھ تھا کہ پہلے اجمل نے خود ہی کی مٹی اور اب خود ہی انکار بھی کر دیا ہے۔ عادل نے اپنے طور پر اندازہ لگایا کہ بیٹا لڑکی میں کوئی خامی ہوگی یا پھر وہ کسی اور سے محبت کرتی ہوگی، منگنی کا سن کر وہ اپنے چاہنے والے کے ساتھ فرار ہو گئی ہوگی۔



آسیہ کی ماں نے اسے کہا کہ وہ ان کو کسی دن قیصر سے ملائے تاکہ وہ اس کے فیصلے کی توثیق کر سکیں، آسیہ نے جب قیصر کو بتایا کہ میرے والدین میری کسی جگہ منگنی کرنا چاہتے تھے مگر میں نے محض تمہاری خاطر انکار کر دیا اور دھمکی دی کہ اگر انہوں نے میری بات نہ مانی تو میں گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی، تو تب جا کر ان کا فیصلہ تبدیل ہوا ہے۔ اب تمہیں کسی دن میرے گھر چلنا ہوگا، میں تمہیں اپنے گھر والوں سے ملوانا چاہتی ہوں، بلکہ وہ خود تم سے ملنا چاہتے ہیں۔

قیصر کے دل میں تو پہلے ہی کھوٹ تھا، جس کا آسیہ کو اندازہ ہی نہ ہو سکا تھا۔ وہ تو آسیہ کے جسم سے پیار کرتا تھا اور وہ اس سے شادی کے معاملہ میں سنجیدہ نہ تھا، اب تو اسے اور بھی یقین ہو گیا کہ آسیہ تو اس کی خاطر بہت کچھ کرنے کو تیار ہے، وہ بہانوں سے اسے ناتواں اور اس کے گھر نہ گیا مگر آسیہ کو سلی دیتا رہا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ہمراہ اس کے گھر اس کا ہاتھ مانتے گا۔

آسیہ قیصر کی مصنوعی محبت پا کر نہال ہو رہی تھی، ان کی محبت کی آڑ میں قیصر نے آسیہ کی محبت کا بھرم توڑ ڈالا، محبت ہوس میں بدل گئی، مگر آسیہ نے کوئی احتجاج نہ کیا، کیونکہ اسے یقین تھا کہ قیصر اس سے شادی ضرور کرے گا مگر یہ اس کی بھول تھی، آسیہ محبت

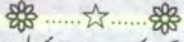
میں اس قدر اندھی ہو گئی کہ وہ اچھے بُرے کی تمیز ہی نہ کر سکی، دونوں نے بی بی اے فائل کا امتحان پاس کر لیا۔ قیصر نے کچھ دنوں بعد آسیہ کو بتایا کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ جا رہا ہے، جہاں بریڈ فورڈ یونیورسٹی میں اس کو داخلہ مل گیا ہے، وہ دو سال بعد واپس لوٹے گا اور آتے ہی اس سے شادی کر لے گا۔

قیصر کے انگلینڈ جانے کا سن کر آسیہ کے ارمانوں پر بجلی ٹوٹ پڑی۔ وہ قیصر کے سینے سے لگ کر رونے لگی کہ وہ اسے اس طرح چھوڑ کر نہ جائے، وہ اس کے بغیر زندہ نہ رہ سکے گی اور اگر وہ جانا ہی چاہتا ہے تو منگنی کی رسم ادا کر کے جائے تاکہ میں اس احساس کے تحت زندہ رہ کر تمہارا انتظار کروں کہ تم میرے ہوں اور میں تمہاری ہوں۔ اس کے بغیر وہ زندگی نہ گزار سکے گی، میں انتظار کی سولی پر لٹک کر مر جاؤں گی، اس لیے قیصر تم مجھے اس طرح چھوڑ کر مت جاؤ۔

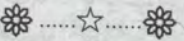
مگر قیصر نے چٹنی چڑی باتیں کر کے آسیہ کو رام کر لیا کہ وہ منگنی جیسی فضول رسموں کا قائل نہیں ہے، دو سال ہی کی تو بات ہے، تم اس دوران ماسٹر کر لو، میں اپنا کورس مکمل کر کے آؤں گا اور پھر دھوم دھام سے تمہارے ساتھ شادی کروں گا۔

آسیہ نے نہ چاہنے کے باوجود قیصر کی بات مان لی، قیصر انگلینڈ روانہ ہو گیا، اس نے آسیہ سے وعدہ کیا کہ وہ اسے فون کرتا رہے گا اور خط بھی لکھا کرے گا، یوں ہی جھوٹی تسلیاں دے کر وہ چلا گیا۔ آسیہ اس کے خط اور فون کے انتظار میں دن گنتے لگی، قیصر کا صرف ایک خط آسیہ کے نام آیا، جس میں اس نے اپنی خیریت کی اطلاع دی تھی اس کے بعد اس کا کوئی خط نہ آیا۔ آسیہ روزانہ ہی اس کے فون اور خط کا انتظار کرتی مگر بے سود۔ یہ انتظار طویل تر ہونے لگا مگر

اس کی ساس نے آہستہ آہستہ پیار اور محبت سے اسے باور چچی خانے کا کام سکھانا شروع کر دیا۔ شادی کچھ ماہ بعد جوادی تبدیلی کی دوسرے شہر میں ہو گئی پہلے تو وہ اکیلا ہی گیا پھر وہاں سیٹ ہونے کے بعد اس نے آسیہ کو بھی بلالیا۔ اس کے والدین نے بھی اعتراض نہ کیا اور آسیہ کو جانے دیا تاکہ جواد کو کھانے وغیرہ کی تکلیف نہ ہو۔



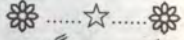
آسیہ کو اب کچھ سکون اور تنہائی ملی تو قیصر کی یادوں نے اس کو شام شروع کر دیا وہ اندر ہی گھلنے لگی کہ قیصر نے اس کی محبت کا نہ صرف مذاق اڑایا بلکہ اسے بدنام بھی کر ڈالا۔ اس کے من میں تو اب بھی قیصر کی محبت کی چنگاری سلگ رہی تھی وہ لاکھ اس کی یادوں اور بے وفائی سے پیچھا چھڑانا چاہتی مگر وہ ایسا نہ کر پائی قیصر اس کے من میں سے نہ نکل سکا۔ وہ جوادی محبت دیکھتی تو قیصر کو بھول جاتی مگر جب اکیلی ہوتی تو قیصر کی یادیں اسے گھیر لیتیں۔



یوں ہی دو سال بیت گئے قیصر اپنی تعلیم مکمل کر کے وطن لوٹ آیا یہاں آ کر اسے آسیہ کی یاد آئی جب اسے معلوم ہوا کہ آسیہ کی شادی ہو گئی ہے تو اسے کچھ بھی ملال نہ ہوا وہ خاموش رہا اور اپنی دنیا میں مگن ہو گیا لیکن وہ پھر بھی ایک بار آسیہ سے ملنا چاہتا تھا اس کے اندر کا شیطان ایک بار پھر بیدار ہو گیا تھا ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ آسیہ کو بھول جاتا مگر ایسا نہ ہوا کچھ لوگوں کے ضمیر اس قدر مرمہ ہوتے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت اور سائنس کا کوئی فارمولا ان کے ضمیر کو اجاگر نہیں کر سکتا۔ قدرت ان کے ضمیر پر تالے لگا دیتی ہے یہی حال قیصر کا تھا کہ اس نے آسیہ کی تلاش شروع کر دی اور پھر ایک دن وہ آسیہ کے گھر جا پہنچا۔

شرافت اور نیک نیتی کی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ منگنی کی رسم ادا کرنے کے بجائے شادی کا پروگرام طے ہو گیا۔ آسیہ کے ماضی کے بارے میں ان لوگوں کو بے خبر رکھا گیا اور یہ بتایا گیا کہ آسیہ ان کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی ہے وہ نانہ لقمہ میں پلی ہے کوئی دکھ اور پریشانی اس نے نہیں دیکھی بلکہ خوشیوں کے جھولوں میں جھولا جھول کر جوان ہوئی ہے آسیہ کے والدین نے جواد اور اس کی ماں کو کہا کہ وہ بھی آسیہ وہی چاہت اور محبت دیں جس کی وہ بچپن سے عادی چلی آ رہی ہے۔

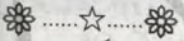
جواد کے والدین نے ان کو یقین دلایا کہ آپ بے فکر رہیں ہم آسیہ کو بہن نہیں بلکہ اپنی بیٹی سمجھیں گے کیونکہ ہمارے بیٹے تو ہیں مگر بیٹی کوئی نہیں ہے اور اب آسیہ بہن ہو اور بیٹی کی کمی پورے کرے گی۔



جواد اور آسیہ کی شادی ہو گئی آسیہ اب کی بار خاموشی سے ڈولی میں بیٹھ گئی تھی اور جوادی بیوی بن کر اس کے گھر چلی آئی۔ جواد نے اسے خاوند کا بھرپور پیار دیا اور اس کا ہر طرح سے خیال رکھا جواد کے والدین نے بھی آسیہ کو سگی بیٹی سے بھی بڑھ کر چاہ لیا آسیہ کو اتنی محبت اور چاہت ملنے کی امید نہ تھی وہ تو سمجھتی تھی کہ ان لوگوں کو اس کے ماضی کے بارے میں علم ہوگا اور یہ لوگ اسے بہو کا حقیقی مقام نہ دیں گے مگر اس کے واسطے غلط ثابت ہوئے۔ آسیہ کی ماس نے روایتی ساس کا کردار ادا نہ کیا بلکہ ایک ماں بن کر آسیہ کا خیال رکھا وہ تو آسیہ کو گھر کا کوئی کام بھی نہ کرنے دے رہی تھیں خود آسیہ بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ کوئی کام نہ کرے کیونکہ اسے گھر کے کاموں خاص کر خانہ داری اور کھانے پکانے کا فطری تجربہ نہ تھا۔ وہ تو صرف کھانا جاتی تھی پکانا اس کے بس کا روگ نہ تھا مگر

میں ہی نہیں بلکہ محلہ میں بھی پھیل چکا تھا۔ غیاث الدین تو اب گھر سے باہر ہی نہ نکلتے تھے اب ان کو احساس ہوا تھا کہ یہ سب ان کے اپنے گناہوں کی سزا ہے جو پورے خاندان کو مل رہی ہے۔ اتنی دیر اب ان کی بدنامی کے اس داغ کو نہ دھو سکتی تھی اور اجمل الگ پریشان تھا اور وہ بھی یہ چاہتا تھا کہ آسیہ کی شادی کہیں بھی ہو جائے تاکہ وہ بھی سکھ کا سانس لے سکے۔

کافی سوچ بچار کے بعد ان کی نظر انتخاب پھر عادل پر جا بٹھری۔ عادل اب کلاس ویلن آفیسر بن چکا تھا مگر ابھی تک اس نے شادی نہ کی تھی۔ اجمل اب اس دفتر میں کام نہیں کرتا تھا بلکہ کسی اور جگہ اس نے ملازمت کر لی تھی اجمل نے تو ماں باپ کو کہہ دیا وہ اب کسی صورت میں بھی عادل سے اس سلسلہ میں بات نہیں کرے گا۔ غیاث الدین میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ اب وہ عادل کے گھر جائیں اور اس کے والدین کا سامنا کر سکیں اس لیے انہوں نے عادل کے خیال کو دل سے نکال دیا۔



محلہ میں لوگوں کے گھروں میں کام کرنے والی ایک عورت نصیراں کو اس سلسلہ میں اعتماد میں لیا گیا کہ وہ آسیہ کے لیے کوئی بہتر اور مناسب رشتہ تلاش کرے۔ اسے انعام کا لالچ وغیرہ دیا گیا دو ماہ بعد اس عورت کی وساطت سے ایک جگہ آسیہ کا رشتہ طے پا گیا۔ لڑکے کا نام جواد تھا اور وہ ایک ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھا خاندان نہ زیادہ امیر تھا اور نہ ہی غریب لیکن جواد ایک مختاری شریف اور مخلص نوجوان تھا محلہ کے لوگ اسکول کے اساتذہ اور طلباء جواد کے بہت ہی مداح تھے اور اس کی بہت تعریفیں کرتے تھے اور یہ حقیقت تھی کہ جواد ان لوگوں میں سے تھا جن کی

قیصر نے پلٹ کر آسیہ کی خبر نہ لی آسیہ نے قیصر کے بتائے ہوئے ایڈریس پر کئی خط لکھے مگر کوئی جواب نہ ملا۔ آسیہ نے اب اگلی کلاس میں داخلہ لے لیا تھا اور گھر والوں کو بتا دیا تھا کہ قیصر دو سال کے لیے انگلینڈ چلا گیا ہے اب اس کے واپس آنے پر ہی اس کی شادی ہوگی۔

کالج میں بھی اب آسیہ کھوئی کھوئی رہنے لگی۔ تین ماہ بعد قیصر کا گناہ ظاہر ہونا شروع ہو گیا جس کی اس کے گھر والوں کو بھی خبر ہو گئی آسیہ کا کالج جانا بند کر دیا گیا۔ گھر میں سب اسے تحارت بھری نظروں سے دیکھنے لگے مگر آسیہ اب بھی قیصر سے امیدیں لگائے بیٹھی تھی کہ وہ ایک دن ضرور آئے گا مگر اس کے ساتھ ساتھ اسے احساس گناہ چپین نہیں لینے دے رہا تھا۔ اپنی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے اس کی ماں نے ہزاروں روپے خرچ کر کے ایک ایڈری ڈاکٹر کی خدمات حاصل کر کے اس گناہ سے چھٹکارا حاصل کیا۔ اب اس کا کالج جانا اور گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا گیا۔ یوں ہی ایک سال گزر گیا آسیہ اب بڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی گھر والے اس سے نفرت کرنے لگے تھے۔ وہ آسیہ جو ماں باپ کی لاڈلی بیٹی تھی جس کی معمولی سی تکلیف پر گھر میں کہرام مچ جاتا تھا سرد رہ جاتا تو ڈاکٹر کی لائن لگ جاتی تھی جس کی ہر ناجائز خواہش بھی منوں میں پوری کی جاتی تھی وہی آسیہ اب ان کے لیے بوجھ بن گئی مگر پھر بھی اولاد والا وہی ہوتی ہے۔ بوجھ بن جائے تو ماں باپ اس بوجھ کو چاہنے کے باوجود بھی پھینک نہیں سکتے۔ غیاث الدین راشدہ اور اجمل اب آسیہ کی وجہ سے بہت پریشان تھے وہ اب جلد از جلد اس کی شادی کر دینا چاہتے تھے کیونکہ آسیہ کی بے راہروی کی بات اور قیصر کی نشانی کا قصہ اب صرف رشتہ داروں

آسیہ گھر میں اکیلی تھی، جواد اسکول میں تھا، آسیہ نے قیصر کو برسوں بعد اپنے سامنے دیکھا تو اس کی مُردہ انگلیوں میں جان پڑ گئی اس کے گلشن کے مرجھائے ہوئے پھول پھر سے کھل اٹھے۔ آسیہ اور قیصر ایک دوسرے کے گلے لگ گئے اور آسیہ ہلک ہلک کر رونے لگی اور روتے ہوئے اس سے کہنے لگی۔

”قیصر! یہ تم نے کیا کیا؟ اتنا عرصہ تم کہاں غائب رہے نہ ٹیلی فون اور نہ خط لکھا۔ میں تمہاری یادوں کے دیپ جلا کر اندھیری راہوں میں تمہارا انتظار کرتی رہی مگر تم نہ آئے میرے دامن میں رسوائیوں اور بدنامیوں کا طوق ڈال کر دور چلے گئے اور مجھے ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا، تو میرے گھر والوں نے میرا جینا حرام کر ڈالا۔ میں نے تمہیں کئی خط لکھے مگر تم نے کسی کا بھی جواب نہ دیا، کیوں قیصر کیوں.....؟

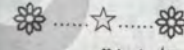
قیصر نے فوراً آسیہ کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور بڑی معصوم صورت بنا کر التجا یہ لہجے میں کہنے لگا۔ ”آسیہ! مجھے معاف کر دو، میں بھٹک گیا تھا میں وہاں کی رنگینیوں میں کھو کر اپنی چاہت کو بھلا بیٹھا وہ میری بھول تھی میری غلطی تھی میں اب واپس اس دنیا میں لوٹ آیا ہوں۔“ آسیہ نے قیصر کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور ان کو چومنے لیے۔ ایسے جیسے قیصر ہی اس کا دیوتا ہو کافی دیر گلے شکوے ہوئے آسیہ کہنے لگی۔

”قیصر! تم آگے ہو تو میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے مگر اب آگے کیا ہوگا؟ میں جواد کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی میں تمہاری تھی اور اب بھی تمہاری ہی رہوں گی۔ قیصر تم مجھے اپنا نہ کا وعدہ کر دو تو میں جواد سے دامن چھڑا لوں گی۔“

”آسیہ! میں اب تمہارا ہوں اور تمہارا ہی رہوں

گا۔ تم جواد سے طلاق لے لو تو میں تم سے شادی کر لوں گا۔“ قیصر نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔ ”مگر جواد مجھے طلاق نہیں دے گا کیونکہ وہ مجھے بہت چاہتا ہے۔“ آسیہ نے ناامیدی سے کہا۔ ”سوچ لو اب نجات حاصل کرنا تمہارا کام ہے میں ہر طرح سے تمہاری مدد کروں گا۔“ قیصر نے اسے یقین دہانی کرائی۔

”تم وعدہ کرو کہ تم اب مجھے تنہا نہیں چھوڑو گے تو پھر دیکھنا میں تمہارے لیے کیا کچھ کر سکتی ہوں۔“ آسیہ نے بھی اسی انداز میں کہا۔ قیصر کہنے لگا۔ ”آسیہ میری جان! میں وعدہ کر چکا ہوں، تمہیں پانے کے لیے تو یہاں تک آپہنچا ہوں۔“ قیصر آسیہ کو یقین دلا کر اس کے من میں آگ لگا کر چلا گیا۔



پھر یہ سلسلہ چل نکلا، قیصر دس پندرہ دن بعد آسیہ سے ملنے کے لیے آئے لگا۔ محلہ کے لوگوں کو شک گزرا تو انہوں نے بات جواد کے گوش گزار کر دی۔ جواد کو یقین نہ آیا بلکہ وہ ان لوگوں کو جھوٹا قرار دینے لگا کہ میری بیوی نہایت ہی شریف اور پاک باز ہے مگر وہ لوگ نہ مانے جواد نے ان لوگوں سے کہا کہ اب اگر ایسا ہو تو وہ مجھے اسکول اطلاع بھیج کر بلا لیں۔

پھر وہی ہوا اس دن قیصر آسیہ سے ملنے آیا تو محلہ والوں نے اسکول سے جواد کو بلا لیا۔ جواد نے آسیہ اور قیصر کو محبت کی دنیا میں گم دیکھا، تو وہ غصہ سے کھول اٹھا محلہ والے ٹھیک ہی کہتے تھے اسے یقین آ گیا۔ قیصر اور آسیہ مجرم بنے سہم کر رہ گئے۔ جواد نے قیصر سے کہا۔

”میں نہیں جانتا تم کون ہو؟ مگر اتنا ضرور جان گیا ہوں کہ تمہارے اور آسیہ کے ماضی میں بھی تعلقات

رہے ہوں گے مگر اب یہ میری بیوی ہے، میری عزت اور غیرت ہے۔ میں چاہوں تو تمہیں یہاں ہی زندہ درگور کر سکتا ہوں، قانون کے حوالے کر سکتا ہوں مگر میں شریف اور غیر متد انسان ہوں، اپنی بدنامی اپنے اچھوتوں مول نہیں لے سکتا۔ نکل جاؤ اس گھر سے اور آئندہ ادھر کا رخ نہ کرنا، ورنہ میں دو جانوں کا قاتل بن جاؤں گا۔“

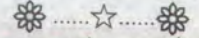
قیصر نے کچھ بھی نہ کہا اور چپ چاپ ان کے گھر سے نکل گیا۔ اب گھر میں آسیہ اور جواد کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ جواد نے آسیہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں لاکھوں شکوے اور سوال تھے جب کہ آسیہ سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑی تھی۔ جواد نے باہر کے دروازے کی کنڈی لگادی آسیہ اب منتظر تھی کہ جواد جو اس وقت غصہ میں ہے اسے مارے پیٹے گا اور اس کا حشر کر دے گا لیکن ایسا نہ ہوا جواد نے آسیہ پر نہ ہاتھ اٹھایا اور نہ ہی غصے کا اظہار کیا بلکہ وہ آرام اور خل سے آسیہ کو سمجھانے لگا۔

”آسیہ! میں بہت ہی فرخ دل اور سچا انسان ہوں، تمہیں شاید علم نہ ہو مگر میں آج تمہیں بتا رہا ہوں کہ مجھے یہ معلوم تھا کہ کالج کے دور میں تم کسی لڑکے سے محبت کرتی تھیں اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بھی مجھے معلوم ہے۔ اس کے باوجود میں نے تم پر ترس کھا کر شادی کر لی اور تمہارے ماضی کو تمہاری بھول سمجھ کر بھلا دیا، میں نے تمہارے ماضی کو اسی دن دفن کر دیا تھا جس روز تم میری بیوی بنی تھیں کیونکہ مجھے اپنی ذات پر اعتماد تھا اور ہے کہ میرا بے لوث پیار تمہیں تمہارا ماضی کبھی یاد نہ کرنے دے گا۔ اسی لیے میں نے تم سے پیار سے بڑھ کر پیار کیا۔ میرے ماں باپ نے تمہیں صرف بہو ہی نہیں بلکہ بیٹی کا مقام دیا، صرف اس لیے کہ تم ماضی کو بھلا کر حال کی دنیا میں

زندہ رہو اور مجھے یہ یقین تھا کہ تم نے ماضی کو بھلا دیا ہوگا مگر یہ میری بھول تھی تم نے میری تمام تر چاہتوں اور محبتوں کو پل بھر میں روند ڈالا ہے۔ تم اپنے ماضی اور اپنے چاہنے والے کو نہیں بھلا سکتی ہو۔ یہ تمہاری پہلی غلطی اور بھول ہے جو میں تمہیں معاف کر رہا ہوں، بھول جاؤ اپنے ماضی اور اپنے چاہنے والوں کو اور اسے کہہ دو کہ وہ آئندہ اس گھر میں ہرگز قدم نہ رکھے اور تم بھی اسے خوابوں اور خیالوں سے نکال دو۔ اب تم میری بیوی ہو، میری عزت ہو، میری غیرت ہو۔ میں آج تمہیں معاف کر رہا ہوں مگر اس معافی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں بزدل ہوں، نہیں ہرگز نہیں ہر انسان کے اندر ایک بہادر اور غیر متد انسان بستا ہے اور پائت جب غیرت کی آجائے تو وہ بہادر انسان جاگ اٹھتا ہے اور پھر طوفان اٹھتے ہیں خون کے دریا بہہ جاتے ہیں۔ تم کو مجھ سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں نے تمہیں معافی مانگے بغیر ہی معاف کر دیا ہے۔ تمہارا ماضی میں پہلے ہی بھلا چکا ہوں، میرے دل میں اب بھی تمہارے لیے بے پناہ پیار ہے اور میں اس میں کمی نہ آنے دوں گا مگر آئندہ کے لیے میں تمہیں خبر دار کر رہا ہوں کہ میری برداشت کا مزید امتحان لینا۔ مہرہ غیرت کو مت لٹا کر نافرمانی میں کچھ کر گزروں گا، جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ جو ماضی میں تمہارا نہ بن سکا اب وہ تمہارے کس کام آئے گا، میں بتا دوں تم میری غیرت ہو، میں تمہیں کبھی طلاق نہیں دوں گا یہ خیال تم دل سے نکال دو۔“

جواد یہ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا، شام تک وہ اسی کمرے میں بند رہا پھر دُری ہوئی نچی کو بھلا گئے کے لیے آسیہ کو باہر گھمانے لے گیا۔ دونوں نے مل کر فلم دیکھی رات کا کھانا ہوٹل میں کھایا، اس

طرح جواد نے آسہ کو یقین دلانا چاہا کہ اب اس کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں ہے اس نے آسہ کو دل سے معاف کر دیا تھا آسہ بھی خوش ہو گئی مگر اس کے من سے کھوٹ نہ گئی تھی۔ اس نے قیصر کو بھلانا چاہا مگر نہ بھلا سکی اس نے تو یہ سوچا تھا کہ جواد کو جب ان دونوں کے تعلقات کا علم ہوگا تو وہ اسے غصہ میں آ کر طلاق دے دے گا۔ مگر جواد نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ کسی صورت میں بھی اسے طلاق دے گا۔



یوں ہی دن گزرنے لگے جواد کا رویہ آسہ کے ساتھ دیا ہی رہا جو اس سے پہلے تھا اس نے اپنی جاہت اور محبت میں کمی نہ آنے دی لیکن اس کے برعکس آسہ جواد سے نجات حاصل کرنے کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ قیصر اب پھر اس سے ملنے کے لیے آنے لگا تھا۔ مگر اب گھر کی بجائے وہ پارکوں اور ہوٹلوں میں ملنے لگے۔ آسہ اتنی بد بخت لگی کہ جواد کے اندھے اعتماد کو پھر سے دھوکا دینے لگی اس کے دل میں جواد کے لیے محبت کی بجائے نفرت کا لاوا پھوٹنے لگا۔ وہ اب جواد کے ساتھ ایک دن بھی رہنے کو تیار نہ تھی۔ قیصر کی باتوں کے جال میں وہ اس قدر کچھ کر گئی کہ وہ اچھے بھلے کی تیز بھلائی تھی۔ شاید اس کے مقدر میں ہی اندھیرے لکھے تھے اس کی تقدیر ہی کھوئی تھی کہ وہ محبت و وفا اور ایثار کے پیکر جواد کی قدر نہ کر رہی تھی۔

یہ تو وہ جانتی تھی کہ جواد اسے طلاق تو کسی صورت میں بھی نہ دے گا۔ اس لیے وہ اس سے آزادی حاصل کرنے کے لیے ایسی تدبیریں سوچنے لگی اس نے جواد کو راستے سے ہٹانے کے لیے خطرناک منصوبے بنانے شروع کر دیئے اور پھر ایک دن آسہ اور قیصر نے جواد کو ختم کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا۔ آسہ

جو ایک طرف وفا کی دیوی بن کر وفا نبھانے پر تیار تھی تو دوسری طرف وہ ایک ڈانٹ بن کر ایک زندگی ختم کرنے کے درپے ہو گئی۔ انہوں نے ایک بھیا نک منصوبہ بنایا۔

اس روز 23 مارچ تھا پورے ملک میں عام تعطیل تھی جو اوج اٹھا نماز پڑھی اور پھر سو گیا۔ آسہ اپنے منصوبہ کے مطابق جاگ رہی تھی جواد کے دوبارہ سوجانے پر وہ اٹھی باورچی خانے سے مٹی کے تل کا ڈبہ اور ماچس اٹھائی اور پھر اس نے ظلم کی انتہا کر دی اس نے مٹی کا تیل جواد اور اس کے بستر پر گرا کر آنا فانا آگ لگا دی اور خود گھر سے باہر نکل کر بھاگ اٹھی۔ آگ لچھوں میں بھڑک اٹھی جواد کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے وہ اپنی جان بچانے کی خاطر باہر بھاگ نکلا اور شور مچانے لگا۔ محلہ کے لوگ اس کی آواز سن کر دوڑے آئے اتنے میں جواد بے ہوش ہو کر زمین پر گر چکا تھا۔ لوگ اسے گاڑی میں ڈال کر فوراً اسپتال لے گئے آسہ کو محلہ کے لوگوں نے پکڑ لیا تھا۔ خوف کی شدت اس کے چہرے سے عیاں تھی کہ اتنا بھیا نک کھیل اسی نے کھیلا ہے اس نے اقرار کر لیا کہ جواد کو آگ اسی نے لگائی ہے لوگوں نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ پولیس کی تحویل میں آنے کے بعد جب آسہ سے محبت کا خمیر اترتا تو وہ بیچھٹانے لگی کہ اس نے جوش اور انتقام میں آ کر غلط قدم اٹھایا ہے اب وہ جواد کی زندگی کی دعا میں مانگنے لگی کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ اگر جواد کو کچھ ہو گیا تو وہ بھی عبرتناک سزا سے نہ بچ سکے گی اور جس مقصد کے لیے اس نے جواد کو راہ سے ہٹانا چاہا تھا وہ کبھی پورا نہ ہوگا بلکہ اب تو وہ زندگی بھر اندھیروں میں بھٹکتی رہے گی۔

ادھر جواد اسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش

میں مبتلا تھا اس کا جسم بڑی طرح جھل چکا تھا۔ ڈاکٹر اس کو بچانے کی سرکوشش کر رہے تھے مگر پھر بھی اس کے بچنے کی امید کم تھی۔ پولیس انسپٹر اس کا بیان لینے اسپتال پہنچا تو جواد نے بڑی مشکل سے اپنا بیان دیا اور کہا۔

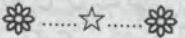
”انسپٹر صاحب! میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ میری بیوی کا کیا بھرا ہے مگر میں پھر بھی اس کو کوئی الزام نہیں دوں گا۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ آسہ کو رہا کر دیں۔ میں نے اسے معاف کر دیا ہے اور معافی ہی سب سے بڑا انتقام ہوتی ہے اس نے جو کچھ کیا اس کی سزا اس کو قدرت ضرور دے گی۔ آپ آسہ کو چھوڑ دیں اور یہ سمجھ لیں کہ میں نے خود اپنے آپ کو آگ لگائی ہے۔“ اس بیان کے بعد جواد کی حالت مزید خراب ہو گئی اور وہ زندگی سے ناتہ توڑ گیا۔

جواد کے بیان کی روشنی میں آسہ کو رہا کر دیا گیا اور اسے بتادیا گیا کہ جواد نے اسے معاف کر دیا ہے۔ آسہ کو یہ امید ہی نہ تھی کہ وہ اتنی جلدی پولیس کے ظلم و ستم سے نجات پالے گی۔ کاش وہ جواد کے احسان کا بھرم رکھتی اور اس کی قبر سے لپٹ کر جان دے دیتی تو جواد کی روح کو قور آ جاتا۔ مگر وہ بد بخت ایسا نہ کر سکی اور قیصر کے پاس جا پہنچی۔ اس نے قیصر کو جواد کی موت کی خبر دی اور کہا کہ اب میں آزاد ہوں اب ہماری راہ میں کوئی دیوار نہیں رہی۔ میں تمام بندنہن اور رشتے توڑ کر اور چھوڑ کر آ گئی ہوں مجھے سمیٹ لو قیصر! مجھے اپنالو۔“ قیصر نے آسہ کی جانب ایسے دیکھا جیسے وہ اسے جانتا ہی نہ ہو اور پھر بے رحمی سے بولا۔

”آسہ! تم..... تم..... پر اب مجھے کوئی بھروسہ اور اعتماد نہیں رہا جو عورت اپنے وفا دار شوہر کو قتل کر سکتی

ہے وہ اپنے محبوب کو بھی راستے سے ہٹا سکتی ہے۔ اب تم تو ایک قاتلہ ہو اور میں ایک قاتلہ سے کیسے شادی کر سکتا ہوں! جاؤ نکل جاؤ اس گھر سے۔ میں کسی آسہ کو نہ جانتا تھا اور نہ جانتا ہوں۔“

آسہ قیصر کی بے رحمی دیکھ کر پتھر کا بت بن گئی اور بھٹی بھٹی نظروں سے قیصر کو دیکھنے لگی اور پھر قیصر نے آسہ کے لیے اپنے گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے۔ آسہ روٹی اور تڑپتی ہوئی وہاں سے نکلی اور سوچنے لگی میں کتنی لاڈلی اور ضدی تھی۔ میرے والدین نے میری ہر خواہش پوری کی اسی لاڈ اور پیار نے مجھے آج یہاں لا کھڑا کیا ہے جہاں میں گھر کی رہی ہوں اور نہ گھاس کی۔ اسے جواد کی محبت اور اس سے اپنی نفرت یاد آئی اور پھر ان ہی سوچوں میں گھر کر وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی آسہ پاگل ہو گئی۔



آج اس سانحہ کو پندرہ سال بیت گئے ہیں آسہ کے ماں باپ اس دنیا میں نہیں رہے آسہ کا اب کوئی گھر اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ اب تو اس کے سر میں چاندی جھلملانے لگی ہے۔ سردی ہو یا گرمی دن ہو یا رات وہ کچھیری روڈ اور سول لائن کی سڑکوں پر پھر پھرتی نظر آتی ہے۔ بال اچھے ہوئے پھنے پرانے کپڑے سردی اور گرمی سے بے نیاز وہ آوارہ گردی کرتی رہتی ہے اس کی زبان سے گندی گالیاں نکلتی ہیں وہ اپنے آپ کو اور قیصر کو گالیاں دیتی ہے۔ لوگ اسے دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔

◆

گنگا پری

ایہ حمید

جب بھی بارش اور جنگلات کے ساتھ ہندوستان کا تذکرہ آتا ہے، 'نہن' میں صرف اور صرف ایک ہی شخصیت کا تصور اور پیکر چھن سے اتر آتا ہے وہ تصور اور پیکر محترم لے حمید کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے، ان کے بارے میں نئے افق کے منیر اور معروف کہانی کار اظہر کلیم مرحوم فرمایا کرتے تھے۔ لے حمید بارش کی منتظر کشی کرتے ہیں تو کمرے میں بند قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ باہر بارش نہانپ برس رہی ہے اور جب وہ قہقہہ کا نکر کرتے ہیں تو قہقہہ کی خوشبو چاروں طرف پھیلی محسوس ہوتی ہے۔ نوسرے لفظوں میں وہ جانوگر تھے جو اپنی تحریر کے نریعے پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔ زیرِ نظر ناول بھی لے حمید کا سفر نامہ جنوبی ہند ہے۔ جس میں آپ کو ایٹونچر سسپنس کے ساتھ معصوم محبتوں کے فسانے بھی ملیں گے۔

پاروتی نے پراسرار دیہاتی کی گھڑی باندھ کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔
”میری چھٹی حس کہتی ہے کہ اس آدمی کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ آخر اس نے صرف تمہاری شکل دیکھنے سے کیسے اندازہ لگالیا کہ تم مسلمان ہو؟“
تھوڑا بہت شک میرے دل میں بھی تھا لیکن میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے فساد زدہ علاقے میں ہم دونوں کو ایک طرف سہمے بیٹھا ہوا دیکھ کر قیاس لگایا ہو کہ ہم مسلمان ہیں اور چونکہ وہ خود مسلمان ہے اس لیے اسے ہم سے ہمدردی پیدا ہوگئی ہو۔ جب میں نے اس خیال کا اظہار پاروتی سے کیا تو وہ بولی۔
”تم بہت سیدھے سادے آدمی ہو۔ میرے ساتھ رہ کر اتنی مصیبتیں اٹھانے کے بعد بھی تمہیں آدمی کی پہچان نہیں آئی۔ بہر حال ہمیں اس آدمی سے ہوشیار رہنا ہوگا۔“
”وہ تو ہم ضرور ہوشیار رہیں گے۔“
پاروتی نے مجھے مشورہ دیا کہ میرے پاس جو رقم حکومت کی ہے۔ ہندو اب ہندوستان کے مسلمانوں پر

سے اس کا بدلہ لے رہے ہیں۔“
پراسرار دیہاتی نے کہا۔ ”ہندو شروع ہی سے مسلمانوں کا دشمن رہا ہے۔ ہندوستان کا کون سا ایسا شہر ہے جہاں ہوئی اور شبِ برات کے موقع پر فساد نہیں ہوتا۔ ہندو تو مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان پہنچانے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے۔“

اس دوران پراسرار دیہاتی نے لفافے میں سے پوریاں، کچوریاں اور آلوی نکال کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ یہ خاص ہندو کھانا تھا۔ جو کبھی بھی مجھے اچھا نہیں لگا تھا مگر اس وقت مجھے بڑی بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں نے پاروتی سے کہا۔ ”کیا تم نہیں کھاؤ گی؟“

مجھے معلوم تھا کہ ناگن بن جانے کی شکتی حاصل کر لینے کے بعد پاروتی کھانے پینے اور سونے سے آزاد ہو چکی ہے۔ وہ بولی۔ ”مجھے بھوک نہیں ہے تم لوگ کھاؤ۔“

”بیٹی یہ کھا کر دیکھو۔ یہ تو خاص مقرر کا تحفہ ہے۔ یہ میں مسلمان کی دکان سے لایا ہوں۔“

پاروتی نے مجبوراً کچوری لے کر کھالی۔ کچوریاں بڑی مصالحہ دار تھیں۔ میں تین چار کھا گیا۔ میں نے دیکھا کہ پراسرار دیہاتی صرف پوریاں کھا رہا ہے۔ کچوری کو اس نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ جب میں نے اسے کچوریاں کھانے کو کہا تو وہ بولا۔

”مجھے حکیم جی نے کچوریاں کھانے سے منع کر رکھا ہے۔ مجھے شوگر کی بیماری ہے۔“

پراسرار آدمی یہ کہہ کر باہر نکل گیا کہ میں پانی لاتا ہوں۔ اس کے جانے کے بعد میں نے پاروتی سے کہا۔

”ہم خواہ مخواہ اس پر شک کر رہے تھے۔ یہ تو بڑا نیک دل آدمی ہے۔“

پاروتی نے جمائی لی۔ میں نے کہا۔
”تمہیں تو نیندا آ رہی ہے۔ یہ کیسے ہو گیا؟“

پاروتی نیند بھری آواز میں بولی۔
”معلوم نہیں بڑی نیندا آ رہی ہے۔“

اور وہ وہیں ایک طرف کو لڑھک گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سیدھا کیا۔ وہ یا تو سو رہی تھی یا بیہوش ہو گئی تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اچانک میرا سر چکرایا اور اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو میرے اس پاس گھپ اندھیرا تھا۔ میرا سر ابھی تک بھاری تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے پاروتی کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اب مجھے اندھیرے میں دھندلا دھندلا دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں نہ پاروتی تھی نہ ہی وہ پراسرار دیہاتی تھا۔ میں نے ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھا۔ زمین پر پوری اور کچوریوں کے خالی پتے اور لفافہ پڑا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ پراسرار دیہاتی نے کچوریوں میں بیہوشی کی دواملانی ہوئی تھی جس کی وجہ سے میں اور پاروتی بیہوش ہو گئے۔ وہ ضرور کوئی خاص قسم کا سانپوں کا ماہر سپیرا تھا۔ جس نے پاروتی کو پہچان لیا تھا کہ اس عورت میں ناگن بن جانے کی شکتی ہے۔ اسی لیے وہ ہمارے تعاقب میں لگ گیا تھا اور ایک خاص منصوبہ بنا کر وہ پاروتی کے بیہوش ہو جانے کے بعد اسے اٹھا کر لے گیا۔ ذرا میرا سر ہلکا ہوا تو میں کھنڈر سے باہر آیا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ دور دور تک اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مجھے اپنی چھپائی ہوئی رقم کا خیال آ گیا۔ میں دوڑ کر کھنڈر میں آیا۔ کونے میں پتھر ہٹا کر دیکھا۔ وہاں رومال میں بندھی ہوئی ساری رقم موجود تھی۔ نوٹ اور

ریز گاری رومال میں سے نکال کر اپنے کرتے کی اندر والی خاص جیب میں رکھی اور سوچنے لگا کہ مجھے اس پر اسرار دیہاتی کو کہاں تلاش کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے اس نے سب جھوٹ بولا تھا کہ وہ گوالیار جا رہا ہے۔ اور وہاں گاؤں گاؤں پھر کر چوڑیاں اور عورتوں کے سنگھار کی چیزیں فروخت کرتا ہے۔ مجھے پراسرار دیہاتی کی گھڑی یاد آگئی۔ میں واپس کھنڈر میں گیا اور جھک کر پاؤں ادھر ادھر چلاتے ہوئے اندھیرے میں اس کی گھڑی تلاش کرنے لگا۔ وہ مجھے ایک طرف پڑی ہوئی مل گئی۔ میں اسے باہر لے آیا اسے ایک بار پھر کھول کر دیکھا۔ ستاروں کی مدہم روشنی میں مجھے گھڑی میں سوائے کانچ کی چوڑیوں اور دوپٹوں کے اور کچھ بھی نہ ملا۔ میں نے گھڑی کو وہیں ایک طرف پھینک دیا اور سوچنے لگا کہ اس آدمی نے ہمیں دوپہر کے وقت کچوریاں کھلا کر بے ہوش کیا تھا اور اس وقت رات ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ تو اب تک بے ہوش پاروٹی کو لے کر کہیں کا کہیں نکل چکا ہوگا۔ ظاہر ہے پاروٹی بے ہوش ہی ہوگی۔ ہوش میں آنے کے بعد تو وہ ناگن بن کر ایک سینکڑ میں میں اس آدمی کو ہلاک کر سکتی تھی اور واپس بھی آ جاتی۔ اگر وہ اب تک کھنڈر میں واپس نہیں آئی تو اس کا مطلب ہے کہ یا تو وہ ابھی تک بے ہوش ہے یا اس آدمی نے اسے مزید بے ہوشی کی کوئی دوائی پلا دی ہوگی یا انجکشن لگا دیا ہوگا۔ اگر مجھے رات کے وقت ہوش آتا تھا تو یقیناً پاروٹی کو بھی اس وقت ہی ہوش آیا ہوگا۔ اگر پراسرار دیہاتی پاروٹی کو مزید دوائی یا انجکشن لگا کر بے ہوش نہیں کر سکا تو پاروٹی ضرور اب تک ناگن بن کر اسے ہلاک کر چکی ہوگی اور ممکن ہے کہ میرے پاس واپس کھنڈر میں چلی آ رہی ہو۔ مگر وقت کافی نکل گیا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس وقت

وہ آدمی بے ہوش پاروٹی کو کسی لاری یا ریل گاڑی میں ڈال کر کہاں پہنچ چکا ہو۔ وہ لاری یا ریل گاڑی کے مسافروں کو یہ کہہ کر مطمئن کر سکتا تھا کہ یہ میری بیمار بیٹی ہے۔ بے ہوش ہوگئی ہے۔ اسے دوسرے شہر کی خاص اسپتال میں علاج کے لیے لے جا رہا ہوں۔ میں ایک دورا بے پرا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرف جاؤں۔ آخر یہی فیصلہ کیا کہ مجھے کھنڈر میں کچھ دیر رک کر پاروٹی کا انتظار کر لینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے اس نے ہوش میں آنے کے بعد ناگن بن کر پراسرار دیہاتی کو ہلاک کر ڈالا ہو اور اب ناگن کے روپ میں یا عورت ہی کی شکل میں کھنڈر کی طرف واپس چلی آ رہی ہو تاکہ مجھ سے دوبارہ آ کر مل جائے اور مجھے اپنی رو داد سنائے۔ پاروٹی کے ساتھ جو گزری تھی وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ بعد میں جب پاروٹی نے مجھے سارا قصہ سنایا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں ماورائیت کی دنیا میں داخل ہو چکا تھا اور اب عقل کو حیران کر دینے والے واقعات سامنے آ رہے تھے۔ میں وہیں کھنڈر کے باہر ایک طرف بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ رات بڑی جس آلودھی ذرا سی ہوا بھی نہیں چل رہی تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ویسے بھی مجھے اس وقت فساد زدہ شہر کی طرف جاتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ شہر کے کس حصے میں کرنیو لگا ہے کہاں نہیں لگا ہوا۔ سوچا رات اسی کھنڈر میں گزرنی چاہیے دن نکلے تو واپس لاری کے اڈے پر جا کر معلوم کروں گا کہ یہ پراسرار آدمی کون تھا۔ شاید وہاں ایک آدھ ایسا آدمی مل جائے جو اسے جانتا ہو۔ کیونکہ اب میرا جھانسی کی طرف جانا بیکار تھا۔ پاروٹی کے بغیر میں جھانسی جا کر کیا کرتا۔

کسی نہ کسی طرح کبھی اونگھ کر کبھی اٹھ کر ٹپکتے ہوئے میں نے رات گزاری۔ آسمان صبح کی روشنی پھیلنا شروع ہوئی تو میں کھنڈر سے نکل کر تھرا شہر کی طرف چل پڑا۔ جس طرف سے وہ آدمی ہمیں لے کر آیا تھا میں اسی راستے سے ہوتا ہوا ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ یہاں دیکھا کہ اسٹیشن کے باہر اندر سیکڑوں مرد عورتیں بچے بوڑھے ہجوم کی شکل میں بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ تھرا شہر کے مسلمان ہیں جو بلوائی ہندو سکھوں سے کسی طرح جانیں بچا کر گھروں سے بھاگ کر اسٹیشن پر آ گئے ہیں اور دوسرے شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔

سڑکوں پر ہندوؤں کی ٹولیاں راشٹریہ گیت گاتی گز رہی تھیں۔ میں نے ایک رکشا والے سے کہا۔ ”بھیا مجھے گوالیار والے لاری اڈے پر پہنچا دو۔“ وہ بولا۔ ”دس روپے لوں گا۔“ میں نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اسے دیا اور کشتے میں بیٹھ گیا۔ وہ کہنے لگا۔ ”شہر کے اندر بلوہ ہو رہا ہے۔ باہر سے لے کر جانا ہوگا۔“

وہ شہر کے باہر والی سڑک پر سے ہوتا ہوا خدا جانے کون کون سے راستوں سے رکشا نکال کر آخر اسی لاری اڈے پر پہنچ گیا جہاں میں نے پہلی بار اس پراسرار آدمی کو دیکھا تھا۔ لاری اڈے پر بھی مسافروں کا کافی رش تھا۔ ظاہر ہے یہ سب مسلمان تھے جو جان بچا کر ہندوؤں کے متعصب ترین شہر تھرا سے جانیں بچا کر دوسرے شہروں کو بھاگ رہے تھے۔ میں اس جگہ پر آ گیا جہاں وہ پراسرار آدمی بیٹھا گلاس میں چائے پی رہا تھا۔ قریب ہی چائے کا کھوکھا تھا جہاں پان سگریٹ بھی بکتے تھے۔ اوپر ہندی اور اردو میں لکھا تھا۔ ”جنمنا داس پان سگریٹ شاپ۔“

میں نے ہندو بن کر کھوکھے والے کو نمسکار کیا اور کہا۔ ”مہاراج! کل یہاں ایک آدمی زمین پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کے پاس ایک گھڑی بھی تھی۔ کیا آپ کو پتہ ہے وہ کون آدمی تھا؟“ میں نے یونہی اللہ توکل اس سے یہ سوال پوچھ لیا تھا۔ کیونکہ لاری اڈے پر دن میں سیکڑوں آدمی چائے پینے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ دکاندار کس کو یاد رکھ سکتا ہے۔ میری توقع کے خلاف کھوکھے والے ہندو لالے نے گلاس میں سچ بھلاتے ہوئے پوچھا۔ ”مجھ میں اس سے کیا کام ہے بھیا؟“

مجھے امید کی کرن نظر آئی۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔ ”مہاراج! بات یہ ہے کہ کل میں نے اسی لاری اڈے پر اس آدمی سے اپنی بیٹی کے لیے چاندی کی چار چوڑیاں خریدی تھیں۔ گھر جا کر معلوم ہوا کہ وہ تو لوہے کی چوڑیاں ہیں۔ ان پر چاندی کا پانی پھرا ہوا ہے۔“ کھوکھے والا ہنس کر بولا۔

”وہ بڑا نوسر باز چلتے باز ہے۔ بھیا تم مارے گئے۔ اب وہ تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا۔“

میں نے لہجہ بڑا عازانہ بنا کر کہا۔ ”مہاراج! وہ مجھ سے دھوکہ کر کے پچاس روپے لے گیا ہے اگر آپ اس کا کوئی اتہ پتا بتادیں تو میں اس سے ایک ایک پانی وصول کر لوں گا۔“ کھوکھے والا ایک گاہک سے بھی گفتگو کر رہا تھا۔ میری طرف تھوڑی دیر کے لیے متوجہ ہو کر بولا۔

”بھیا! اس کا نام رام داس ہے۔ وہ پہلے شہر کی گلیوں میں سانپوں کا تماشا دکھایا کرتا تھا۔ یہ دھندلانہ چلاتا وہ اصلی نعلی چوڑیاں لگی لگی بیچنے لگا۔ مجھے اس کے ٹھکانے کا پتہ نہیں۔ تم ایسا کرو کہ یہاں سے کوئی پور کو جو سڑک جاتی ہے اس کے دسویں یا گیارہویں میل پر

ایک ڈھکا ہوا کنواں آتا ہے۔ وہاں گنیش جی کا چھوٹا سامندر ہے۔ اس کے پجاری سے رام داس کا پوچھ لینا شاید وہ ہمیں اس چلتے باز کا کوئی انتہہ بتا دے۔“ میرے لیے یہ کافی سے زیادہ معلومات تھیں۔ میں نے لاری اڈے پر ہی چائے اور پوریوں کا ناشتہ کیا اور پوچھتا پوچھتا پھر اسے جو کوئی پور کو سڑک جانی تھی اس پر آ گیا۔ یہ چھوٹی پختہ سڑک تھی۔ دونوں طرف درخت تھے۔ ان کے پیچھے بادیاں تھیں۔ دس گیارہ میل کا سفر تھا۔ میں نے ایک تانگہ کرایا اور اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ آسمان صاف تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ تانگہ سڑک پر ایک خاص رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ یہ تانگہ لاہور کے تانگوں کی طرح کا نہیں تھا بلکہ یکہ تھا جس پر سفر کرنا اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کے برابر تھا لیکن سڑک پختہ تھی اس لیے جکولے زیادہ نہیں لگ رہے تھے۔

دسویں گیارہویں میل کے درمیان ڈھکا ہوا کنواں آ گیا۔ یہ ایک بڑا سا گول کنواں تھا جس پر چھت ڈالی ہوئی تھی۔ ایک طرف سے اس کا منہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ وہاں گدی بچھا کر ایک ہندو لالہ بیٹھا لوگوں کو پانی پلاتا تھا۔ قریب ہی برگد کے گنے درخت کے پہلو میں چھوٹا سامندر تھا۔ مندر کے باہر کئی ایک جٹا دھاری جوگی جسم پر اکھٹل کر بیٹھے سلفہ وغیرہ پی رہے تھے۔ عورتیں ان کی حلوہ پوری سے سیوا کر رہی تھیں۔ ان میں سے دو ایک سا دھو بالکل ننگے تھے۔ میں مندر کے پجاری کا پوچھ کر اس کے پاس پہنچا۔ میں نے وہاں اپنے آپ کو ہندو ظاہر کیا۔ پجاری کی توند واقعی بہت موٹی اور منکے کی طرح پھولی ہوئی تھی۔ وہ پینٹل کی لٹیا پاس رکھے مورنی کے پاس بیٹھا پوجا کرنے والوں سے پیسے وصول کر کے انہیں گیندے کا ایک ایک پھول دیتا جاتا تھا۔ جب میں نے اسے

ذرا فارغ دیکھا تو اس کے پاس جا کر ہندوؤں کی طرح نمسکار کیا اور کہا۔ ”مہاراج! میں گوالیار سے آیا ہوں۔ رام داس چوڑی والے کو ملنا چاہتا ہوں۔ میرے بیٹا کی تخت بیمار ہیں۔ رام داس چوڑی والے کے بارے میں سنا ہے کہ اس کے پاس جوڑوں کے درد کی بڑی اچھی دوائی ہے۔ مجھے اس کا پتہ بتادیں۔ آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔“ پجاری نے گول گول آنکھیں گھما کر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ پھر مورنی کے اوپر رتن جو کے پھولوں کا ہار چڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اسی رام داس کا پوچھتے ہو جو ناگی بھی ہے؟“ ناگی سے اس کا مطلب سپرے سے تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ہاں مہاراج اسی رام داس کا پوچھ رہا ہوں۔“ پجاری نے کہا۔

”اس کا کوئی ٹھکانہ تو ہے نہیں۔ کبھی کبھار ادھر سے گزرتا ہے تم ایسا کرو بھیا یہاں سے اتر کی طرف جاؤ۔ آگے سڑک کی بائیں جانب مڑ جانا۔ رانی کی حویلی آئے گی۔ وہاں سپیروں کے کچھ جھونپڑے ہیں۔ رام داس نہیں وہیں ملے گا۔“ میں نے پجاری کو دھنہار کہا کہ اس کا شکریہ ادا کیا اور سڑک پر آ کر شمال کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دور چلا ہوں گا کہ جس کی وجہ سے پسینے میں شرابور ہو گیا۔ وہیں درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ ایک سوار پول والا یکہ ادھر سے گزرا تو اس میں سوار ہو گیا اور کوچان سے کہا۔ ”بھیا جی! مجھے رانی کی حویلی کے پاس اتار دینا۔“ دیہانی ٹائپ کی سوار پول نے مجھے غور سے دیکھا۔ خدا جانے رانی کی حویلی میں کون سی پراسرار بات تھی۔ یکہ ٹک ٹک کرتا حرکت پر رواں تھا۔ میں

اگلی سیٹ پر دو سوار پولوں کے درمیان سمٹ کر بیٹھا تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد مجھے بائیں جانب ویران سے علاقے میں کچھ درختوں کے درمیان ایک پرانی عمارت نظر آئی۔ یکے والے نے یکہ روک دیا اور کہا۔ ”وہ سامنے رانی کی حویلی ہے بھیا۔“ میں یکے سے اتر کر درختوں کے اس جھنڈ کی طرف چلا جن کے درمیان پرانی عمارت نظر آ رہی تھی۔ پجاری نے کہا تھا کہ اس حویلی کے پاس کچھ جھونپڑیاں ہیں وہیں پراسرار دیہاتی یعنی رام داس آتا جاتا ہے۔ حویلی کھنڈر بن چکی تھی۔ بارش اور دھوپ نے شکستہ دیواریں سیاہ کر دی تھیں۔ بڑے دروازے کے دونوں پٹ غائب تھے اور دیواروں کے ساتھ ساتھ اونچی گھاس اگ رہی تھی۔ میں حویلی کے قریب سے گزرا تو اندھیری ڈیوڑھی میں سے ایک کالی بلی نکل کر درختوں کی طرف بھاگ گئی۔ حویلی کے پیچھے مجھے نیم کے درختوں کے نیچے تین چار جھونپڑیاں دکھائی دیں۔ قریب گیا تو ایک بڑی جھونپڑی کے باہر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ ذرا پسے دو عورتیں برتن دھو رہی تھیں۔ یہ لوگ خانہ بدوش قسم کے تھے۔ میں نے بوڑھے کو نمسکار کیا۔ اس نے بھوس اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ”کیا بات ہے بابو کس سے ملنا ہے؟“ میں نے رام داس کا نام بتایا تو بوڑھے نے حویلی کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہاں حویلی میں دیکھو۔ وہ کل آیا تھا۔ حویلی میں تھوڑی دیر رہا پھر چلا گیا۔ کیوں کیا بات ہے؟ رام داس تو سپیرا ہے۔ اس سے ہمیں کیا کام پڑ گیا بابو؟“ میں نے کہا۔ ”بس ایک ضروری کام پڑ گیا تھا۔ کچھ معلوم ہے وہ کدھر گیا ہوگا؟“ بوڑھے نے سر ہلایا۔ ”کچھ معلوم نہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ اکیلا آیا تھا یا اس کے ساتھ کوئی عورت بھی تھی؟“ بوڑھا مزے سے ناریل پی رہا تھا۔ بولا۔ ”اکیلا تھا۔ عورت اس کے پاس کہاں سے آئے گی؟“ میں نے سوچا کہ حویلی کے کھنڈر میں چل کر دیکھنا چاہیے۔ شاید وہاں پاروئی کا کوئی سراغ مل جائے۔ میں حویلی کی طرف چل پڑا۔ حویلی جتنی باہر سے خستہ حال تھی اس سے زیادہ اندر سے بوسیدہ اور ویران تھی۔ میں صرف اس خیال سے وہاں چلا آیا تھا کہ پراسرار دیہاتی اگر یہاں آیا تھا تو پاروئی بھی بے ہوشی کی حالت میں اس کے پاس ہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے وہاں کوئی کھوج مل جائے۔ حویلی کی کوٹھریوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کسی کوٹھری کا دروازہ سلامت نہیں تھا۔ ایک طرف سیڑھیاں اوپر کی منزل کو جاتی تھیں۔ میں بڑے غور سے جائزہ لیتا سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل میں آ گیا۔ یہاں ایک دالان تھا۔ فرش اکھڑا ہوا تھا۔ ایک طرف برآمدہ تھا۔ پیچھے دو کوٹھریاں نظر آئیں جن میں سے ایک کا دروازہ غائب تھا۔ دوسری کوٹھری کا دروازہ نہ تھا۔ دروازہ کھولا تو اندر سے لوبان کی تیز خوشبو آئی۔ کوٹھری میں اندھیرا تھا۔ دروازہ کھولنے سے دالان کی تھوڑی سی روشنی اندر پڑی۔ کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ کوٹھری میں مٹی کے دو مشکوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ نہ مشکے درمیانے سائز کے تھے اور ان کے منہ کپڑا لپیٹ کر بند کیے ہوئے تھے۔ میں ایک مشکے کے پاس آ کر اسے جھک کر دیکھنے لگا۔ مشکے کے منہ پر کپڑا خوب کس کر باندھا گیا تھا۔ اس کے گرد سی باندھ کر اسے مزید مضبوط کر دیا گیا تھا۔ میں نے مشکے کو ہلایا کہ کہیں اس کے اندر کوئی پرانا خزانہ نہ ہو۔ مگر اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ میں

دوسرے مٹکے کے پاس آ گیا۔ اسے بھی ہلا جلا کر دیکھا۔ اندر سے مٹکے خالی نکلتے تھے۔ اگر اندر کوئی شے ہوتی تو ہلانے جلانے سے ضرور آواز پیدا ہوتی مگر کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں کوٹھری سے نکل کر واپس دالان میں آیا تو مجھے سپڑھیوں میں دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ دونوں آدمی باتیں کرتے اوپر آ رہے تھے۔ وہاں چھپنے کے لیے سوائے منکوں والی کوٹھری کے اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں دوڑ کر کوٹھری میں آ گیا۔

کوٹھری میں اوپر چھت کے ساتھ چھوٹی سی دوچھتی بنی ہوئی تھی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور اچھل کر دوچھتی پر چڑھ کر اس کے اندر سمٹ سنا کر بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ دونوں آدمی دالان میں سے گزر کر اوپر حویلی کی چھت کی طرف چلے جائیں گے۔ مگر وہ سیدھے اسی کوٹھری کی طرف آئے جس کی دوچھتی میں چھپا ہوا تھا۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ دالان کی روشنی میں میں نے دو دیہاتی قسم کے کالے رنگ کے آدمیوں کو دیکھا جنہوں نے سروں پر گیروے صافے باندھ رکھے تھے۔ کندھوں پر سپیروں والے جھولے لٹک رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بین تھی۔ دونوں سپیرے لگ رہے تھے۔ وہ کوٹھری کے اندر آ کر منکوں کے پاس بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا۔

”دروازہ تو بند کر دو۔“

دوسرے سپیرے نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند کرنے سے دالان کی روشنی جو اندر آ رہی تھی رک گئی اور کوٹھری میں اندھیرا چھا گیا۔ میں بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ مجھے ڈر بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ اگر ان لوگوں کو میری موجودگی کا علم ہو گیا تو خدا جانے میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ دونوں سپیرے بٹے کٹے تھے۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا

کہ یہ کوٹھری میں کیا کرنے آئے ہیں۔ اندھیرے میں اب وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اسے میں ایک سپیرے نے دوسرے سے کہا۔

”ارے گنگوادیاتو جلا لے۔“

پھر ماچس کی تیلی جلانے کی آواز آئی۔ کوٹھری میں جلتی ہوئی دیا سلائی کی روشنی ہوئی۔ سپیرے نے چراغ نکال کر سامنے رکھ لیا تھا۔ اس نے چراغ روشن کر دیا۔ میں سانس روکے یہ ساری کارروائی خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جس سپیرے نے چراغ جلا یا تھا وہ بین کو پکڑے سے صاف کرنے لگا۔

دوسرے سپیرے نے پہلے ایک مٹکے کا منہ کھولا۔ اندر ہاتھ ڈالا تو سانپ کی پھنکار کی آواز نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ اس نے ہاتھ مٹکے سے باہر نکالا تو ایک کالے رنگ کا سانپ اس کی کلائی سے لپٹا ہوا تھا۔ اسی طرح اس نے دوسرے مٹکے کا منہ کھول کر اندر ہاتھ ڈالا اور اس میں سے بھی سانپ نکال لیا۔ پھر دونوں سانپوں کو اس نے زمین پر چھوڑ دیا۔ دونوں سانپ زمین پر آتے ہی کنڈلی مار کر ایک دوسرے کے قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ پہلے سپیرے نے بین بجائی شروع کر دی۔ دوسرا سپیرا رومال سے دونوں سانپوں کو چھیڑنے لگا۔ دونوں سانپوں نے پھنکارتے ہوئے اپنے پھن کھول دیئے اور بین کی آواز یا بین کے ادھر ادھر لہرانے پر جھپٹنے لگے۔

سانپ جھومتے ہوئے کبھی ایک دوسرے کے ساتھ لگ جاتے، کبھی ایک سانپ دوسرے سانپ کے گرد چکر لگانے لگ جاتا۔ یہ کھیل کوئی دس پندرہ منٹ تک جاری رہا۔ مجھے دوچھتی میں کھس کر بیٹھے بیٹھے پسینہ آنے لگا تھا۔ اب میں پہلے سے زیادہ خوف زدہ تھا۔ کیونکہ پکڑے جانے کی صورت میں یہ لوگ مجھ پر سانپ چھوڑ سکتے تھے اور وہاں میری لاش کو بھی کوئی

پوچھنے والا نہیں تھا۔ جب سانپوں کو نچانے اور رجھانے کا کھیل ختم ہوا اور سپیرے نے بین بجائی بند کر دی اور دوسرے سپیرے نے سانپوں کو اٹھایا اور باری باری منکوں میں بند کر کے اوپر پکڑا لپیٹ دیا پھر دونوں جلتے ہوئے دیئے کے پاس بیٹھ گئے اور بیڑیاں نکال کر پینے لگے۔ ایک سپیرے نے کہا۔

”چچو بھائی! رام داس قسمت کا بڑا دھنی نکلا۔ سنا ہے ناگن ماتا کی کوئی ناگن عورت اس کے ہاتھ لگ گئی ہے۔“

دوسرے سپیرے نے بیڑی کا کش لگا کر کہا۔

”سنا تو میں نے بھی ہے۔ پر یقین نہیں آیا۔ کہاں رام داس چورا چکا سپیرا اور کہاں ناگن ماتا کی ناگن عورت.....“

پہلے سپیرے نے کہا۔

”ارے رام داس تو ہمیشہ میں اہلیا بانی کی چھتری والی سادھی میں چلے کاٹ رہا ہے کہ ناگن عورت کی شکتی اس میں آ جائے۔“

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ مجھے کبھی یقین نہیں تھا کہ اس ویران حویلی کی دوچھتی میں چھپے چھپے گوہر مراد مل جائے گا اور پراسرار دیہاتی سپیرے اور پاروئی کا سراغ معلوم ہو جائے گا۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر ان کی باتیں سننے لگا۔ مگر اس کے بعد وہ کچھ دیر بیٹھ کر دوسرے سپیروں کی باتیں کرتے رہے اور پھر دیا بھجا کر دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ وہ دروازہ بند کر گئے تھے۔ میں دوچھتی سے نیچے اتار اور سوچنے لگا کہ یہ ہمیشہ کہاں ہے جہاں اہلیا بانی کی چھتری والی سادھی ہے کیونکہ پاروئی کی تلاش میں اب مجھے وہاں جانا تھا۔

میں حویلی سے نکلا اور تھرا اکو جانے والی سڑک پر

آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں سے ایک سواریوں والے یکے میں بیٹھ کر تھرا شہر واپس آ گیا۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ہمیشہ نام کا شہر کہاں ہے جہاں اہلیا بانی کی چھتری والی سادھی ہے۔ یہ معلومات مجھے ریلوے اسٹیشن سے ہی مل سکتی تھیں۔ چنانچہ میں تھرا کے ریلوے اسٹیشن پر آ گیا۔ وہاں انکواری سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ یہ تھیں کہ پہلے مجھے کھنڈوہ جانا پڑے گا۔ وہاں سے کھرگون جانا ہوگا۔ کھرگون میں دریائے نربدا کے کنارے سے ریاست بلکر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ ریاست کی سرحد پر پہلا شہر ہمیشہ آتا ہے۔ اسی شہر کے باہر ایک پہاڑی پر اہلیا بانی کی چھتری والی سادھی ہے۔ یہاں ایک پرانا قلعہ بھی ہے۔ ریلوے کے انکواری کلرک نے بتایا کہ کھنڈوہ جانے والی گاڑی شام کو چھپے دلی سے آئے گی۔ جتنی معلومات کی مجھے ضرورت تھی وہ مجھے مل گئی تھیں۔ سب سے پہلے مجھے کھنڈوہ جانا تھا۔ ست بڑا کے جنگلاتی علاقے میں واقع یہ شہر میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میں وہیں اسٹیشن پر ہی بیٹھ گیا۔ دوپہر کا کھانا بھی اسٹیشن پر ہی کھایا۔ اسٹیشن پر اب قدرے امن وامان تھا۔ فسادات کی وجہ سے شہر کے جو مسلمان خاندان گھر بار چھوڑ کر اسٹیشن پر آ گئے تھے وہ دوسرے شہروں کو جا چکے تھے۔

اسٹیشن پر بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی۔ ٹکٹ والی کھڑکی کھل گئی۔ میں نے تھرا سے کھنڈوہ تک کا تھڑا کلاس کا ٹکٹ لے لیا اور جس پلیٹ فارم پر گاڑی کو آنا تھا وہاں آ کر گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ کم بخت گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ تھی۔ میں بیٹھا رہا۔ آخر شام کے کوئی سات سو سات بجے گاڑی آئی۔ گاڑی میں بہت زیادہ رش تھا۔ دلی میں بھی فسادات شروع ہو چکے تھے۔ وہاں سے اور آس پاس کے علاقوں سے

مسلمان بھاری تعداد میں بمبئی کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ میں بھی ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا۔ مٹھرا سے کھنڈوہ تک کا بڑا لمبا سفر تھا۔ راستے میں گوالیار آیا، جھانسی آیا، بھوپال آیا، ہوشنگ آباد آیا۔ اس طرح سفر کرتے کرتے گاڑی ایک رات اور ایک دن کے سفر کے بعد دوسرے دن رات کے ایک بجے جا کر کہیں کھنڈوہ پہنچی۔ اس طرف حالات بڑے پرسکون تھے۔ مشرقی پنجاب دلی اور مٹھرا کے مقابلے میں یہاں کافی امن امان تھا۔ اگرچہ ہندوستان کے آزاد ہو جانے کی یہاں بھی خوشیاں منائی جا رہی تھیں مجھے ہندوستان اور اس کی آزادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی میں تو پاروٹی کی تلاش میں وہاں آیا تھا اور اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ خدا کرے جہاں میں جا رہا ہوں وہ مل جائے۔ انٹیشن پر سے ہی میں نے کھرگون اور ہمیشور شہر کے بارے میں معلوم کیا کہ وہاں سے کتنے فاصلے پر ہیں۔ مجھے ساری معلومات مل گئیں۔ مجھے کھنڈوہ سے بس میں سفر کر کے کھرگون اور وہاں سے ہمیشور پہنچنا تھا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔

میں وہیں مسافر خانے میں ایک طرف پڑ کر سو گیا۔ صبح کافی دن چڑھے آنکھ کھلی۔ ریلوے کے ریفریشمنٹ روم کے غسل خانے میں جا کر نہایا۔ انٹیشن کی کینٹین پر آ کر تھوڑا بہت کھایا پیا اور پتہ کرتے کرتے اس لاری اڈے پر آ گیا جہاں سے کھرگون اور ہمیشور کو بٹیس جاتی تیں۔ یہ پرانی قسم کی کھرکھڑانا پ کی لاریاں تھیں ان کی چھتوں پر بھی مسافر بیٹھ جاتے تھے۔ ایک بس کھرگون قصبے کی طرف جا رہی تھی۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ آدھ گھنٹے بعد کھرگون پہنچا۔ وہاں سے ایک دوسری بس پکڑی اور دریائے نربدا کے کنارے پرآباد ہمیشور پہنچ گیا۔

یہ ریاست بلکر کا ایک بڑا قصبہ تھا۔ شہر نہیں تھا۔ کچے کے مکان تھے۔ آبادی ٹیلوں پر اور ٹیلوں کے دامن میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ قصبہ اپنے پرانے قلعوں اور محلوں اور باولیوں کے کھنڈرات کی وجہ سے بہت مشہور ہے اور سارا سال سیاح یہاں آتے رہتے ہیں۔ میں نے اہلیابائی کی سادھی کا ایک آدمی سے پوچھا۔ اس نے دور ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”وہ چھتری دیکھ رہے ہوں۔ بس وہی اہلیابائی کی چھتری والی سادھی ہے۔“

یہ سادھی ایک پہاڑی پر واقع تھی اور راستہ درختوں کھیتوں میں سے ہو کر جاتا تھا۔ میں اسی وقت سادھی کی طرف چل پڑا۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر بنے ہوئے مکانوں کی چھتیں ٹین کی تھیں۔ کہیں کہیں سرخ کچیریل کی ڈھلوان چھتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ میں پیدل چلا جا رہا تھا۔ کھیت ختم ہوئے تو جنگلی جھاڑیاں شروع ہو گئیں پھر درختوں کے جھنڈ آ گئے۔ ان کے آگے دریائے نربدا ابھد رہا تھا۔ اس دریا کو وہاں نربدا ندی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ دریا کا پاٹ ہمارے پنجاب کی کسی بڑی نہر جتنا ہی تھا۔ اس دریا کو وہاں نربدا ندی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ دریا کا پاٹ ہمارے پنجاب کی کسی بڑی نہر جتنا ہی تھا۔ اس دریا کو وہاں نربدا ندی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ دریا کا پاٹ ہمارے پنجاب کی کسی بڑی نہر جتنا ہی تھا۔ اس دریا کو وہاں نربدا ندی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ دریا کا پاٹ ہمارے

پہاڑی کی چڑھائی شروع ہو جاتی تھی جس کے اوپر اہلیابائی کی سادھی تھی۔ پہاڑی کی چوٹی پر سادھی کی چھتری دکھائی دے رہی تھی۔

پہاڑی چھوٹی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹے میں میں اوپر پہنچ گیا۔ یہ سادھی وہاں کے لوگوں کے مطابق راجہ

بلکر کی بیوی کی تھی مگر اس کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی۔ یہ صدیوں پرانی عمارت تھی۔ عمارت کی ایک جانب چھوٹا سا میوزیم بھی تھا جہاں شخصے کے ٹوکیوں میں نوادرات رکھے ہوئے تھے۔ سیاح ان کی تصویریں اتار رہے تھے۔ میں بہت محتاط ہو کر چل پھر رہا تھا۔ اگر پراسرار دیہاتی پسیرا یہاں موجود تھا تو وہ مجھے دیکھ کر وہاں سے فرار بھی ہو سکتا تھا اور پاروٹی جس حالت میں بھی اس کے ساتھ تھی وہ اسے اپنے ساتھ بھاگ کر لے جاسکتا تھا۔ میں سیاحوں کے درمیان چہرہ چھپانے کی کوشش کرتا ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں سوائے غیر ملکی سیاحوں اور دو ایک گارڈز کے اور کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ اگر پراسرار پسیرا رام داس یہاں آچکا ہے تو وہ کہاں ہوگا؟ یہاں کوئی جگہ ایسی ہے کہ جہاں وہ پاروٹی کی طاقت حاصل کرنے کے لیے چلے کاٹ رہا ہے؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے اور ان کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بہر حال مجھے پراسرار پسیرے کو ہر حالت میں تلاش کرنا اور اس کے قبضے سے پاروٹی کا آزاد کرنا تھا۔ میں عمارت کی پچھلی طرف آ گیا۔ یہاں پہاڑی کی ڈھلان کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا سا گلی نما راستہ سادھی کی عمارت کے شمال کی طرف کسی قلعے کے کھنڈر کی طرف جاتا تھا۔ اس راستے کی دونوں جانب پتھر کی مورتیاں ستادہ تھیں۔ یہ ساری کی ساری مورتیاں بڑی ڈراؤنی تھیں۔ ان کی شکلیں غیر انسانی تھیں۔ ایک مورتی کی پتھر کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ میرے دل میں اس مورتی کو توڑنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ میں وہیں رک گیا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا کہ وہاں کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا۔ یہ تنگ راہ داری ساری خالی پڑی تھی۔ میں نے مورتی کی زبان کو ہاتھ

سے پکڑ کر کھینچا۔ مگر وہ تو پتھر کی تھی اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلی۔ فرش پر ایک جگہ پتھر بڑا تھا۔ میں نے پتھر اٹھالیا۔ سوچا سب سے پہلے اس کا فرمورٹی کی زبان توڑتا ہوں۔

میں نے پتھر زور سے مورتی کی زبان پر مارا۔ مورتی کی زبان اس ضرب سے تھوڑی سی ٹوٹ گئی۔ میں دوسری ضرب لگانے لگا تو اچانک مورتی کے پاؤں کے نیچے پتھر کی دیوار کی ایک سل اپنی جگہ سے گڑ گڑا ہٹ کے ساتھ اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ پہلے تو میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا پھر غور سے اس چوکور روشن دان کی طرح کے سوراخ کو دیکھنے لگا جو دیوار میں فرش سے تھوڑا اوپر نمودار ہو گیا تھا۔ میں نے جھپک کر سوراخ کے اندر دیکھا۔ اندر سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں اور وہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے نیچے کوئی تہہ خانہ ہو جہاں پاروٹی بے ہوش یا قید میں پڑی ہو۔ یہ خیال قدرت کی طرف سے میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور سوراخ میں داخل ہو کر دیوار کو پکڑ پکڑ کر دو تین سیڑھیاں نیچے اتر گیا۔ جیسے جیسے نیچے اتر رہا تھا اندھیرا گہرا ہوتا جاتا تھا۔ سیڑھیاں بھی نیچے اترتی جا رہی تھیں میں نے ہمت نہ ہاری۔ دل کو مضبوط کیا۔ دل میں کلمہ شریف پڑھا اور ساری سیڑھیاں اتر گیا۔ میرے پاؤں فرش کے ساتھ ٹکرائے۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ واقعی مجھے اپنے ہاتھ بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں ٹول کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور اندھیرے میں جتنی آنکھیں کھول سکتا تھا کھول کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا مگر مجھے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ سوچا خواہ مخواہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ مجھے واپس چلے جانا چاہیے۔ اوپر دیکھا سیڑھیوں کے اوپر جو روشن دان نما چوکور سوراخ تھا وہ شاید اپنے آپ بند ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس میں سے

پڑتا ہے۔

پاروتی کی آواز نے مجھے ایک دم شیر دل بنادیا۔ میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

”تم کہاں ہو؟“

پاروتی کی آواز آئی۔

”آ جاؤ..... آ جاؤ..... تمہارے خانے میں۔“

وہ رک رک کر بول رہی تھی جیسے اسے بڑی کوشش کر کے بولنا پڑ رہا ہو۔ آواز بھی کسی کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ آگے کوئی دوسرا تہہ خانہ بھی تھا۔ میں دیوار کو ہاتھوں سے ٹوٹا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ایک جگہ دیوار ختم ہو گئی۔ میں وہیں بیٹھ کر ہاتھوں سے ٹوٹنے لگا۔ نیچے ایک اور سیڑھی تھی۔ میں سیڑھیاں اتر گیا۔ یہ پتھر کی سیڑھیاں تھیں اور چار پانچ ہی تھیں۔ سیڑھیاں ختم ہوئیں تو آگے پتھر کا فرش تھا۔

پاروتی کی سسکار کی آواز برابر آ رہی تھی اور میں اسی آواز کی سمت آگے بڑھ رہا تھا۔ میں اندھیرے میں تہہ خانے کے فرش پر پاؤں کے بل بیٹھا تھا۔ میں نے آواز دی۔

”پاروتی! تم کہاں ہو؟ میں تہہ خانے میں پہنچ گیا ہوں۔“

ایک لمبی سسکار کے ساتھ پاروتی کی کمزور اور رکتی ہوئی آواز آئی۔

”میں پٹاری میں بند ہوں۔ میں ناگن کی شکل میں ہوں۔“

میرے خدایا۔ بے اختیار میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اندھیرے میں دیوار کو تلاش کر کے اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ میرے پاؤں فرش پر رکھی کسی چیز سے ٹکرائے۔ میں وہیں بیٹھ گیا اور ہاتھوں کو بڑھا کوٹھولا۔ یہ پٹاری تھی

دن کی روشنی اندر نہیں آ رہی تھی۔ میں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف مڑنے لگا تو مجھے ایسی آواز آئی جیسے کسی نے سسکی بھری ہو۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے مگر میں اندھیرے میں تہہ خانے کی دیوار کے ساتھ لگ کر وہیں کھڑا رہا۔ اچانک دوسری بار پھر سسکی بھرنے کی آواز آئی۔ میں نے سانس روک لیا اور اپنے کان آواز پر لگا دیئے۔ اندھیرا اتنا تھا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ سسکی کس کی ہو سکتی ہے۔ تیسری بار سسکی کی آواز سسکار میں بدل گئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جیسے کوئی سی سی کر رہا ہو۔ پھر سسکاروں کے درمیان پھنکار کی آواز سنائی دی۔

دہشت کے مارے مجھے پسینا آ گیا۔

یہ یقیناً کوئی زہریلا سانپ تھا جس نے اندھیرے میں مجھے دیکھ لیا تھا اور اب سسکارنا پھنکارنا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں تیزی سے اندازہ لگا کر سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ عین اسی وقت مجھے کسی کے گہرا سانس بھرنے اور کسی کو پکارنے کی آواز سنائی دی۔ میرے قدم وہیں رک گئے۔ میں نے آواز پہچان لی تھی۔ یہ پاروتی کی آواز تھی۔ میں نے فوراً بلند آواز میں کہا۔

”پاروتی! تم کہاں ہو؟“

اس اندھیرے تہہ خانے کی چھت یقیناً اوچی تھی۔ کیونکہ میری آواز نے کافی گونج پیدا کی تھی۔ دوسری جانب سے مجھے پاروتی نے کمزور اور نحیف آواز میں میرا نام لیا۔

”انور! انور یہاں آؤ۔“

اب میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ میں نے پاروتی کو اپنا نام انور بتایا ہوا تھا۔ حالانکہ یہ میرا نام نہیں ہے۔ محبت، جنگ اور پردیس میں آدمی کو بہت کچھ کرنا

جس کے اوپر پتھر کی سل رکھی ہوئی تھی۔

”پاروتی! کیا اسی پٹاری میں تم قید ہو؟“

”ہاں۔“ پاروتی نے آنے بھر کر کہا۔

میں نے سئل کو ہٹا دیا۔ پٹاری کے اندر ہاتھ ڈالا۔

میری انگلیاں ایک سانپ کے پچیلے جسم سے ٹکرائیں۔ ساتھ ہی پاروتی کی آواز آئی۔

”آہ انور! بھگوان نے تمہیں میری مدد کے لیے بھیج دیا۔ مجھے یہاں سے نکال کر لے چلو۔ جلدی کرو۔ سپیرا آگیا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

میں نے سانپ کو جو اصل میں پاروتی ناگن کے روپ میں تھی پٹاری میں سے نکال کر اپنی کلائی کے گرد لپیٹا اور اندھیرے میں دیوار کا سہارا لیے راہ بناتا پہلے ایک تہہ خانے سے نکلا پھر دوسرے تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا میرے آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی سوراخ کا دروازہ خود بخود کھل گیا میں مورنی والے چوکور سوراخ میں سے باہر روشنی میں آ گیا۔

تنگ لگی بالکل خالی تھی۔ میں نے دن کی روشنی میں پاروتی کو دیکھا۔ وہ نسواری رنگ کے سانپ کے روپ میں تھی اور نڈھال نظر آ رہی تھی۔ اس کا چھن سٹما ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

”خدا کا شکر ہے پاروتی کہ میں عین وقت پر آ گیا۔ میں اسی دن سے تمہاری تلاش میں تھا جب سے تم رانی کی جولی میں سے غائب ہوئی ہو؟“

پاروتی کہنے لگی۔ ”یہ میری تم سے محبت ہے جس نے مجھے اتنی طاقت عطا کر دی ہے کہ میں ناگن بن کر بھی تم سے انسانی آواز میں بات کر سکتی ہوں۔

ورنہ شروع میں مجھے بڑی دقت پیش آ رہی تھی۔ اب یہاں سے نکل چلو۔“

میں نے اس سے کہا۔

”تم انسانی شکل میں واپس کیوں نہیں آ جاتیں تم

تو عورت سے ناگن اور ناگن سے عورت بن سکتی ہو۔“

ناگن پاروتی نے سرد سسکا کر بھر کر کہا۔

”میری یہ طاقت اس پلیرے نے ختم کر دی ہے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم اب بھی انسانی شکل میں واپس نہیں آ سکو گی۔“

پاروتی کی آواز آئی۔

”یہ ساری باتیں تمہیں پھر کسی وقت بتاؤں گی پہلے یہاں سے بھاگ چلو۔ اور مجھے چھالو۔“

ناگن پاروتی سانپ کی شکل میں فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ لمبی نہیں تھی۔ میں نے اسے ٹھیک کے اندر ڈال کر ٹھیک کے بٹن بند کر لیے۔ پاروتی میری کمر کے گرد لپٹ گئی تھی۔ وہاں سے اہلیا بانی کی سادھی والی عمارت کی طرف آنے کی بجائے میں پتھر کی مورتیوں والی گلی میں آگے چل پڑا۔ آگے ایک چرمانے قلعے کا کھنڈر نظر آ رہا تھا۔ وہاں سے ڈھلان پر بنی ہوئی پتھر کی سیڑھیاں پہاڑی سے نیچے جارہی تھیں۔

میں ان سیڑھیوں پر سے نیچے اترنے لگا۔ اس وقت آسمان پر بادل جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ لگتا تھا کہ بارش ہونے والی ہے۔ میں جس مقصد کی خاطر ہمیشہ آ یا تھا وہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اب وہاں میرا کوئی کام نہیں تھا۔

پاروتی نے ٹھیک کے اندر سے پوچھا۔

”یہ کیوں جگہ ہے؟“

میں نے اسے بتایا کہ ہم اس وقت کھنڈر سے کافی دور دریائے نربدا کے کنارے آباد ہمیشہ ورانہ نام کے شہر میں ہیں اور سپیرے نے اسے پہاڑی پر واقع اہلیا بانی کی سادھی کے کھنڈر کے ایک تاریک تہہ خانے میں قید کیا ہوا تھا۔ پاروتی نے کمزور آواز میں کہا۔

”میرے خدا نے مجھے بچا لیا انور! تمہارا خدا اب

میرا خدا بھی ہے۔ میں نے ہندوؤں کے بھگوان کو چھوڑ دیا ہے۔“

میرے لیے یہ بڑی خوشی کی بات تھی۔ میں نے اسے کہا۔

”خدا تمہیں سیدھی راہ پر ضرور لے آئے گا۔ تم مظلوم اور بے گناہ عورت ہو۔“

میں ساتھ ساتھ پہاڑی پر بنی ہوئی بے ترتیب سیڑھیاں بھی اترتا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”کیا تمہیں اس ذیل سپیرے نے ناگن بنا دیا ہے اگر تم اپنی مرضی سے ناگن بنی ہو تو انسانی روپ میں کیوں نہیں آ تیں؟“

پاروتی نے نفارت بھری آواز میں کہا۔

”میری روح تھکی ہوئی ہے انور! ابھی مجھ سے خدا کے لیے کچھ نہ پوچھو۔ سب سے پہلے مجھے کسی جگہ تھوڑا سا دودھ لے کر پلاؤ۔ مجھ پر سپیرے کے منکروں کا بہت شدید اثر ہے۔“

”فکر نہ کرو۔ میں دودھ کا بندوبست کرتا ہوں۔“

پہاڑی سے نیچے اترنے کے بعد میں اس جانب چلنے لگا جیہر ہمیشہ ورانہ نامی قصبہ یا چھوٹے شہر کی آبادی نظر آ رہی تھی۔ خود مجھے بھی بھوک اور پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ میں آبادی کے ایک چھوٹے سے بازار میں آ گیا۔ یہاں دکانیں کھلی تھیں۔ ایک جگہ مجھے ایک دکان کے باہر ویسٹو بھنڈا رکھا ہوا نظر پڑا۔ یہ چھوٹا سا دیشو ہوٹل تھا جہاں صرف وال بزیں ہی پکیتی تھیں۔ اس وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ ہوٹل ایک دکان کی طرح کا تھا۔ اندر تین میزیں سجی تھیں۔ میں کوئے والی میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ اپنے لیے چاول اور بزی منگوائی اور پاروتی کے لیے دودھ کا ایک کپ بھی منگوا لیا۔ ہوٹل کے ملازم نے مجھ سے پوچھا۔

”صاحب آپ کھانے کے ساتھ دودھ پئے گا۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں یہ میری عادت ہے۔“

نوکر ایک تھالی میں ابلے ہوئے چاول اور بزی ڈال کر لے آیا۔ ساتھ ایک کپ میں دودھ لاکر اس نے میز پر رکھ دیا۔ دکان میں صرف ایک گاہک اس وقت بیٹھا کھانا کھا رہا تھا جس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میں نے دودھ کا کپ فرش پر میز کے قریب ہی رکھا اور پاروتی سے ہستہ سے کہا۔

”میں نے دودھ کا کپ نیچے رکھ دیا ہے۔“

اور موقع دیکھ کر پاروتی کو ٹھیک کے اندر سے نکالا اور چپکے سے نیچے میز کے پاؤں کے پاس رکھ دیا۔ پارٹی کے سانپ نے اپنا منہ کپ میں ڈالا اور دودھ پینا شروع کر دیا۔ میں چاول کھانے لگا۔ خدا کا شکر ہے کہ جتنی دیر تک پاروتی دودھ پیتی رہی ہوٹل کا کوئی ملازم ادھر نہ آیا۔ جب دودھ کا کپ خالی ہو گیا تو میں نے ایک ہاتھ نیچے ڈال کر سانپ کو اٹھایا اور اپنی ٹھیک کے اندر ڈال کر خاموشی سے چاول کھانے میں مصروف ہو گیا۔ سانپ اپنے آپ میری کمر کے گرد لپٹ گیا۔ پاروتی کی آواز آئی۔

”اب مجھے اپنے اندر کچھ توانائی محسوس ہونے لگی ہے۔“

میں نے آہستہ سے کہا۔

”اس وقت میں تم سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔ نوکر ادھر آ رہا ہے۔“

ہوٹل کا ملازم میرے پاس آ کر بولا۔

”صاحب کچھ اور چاہیے؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔۔۔۔۔“

ملازم ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”صاحب دودھ کا کپ کہاں چلا گیا؟“

میں نے جلدی سے نیچے فرش پر سے کپ اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔

طرف بیٹھا اسے دیکھتا رہا کوئی پندرہ بیس منٹ تک وہ راگھ کے گرد چکر لگاتی رہی۔ اس کے بعد اس نے پھن کھول دیا اور راگھ کے پاس منہ لے جا کر زور سے پھنکاری ماری راگھ اڑ کر اس کے جسم پر پڑی۔ پاروتی راگھ میں لوٹ لوٹ ہونے لگی۔ پھر وہ ریشمی ہوئی میرے پاس آئی اور انسانی آواز میں بولی۔
”مجھے میری طاقت واپس مل گئی ہے۔“
اس کے ساتھ ہی وہ ناگن سے انسانی شکل میں واپس آ گئی۔

پاروتی انسانی شکل میں میرے سامنے کھڑی تھی۔ اندھیرے میں وہ مجھے پوری طرح نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔
”خدا کا شکر ہے کہ تم انسانی شکل میں واپس آ گئیں۔“

وہ اپنے کھلے بالوں کو باندھتے ہوئے بولی۔
”اب ہمیں اس قسم کے سپیروں سے بڑا محتاط رہنا ہوگا۔ یہ کوئی معمولی سپیرا نہیں تھا۔ اس کے پاس منتر و کی زبردست طاقت تھی۔“
میں نے کہا۔ ”تمہیں ناگن بن کر ہوٹل میں میرے ساتھ جانا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ ہوٹل والوں کو معلوم ہو جائے کہ میرے ساتھ ایک عورت بھی ہوٹل میں آئی ہے۔“

پاروتی کہنے لگی۔ ”تم نے ٹھیک سوچا ہے۔ میں ناگن کی شکل میں ہی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
دوسرے لمحے پاروتی نے دوبارہ ناگن کی شکل اختیار کر لی۔ میں نے اسے قیص کے اندر چھپایا اور ہوٹل میں واپس آ گیا۔ کمرے میں آ کر میں نے دروازے کو اندر سے چھنی لگائی۔ جتنی جلد رہی تھی۔ میں نے پاروتی کو نکال کر پلنگ پر رکھ دیا۔ وہ اسی

سے چلے جائیں تو مجھے چٹا کے پاس لے چلنا۔“
میں شمشان گھاٹ میں ایک جگہ اندھیرے میں درختوں کے نیچے بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ آدمی کب چٹا سے الگ ہوتے ہیں۔ چٹا کے شعلے آہستہ آہستہ مدھم پڑنے لگے تھے۔ تب دونوں آدمی وہاں سے چلے گئے۔ پاروتی بھی میری کلائی سے لپٹی چٹا کی طرف دیکھ رہی تھی کہنے لگی۔
”آگ کو مدھم ہونے دو۔“
کوئی ایک گھنٹے بعد چٹا کی آگ صرف انگاروں کی شکل میں باقی رہ گئی۔ پاروتی نے کہا۔
”اب مجھے چٹا کے پاس مردے کے سر ہانے کی طرف لے چلو۔“

میں چٹا کے پاس مردے کے سر کی جانب کوئی دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر آ کر بیٹھ گیا۔ پاروتی کہنے لگی۔
”تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔ چٹا کے پاس جاؤ اور وہاں سے تھوڑی سی راگھ کی چیز میں رکھ کر لے آؤ۔“
وہاں کوئی برتن وغیرہ تو تھا نہیں راگھ گرم تھی۔ میں نے پاروتی کو وہین زمین پر رکھ دیا اور اندھیرے میں جھک کر ایک گرا ہوا درخت کا جوڑا پتا اٹھایا اور جھک کر چلے ہوئے چٹا کے پاس آ گیا۔ یہاں آگ کی بڑی گرمی تھی۔ جس طرح سے بھی ہوسکا میں نے چٹا کی تھوڑی سی راگھ پتے پر رکھی اور پاروتی کے پاس لے آیا۔ پاروتی بولی۔
”اسے زمین پر رکھ دو۔“

میں نے راگھ والا پتا زمین پر رکھ دیا۔ ہمارے ارد گرد اندھیرا اور خاموشی تھی۔ صرف چٹا کے آس پاس انگاروں کی ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ پاروتی نے جو سانپ کی شکل میں تھی راگھ والے پتے کے گرد چکر لگانے شروع کر دیئے۔ میں اندھیرے میں ایک

ناگ پور وہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ ٹرین نے دوسرے روز مجھے ناگ پور پہنچایا۔ اسٹیشن کے پاس ہی ایک چھوٹے سے ہوٹل میں میں نے ایک کمرہ لے لیا۔ یہاں میں نے قیص کے اندر سے ناگن پاروتی کو نکال کر پلنگ پر رکھ دیا۔ وہ سنواری رنگ کے سانپ کی شکل میں تھی۔ کنڈلی مار کر بیٹھ گئی۔ یہاں ایک بار پھر اس نے دودھ منگوا کر پیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے کہ اس کی طاقت اسے واپس مل جائے۔
پاروتی نے کہا۔
”اس شہر کے جنوب میں ایک شمشان گھاٹ ہے۔ تم وہاں جا کر پتہ کرو کہ وہاں کسی مردے کو کب جلا یا جائے گا۔ میں اس کمرے میں ہی رہوں گی۔“

میں نے اسے تاکید کی کہ وہ کسی جگہ چھپ کر بیٹھے۔ اس کے بعد میں ہوٹل سے نکلا اور شہر کے جنوب کی طرف نکل گیا۔ پوچھتا پوچھتا میں شمشان گھاٹ پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ رات کو ایک مردے کو جلا یا جائے گا۔ میں نے واپس آ کر پاروتی کو بتا دیا۔ وہ کہنے لگی۔
”مجھے ساتھ لے کر رات کے وقت شمشان گھاٹ چلنا ہوگا۔“

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس دوران میں ہوٹل کے کمرے میں ہی رہا۔ جب رات ہو گئی تو میں پاروتی کو قیص کے اندر چھپا کر شمشان گھاٹ کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہلی سے ایک مردے کو جلا یا جا رہا تھا۔ چٹا میں سے شعلے نکل رہے تھے۔ دوا دی لمبی لمبی سلاخوں سے جلتی ہوئی لکڑیوں کو ہلا جلا رہے تھے۔ میں نے پاروتی کو اپنی کلائی پر لیٹ رکھا تھا۔ وہ گرون اٹھا کر چٹا کے شعلوں کو تک رہی تھی۔ کہنے لگی۔
”جب یہ دونوں آدمی جلتی ہوئی لاش کے قریب

”لے جاؤ“ میں نے دودھ پی لیا ہے۔“
تو کجیران ضرور ہوا کہ آخر مجھے دودھ پینے کے بعد خالی کپ فرش پر رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے کھانا کھا کر ہاتھ دھوئے۔ ہوٹل والے کو بل ادا کیا اور باہر سڑک پر آ گیا۔ بوندا باندی اسی طرح ہو رہی تھی۔ پاروتی نے میری قیص کے اندر سے پوچھا۔
”کیا منہ پڑنے لگا ہے؟ مجھے بارش کے پانی کی خوشبو آ رہی ہے؟“
سڑک پر لوگ آ جا رہے تھے۔ میں نے موقع دیکھ کر پاروتی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”یہاں لوگ ہیں۔ کچھ دیر کے لیے خاموش رہو۔“
وہ چپ ہو گئی۔ بوندا باندی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ میں سیدھا سوس کے اڈے پر آ گیا۔ یہاں سے بس میں بیٹھا اور کھنڈہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا۔ اس دوران بس راستے میں دو دفعہ رکی۔ میں بس سے اتر کر تنہا جگہ دیکھ کر پاروتی سے دوچار باتیں کر لیتا۔ وہ بار بار یہی کہتی کہ جس طرح بھی ہو سکے اس علاقے سے نکل جاؤ۔ سپر اضرور ہماری تلاش میں ہوگا۔ کھنڈہ میں بھی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ یہ بوندا باندی سارا راستہ جاری رہی تھی۔ ریلوے اسٹیشن پر آ کر میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ یہاں میرے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے پاروتی سے پوچھا کہ اب ہمیں کس طرف جانا چاہیے۔ وہ بولی۔
”یہاں سے مجھے ناگ پور لے چلو۔ وہاں چل کر تمہیں بتاؤں گی کہ سپیرے نے مجھ پر جو منتر پھونکا ہے اس کا توڑ کیا ہوگا اور میری طاقت کیسے واپس آئے گی۔“

ناگ پور کو گاڑی دو گھنٹے بعد جاتی تھی۔ یہ وقت میں نے وہیں اسٹیشن پر گزارا۔ مجھے ٹرین کا ایک ہی ٹکٹ لینا تھا۔ میں ٹکٹ لے کر ٹرین میں بیٹھ گیا۔

وقت اپنی اصلی شکل میں واپس آگئی۔ میں اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کہنے لگی۔
”تم نے میری خاطر بڑی لطفیں اٹھائی ہیں۔ تم نے میرے ساتھ دوستی کا پورا حق نبھایا ہے مگر اب میں نہیں چاہتی کہ تم میری خاطر اپنے آپ کو کسی مصیبت میں ڈالو۔“
میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”تو پھر تم کیا چاہتی ہو؟“
وہ بولی۔ ”میں چاہتی ہوں کہ تمہیں تمہارے شہر میں پہنچا کر میں واپس بنگال کے جنگلوں کی طرف نکل جاؤں۔ میں اکیلی ہی سنہتالی سپیروں سے انتقام لوں گی۔ تمہیں اب میرے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

دل تو میرا ابھی یہی چاہتا تھا کہ واپس اپنے شہر اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کے پاس پاکستان چلا جاؤں۔ پاکستان بن چکا تھا۔ میں نئی اسلامی مملکت کی خوشیوں میں شریک ہونا چاہتا تھا لیکن پاروتی کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزارا تھا۔ اسے اکیلا چھوڑنے کو دل بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”پاروتی! میں تو کسی بھی وقت تم سے الگ ہو کر اپنے نئے وطن پاکستان جاسکتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ زیادہ پیسے تو کم از کم تمہیں سنہتالی سپیروں کے علاقے میں چھوڑ کر واپس جاؤں۔“

پاروتی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
”نہیں انور! تمہیں اپنے ماں باپ سے پھڑے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔ اور اب تو آزاد اسلامی ملک پاکستان بھی بن چکا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم پاکستان اپنے ماں باپ کے پاس چلے جاؤ اور نئے اسلامی ملک پاکستان کی ترقی کے واسطے کام کرو۔“
میں نے اسے کہا کہ میرا بھی دل یہی چاہتا ہے کہ

ہمارا نیا اسلامی ملک پاکستان بن گیا ہے میں وہیں جا کر اپنے نئے ملک کی ترقی اور خوشحالی کے واسطے جو کچھ بھی کر سکتا ہوں کروں مگر تمہیں اکیلا چھوڑنا بھی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اس کے جواب میں پاروتی کہنے لگی۔
”تم میری فکر نہ کرو۔ میں اب اکیلی نہیں ہوں۔ میرے پاس خدا کی دی ہوئی ایک طاقت بھی ہے جو مصیبت کے وقت میرے کام آئے گی۔“

”مگر جس طرح اس پر اسرار دیہاتی سپیرے نے تمہیں اپنے قبضے میں کر لیا تھا اسی طرح کوئی اور طاقتور سپیرا بھی تمہیں اپنے پھندے میں پھنسا سکتا ہے۔ پھر تم کیا کرو گی؟“
پاروتی نے کہا۔

”اب ایسا نہیں ہوگا۔ کم از کم کسی انسان سپیرے میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ اب مجھے قابو کر سکے۔ یہ تو کوئی دیوتا ہی ایسا کر سکتا ہے اور میں ہندوؤں کے دیوتاؤں پر یقین نہیں رکھتی۔ کوئی دیوتا وغیرہ نہیں ہوتا۔“
میں نے کہا۔

”پاروتی! اگر تم دیوی دیوتاؤں اور مورتی پوجا وغیرہ کو نہیں مانتی ہو تو پھر تم اسلام قبول کیوں نہیں کر لیتی؟“
پاروتی کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

”میرے اندر ایک زبردست تبدیلی آچکی ہے۔ ہو سکتا ہے میں اندر سے مسلمان ہوئی ہوں لیکن میں زبان سے اس کا اعتراف ایک خاص وقت آنے پر کروں گی۔ اب تم سو جاؤ مجھے تو نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں جاگ کر تمہاری حفاظت کروں گی۔“

پاروتی صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ میں پلنگ پر لیٹ گیا۔ میں نے اسے تاکید کی کہ صبح ہونے کا کوئی ملازم وغیرہ آئے تو خود دروازہ نہ کھولے۔ مجھے

جگادے۔ میں واقعی سخت تھک چکا تھا اور مجھے نیند آ رہی تھی۔ پاروتی نے بتی بجھا دی۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور پھر گہری نیند سو گیا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب پاروتی مجھے کندھے سے ہلاتے ہوئے جگا رہی تھی۔ ساتھ ہی میں نے دروازے پر دستک دینے کی آواز سنی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پاروتی نے کہا۔ ”کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔“

”میرا خیال ہے ہوٹل کا ملازم ہوگا۔ تم ہاتھ روم میں جا کر چھپ جاؤ۔“
پاروتی ہاتھ روم میں چلی گئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر ہوٹل کا ملازم لڑکا چائے کا گلاس لیے کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔

”صاحب جی! آپ کے لیے چائے لایا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ صبح صبح چائے ضرور پیتے ہوں گے آپ شہر کے بابو ہیں نا؟“
میں نے چائے اس سے لی اور کہا۔

”میرا ناشتہ اوپر ہی لے آؤ اور سنو۔ دودھ کا گلاس بھی لانا۔ میں ناشتے میں دودھ ضرور پیتا ہوں۔“
”ٹھیک ہے صاحب۔“
لڑکا چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کر کے چٹختی لگادی اور پاروتی کو آواز دی۔

”باہر نکل آؤ۔ لڑکا چلا گیا ہے۔“
پاروتی غسل خانے سے نکل کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔
”تمہارے پاس اگر کچھ پیسے بچے ہوں تو بازار سے میرے لیے ایک نئی سوئی ساڑھی اور اور اپنے لیے قمیص پتلون لے آؤ۔ تمہارے کپڑے بھی پرانے ہو گئے ہیں۔“

میں نے جیب سے پیسے نکال کر گنے۔ ابھی ڈیڑھ پونے دو سو روپے موجود تھے۔ میں نے کہا۔

”پیسے تو ہیں مگر میرا خیال ہے ہمیں تھوڑی کنبوئی سے کام لینا چاہیے۔ مجھے پاکستان بھی پہنچنا ہے اور یہ بڑا سافری ہے۔“

پاروتی نے کہا۔ ”اس کی تم فکر نہ کرو۔ ضرورت پڑنے پر پیسوں کا انتظام ہو جائے گا۔“
مجھے معلوم تھا کہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔ چنانچہ میں خاموش ہو گیا۔ پاروتی سے چائے کا پوچھا تو اس نے کہا کہ مجھے اب کسی شے کی حاجت نہیں رہی۔ اگر چاہو تو پی سکتی ہوں۔ ناشتے پر تم نے دودھ منگوایا ہے۔ وہ پی لوں گی۔ میں چائے پیتا رہا۔ پاروتی میرے سامنے بیٹھی مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس راستے سے پاکستان جاؤں گا۔ میں نے کہا۔

”سیدھا راستہ تو یہی ہے کہ یہاں سے دلی دلی سے میرٹھ انبالہ اور جاندھر لدھیانہ سے ہوتا ہوا امرتسر اور پھر وہاں سے سرحد پار کر کے پاکستان پہنچ جاؤں گا۔“
پاروتی نے کہا۔

”مگر پنجاب میں تو بڑے فسادات ہو رہے ہیں۔ تم نے خود ہی تو مجھے بتایا تھا کہ مشرقی پنجاب سے مسلمان مہاجرین کے جو قافلے پاکستان کو جاتے ہیں ان پر ہندو سکھوں کے جتھے حملے کر رہے ہیں اور مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔“
میں نے کہا۔

”تو پھر دوسرا تو کوئی راستہ نہیں ہے۔“
اس وقت میرے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ میں بمبئی سے کسی بحری جہاز کے ذریعے بھی پاکستان پہنچ سکتا ہوں۔ لیکن قسمت میں جو لکھا تھا اور جو روٹ گئے کھڑے کر دینے والے واقعات آگے چل کر میرے ساتھ پیش آئے انہیں بھی تو کوئی نہیں مٹا سکتا تھا۔ پاروتی نے گردن اٹھا کر کہا۔

پاروتی نے گردن اٹھا کر کہا۔

”لیکن میں بھی تو تمہارے ساتھ ہوں گی۔ میرے ہوتے ہوئے تم پر کوئی ہاتھ اٹھا کر تو دیکھے۔ ایسا بدلہ لوں گی کہ ساری عمر نہیں بھولے گا۔“

اس رات ناگ پور کے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہم نے طے کر لیا کہ پاروتی مجھے پاکستان پہنچانے کے بعد واپس جنوبی بنگال کے جنگلوں میں اپنے دشمن سنھتالی سپیروں سے انتقام لینے کے لیے واپس چلی جائے گی اور میں پاکستان اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اس وقت مجھے اس حقیقت کا بھی کوئی اندازہ نہیں تھا کہ مشرقی پنجاب میں کس قدر ہولناک حالات ہیں اور ہندو سکھ مٹتے وحشیانہ انداز میں مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ انڈیا کے اخباروں میں مسلمانوں کے قتل عام کی خبریں صحیح طور پر شائع نہیں ہوتی تھیں۔ چونکہ پاروتی کو اب کسی بھی سپیرے کا خوف نہیں رہا تھا اور اس کے اندر ذاتی طاقت پیدا ہو چکی تھی کہ کوئی بھی دنیاوی طاقت رکھنے والا سپیرا اس کا کچھ نہیں رگاڑ سکتا تھا اس لیے اس نے میرے ساتھ انسانی شکل میں سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے دن ہم اسٹیشن پر آگئے۔ ناگ پور ہندوستان کے بالکل وسط میں واقع ہے اور یہاں بمبئی حیدر آباد دکن اور مدرا سے آنے والی ساری گاڑیاں آتی ہیں اور یہ بہت بڑا جٹشن ہے اس لیے ہمیں کوئی ایک گھنٹے بعد دلی جانے والی گاڑی مل گئی۔ یہ شہر دلی سے بہت دور ہے۔ ہم جس ریل گاڑی میں سوار ہوئے وہ جبل پور الہ آباد کانپور لکھنؤ شاہجہان پور بریلی اور مراد آباد سے ہوتی ہوئی کوئی تیسرے دن رات کے دس بجے دلی پہنچی۔ میں تو ٹرین میں سفر کرتے کرتے تنگ آ گیا۔ راستے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ پاروتی نے بڑے سکون اور خاموشی سے سفر طے کیا۔

دلی سے ہمیں مشرقی پنجاب کے لیے ٹرین تبدیل کرنی تھی۔ معلوم ہوا کہ صبح ایک گاڑی جالندھر امرتسر جارہی ہے۔ مجھے لاہور جانا تھا۔ انکوائری کلرک نے بتایا کہ چونکہ پاکستان بن گیا ہے اور پاکستان مسلمانوں کا ایک آزاد ملک ہے اس لیے انڈیا سے کوئی گاڑی لاہور نہیں جاتی۔ صرف جالندھر یا زیادہ سے زیادہ امرتسر تک گاڑیاں جاتی ہیں۔ پاروتی نے مجھے کہا۔

”امرتسر تک کے دو ٹکٹ لے لو۔ آگے دیکھا جائے گا۔ وہاں سے شاید لاہور کے لیے کوئی لاری وغیرہ مل جائے۔“

مجھے یہاں کے اس وقت کے خونی حالات کا بالکل علم نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“ چنانچہ ہم نے دلی سے امرتسر تک کے دو ٹکٹ لے لیے اور وہیں پلیٹ فارم پر ایک طرف بیٹھ گئے۔ گاڑی کے چلنے میں ابھی پوری رات بڑی تھی۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے اور گاڑی نے صبح پانچ بج کر دس منٹ پر روانہ ہونا تھا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

”تم تو نیند اور کھانے پینے سے بے نیاز ہو چکی ہو مگر مجھے تو بھوک بھی لگتی ہے۔ نیند بھی آتی ہے۔ مجھ سے یہاں ساری رات نہیں بیٹھا جائے گا۔“

”تو پھر کیا کریں؟ تم ہی بتاؤ۔“

میں نے مشورہ دیا۔ ”کیوں نہ شہر چلتے ہیں۔ چاندنی چوک کے کسی مسلمان ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔ پھر وہیں چائے پیئیں گے اور واپس آ جائیں گے۔“

پاروتی کو میرا مشورہ پسند آیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔

”مگر تم نے ہی کہا تھا کہ دلی میں بھی حالات

ٹھیک نہیں ہیں۔ یہاں بھی مسلمانوں کے گھروں کو لوٹ کر ہندو آگ لگا رہے ہیں۔“

میں رک گیا۔

”یہ تو ہے لیکن آخر ایسا بھی کیا ہے۔ ہم دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چل کر دیکھ لیتے ہیں۔ اگر حالات اچھے ہوئے تو چاندنی چوک میں کھانا کھائیں گے۔ حالات خراب ہوئے اور دکانیں ہوٹل بند ہوئے تو واپس آ جائیں گے۔“

پاروتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بالکل ٹھیک ہے چلو۔“

دلی اسٹیشن کے باہر مجھے محسوس ہوا کہ وہ رونق نہیں ہے کچھ ویرانی ویرانی سی تھی۔ لوگ بھی کم نظر آ رہے تھے۔ زیادہ تر ہندو سکھ پولیس کے سپاہی دکھائی دے رہے تھے۔ پاروتی نے بھی اس فرق کو محسوس کیا اور بولی۔

”دلی اسٹیشن کے باہر تو لگتا ہے کرفیو لگا ہوا ہے۔“

میں چاندنی ہوٹل کے مسلمان ہوٹل میں کھانا ضرور کھانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

”کرفیو نہیں لگا ہوا۔ ویسے رات کو آج کل لوگ کم ہی نکلتے ہیں۔“

ایک عیسائی والے نے کہا کہ چاندنی چوک کے دس روپے لوں گا۔ میں نے کہا۔ بھائی دس روپے تو بہت زیادہ ہیں۔ دو چار روپے کی بات کرو۔ وہ بولا۔ ”بھائی صاحب وہاں پیدل جا کر تو دکھائیں۔“

میں عیسائی میں بیٹھ گیا۔

”چلو بھائی دس روپے لے لینا۔“

پاروتی پہلے ہی عیسائی میں سوار ہو چکی تھی۔ عیسائی چاندنی چوک کی طرف چل پڑی۔ اسٹیشن سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد ہی محسوس ہوا کہ یہ دلی شہر نہیں ہے جہاں آدھی آدھی رات تک لوگ سیریں کرتے

تھے۔ سڑکیں تقریباً خالی تھیں۔ کوئی کوئی گاڑی یا تاگلہ گزر جاتا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔

”کیا یہاں کرفیو لگا ہے؟“

ڈرائیور نے کہا۔ ”کرفیو تو نہیں لگا۔ کل تک لگ جائے گا کیونکہ سبزی منڈی میں بڑا خون خرابہ ہوا ہے۔“

اس نے رک کر ہم سے پوچھا کہ ہم مسلمان ہیں؟ میں نے کہا۔

”الحمد للہ ہم مسلمان ہیں۔“

عیسائی ڈرائیور بھی مسلمان تھا کہنہ لگا۔

”بابو جی دلی میں ہندو سکھوں نے مسلمانوں کا بڑا قتل عام کیا ہے۔ مسلمانوں نے بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کر رہے ہیں مگر ہندو سکھوں کے ساتھ ان کی اپنی پولیس اور فوج ہے۔ مسلمان پولیس سے تو ایک ہفتہ پہلے اسلحہ لے لیا گیا تھا۔ آپ کہاں سے آ رہے ہیں بابو جی؟“

میں نے کہا۔ ”ناگ پور سے۔“

”میری مائیں بابو جی! آپ چاندنی چوک نہ جائیں واپس اسٹیشن پر چلے چلیں۔ چاندنی چوک میں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”بھائی اگر وہاں کرفیو نہیں لگا تو کوئی بات نہیں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔“

عیسائی ڈرائیور بڑے غور سے سڑک پر دائیں بائیں اور سامنے دیکھتا ہوا گاڑی چلا رہا تھا۔ بولا۔

”اچھا بابو جی جو اللہ کو منظور۔“

میں نے کہا۔ ”زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔“

میں نے پاروتی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اسے واقعی کوئی ڈر خوف نہیں تھا۔ مجھے معلوم نہیں عیسائی کن سڑکوں پر سے گزرتی ہوئی جب

چاندنی چوک کے قریب پہنچی تو ڈرائیور نے گاڑی ایک طرف لے جا کر کھڑی کر دی۔ سڑک خالی تھی۔ سامنے چوک بھی خالی خالی تھا۔ کچھ دکانیں ضرور کھلی ہوئی تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور جو مسلمان تھا کہنے لگا۔ ”بابو! واپس چلے چلیں۔ عورت بھی ساتھ ہے۔ کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔“ میں نے دور سے دکانوں کی روشنی دیکھ کر اس سے پوچھا۔

”کیا وہ چاندنی چوک ہے؟“ وہ بولا۔ ”ہاں جی، مگر وہاں جو دکانیں آپ کو کھلی نظر آ رہی ہیں وہ ہندوؤں کی دکانیں ہیں۔“ میں اور پاروتی ٹیکسی سے باہر نکل آئے۔ میں نے ڈرائیور کو دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ”بھائی، ہم تو چاندنی چوک کے کسی مسلمان ہوٹل میں کھانا کھانے آئے ہیں۔ اب تو کچھ کھانی کر ہی واپس جائیں گے۔ تم بے شک واپس چلے جاؤ۔“ ٹیکسی ڈرائیور نے کراہی لے کر جب میں رکھا اور بادل بخواسیہ ٹیکسی اشارت کر کے واپس چلا گیا۔ پاروتی کہنے لگی۔

”اگر وہاں کوئی مسلمان ہوٹل کھلا ہوا نہ ملتا تو ہم واپس اسٹیشن کس طرح پہنچیں گے یہاں تو کوئی سواری بھی نہیں ملے گی۔“

میں نے کہا۔ ”دیکھا جائے گا۔ تم میرے ساتھ آؤ۔“ ہم چلنے لگے تو پاروتی نے میرا بازو تھام کر مجھے روک لیا اور بولی۔

”میرا خیال ہے مجھے انسانی شکل میں تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہیے۔ میں ناگن بن کر تمہارے ساتھ ساتھ سڑک پر چلتی ہوں اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوگی تو کم از کم میں تمہاری مدد تو کر سکوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”اور اگر تمہیں دیکھ کر کسی نے تمہیں اینٹ پتھر سے پھینک دیا تو پھر کیا ہوگا؟“ اس نے کہا۔ ”میں اندھیرے میں چلوں گی۔ ویسے بھی میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔“ یہ کہہ کر دوسرے لمحے پاروتی میرے پاس کھڑی کھڑی غائب ہوئی۔ میں نے جبکہ کر سڑک پر دیکھا۔ پاروتی نسواری رنگ کے سانپ کی شکل میں کنڈلی مار کر بیٹھی تھی۔ کہنے لگی۔

”تم آگے آگے چلو۔ میں اندھیرے میں تمہارے ساتھ ساتھ چلتی رہوں گی۔“

میں چاندنی چوک کی طرف چل پڑا۔ چوک میں بڑی بے رونق تھی۔ اکثر دکانیں بند تھیں۔ دو چار دکانیں کھلی تھیں۔ ان دکانوں کے باہر تین پولیس والے رافٹلیں پاس رکھے اسٹولوں پر بیٹھے تھے۔ ان میں دو سکھ تھے۔ ظاہر ہے تیسرا سیاہی ہندو ہی ہوگا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا تھا کہ دلی کی مسلمان پولیس سے اسلحہ لے کر انہیں نہتا کر کے گھروں کو بھیج دیا گیا ہے۔ میں فٹ پاتھ پر جگت سینما کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے بائیں جانب دیکھا۔ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر پاروتی بھی سانپ کی شکل میں فٹ پاتھ پر بیٹھی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ میں نے جبکہ کر کہا۔

”اس سے تو اچھا تھا کہ تم انسانی شکل میں میرے ساتھ چلتیں۔“

مجھے پاروتی کی آواز آئی۔ ”تم خاموشی سے چلتے جاؤ۔ ادھر کس طرف جا رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے یاد ہے جگت سینما کے ساتھ والی سڑک پر مسلمانوں کا ایک ہوٹل ہے۔ شاید مغل ہوٹل اس کا نام ہے۔ وہیں جا رہا ہوں۔“ میں پولیس والوں کے سامنے سے کچھ فاصلے پر

سے گزرا تو سکھ سپاہی نے آواز دے کر پوچھا۔ ”کون ہو بھئی؟ کدھر جا رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”سردار جی ہوٹل میں چائے پینے جا رہا ہوں۔“

”اچھا وقت نکالا ہے تم نے چائے پینے کے لیے۔“ سکھ سپاہی نے طنزاً کہا۔ ”جاؤ چائے پیو اور اگر بچ جائے تو ہمارے لیے بھی چائے لیتے آنا۔“

پاروتی مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر اندھیرے میں تھی۔ کہنے لگی۔

”لگتا ہے ادھر کوئی خطرہ ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اب میں واپس تو جانے سے رہا۔“ اور میں چوک میں سے گزر کر جگت سینما کے پہلو والی چھوٹی سڑک کی طرف آ گیا۔ جگت سینما بند تھا۔

سڑک ویران تھی۔ سڑک پر صرف ایک ہی اسٹریٹ لیپ روشن تھا۔ میں نے ذرا آگے جا کر دیکھا ایک دکان کے اوپر مغل ہوٹل لکھا تھا۔ یہی وہ ہوٹل تھا جو مجھے یاد رہا تھا۔ مگر افسوس کہ ہوٹل بند پڑا تھا۔

میں نے پاروتی سے کہا۔ ”پاروتی! ہوٹل تو بند پڑا ہے۔ میرا خیال ہے واپس اسٹیشن پر چل کر ہی چائے پیتے ہیں۔“

”اچھا خیال ہے۔ چلو واپس چلو۔“ واپسی پر میں پولیس کے سپاہیوں کے پاس سے گزرنے لگا تو سکھ سپاہی نے طنز کی۔

”پی آئے چائے؟“ میں نے کہا۔ ”سردار جی ہوٹل تو بند ہے۔“

دوسرا سیاہی جو یقیناً ہندو تھا کہنے لگا۔ ”وہ ہوٹل تو مسلمان کا ہوٹل ہے۔ تم کون ہو بھئی کیا مسلمان ہو؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں! میں مسلمان ہوں۔“ تینوں سپاہی اسٹول پر سے اٹھ کر میرے قریب

آگئے۔ انہوں نے ایک طرح سے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ سکھ سپاہی نے میری گردن پکڑ کر کہا۔ ”مجھے لگتا ہے تم یہاں ہندوؤں کی دکانوں کو آگ لگانے آئے تھے۔ کیوں اوئے۔ بتا پیچھے کہاں آگ لگا کر آئے ہو؟“

میں نے سکھ سپاہی کا ہاتھ جھٹک دیا اور کہا۔ ”میں کوئی آگ واگ لگانے نہیں آیا۔ میں تو مغل ہوٹل میں کھانا کھانے گیا تھا۔“

میں نے ایک طرف نظر گھا کر دیکھا۔ پاروتی مجھ سے کوئی پندرہ فٹ کے فاصلے پر اسٹول کے پیچھے اندھیرے میں فٹ پاتھ پر موجود تھی اور ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ سکھ سپاہی میرے ہاتھ جھٹکنے سے غصے میں آ گیا۔ اس نے میری گردن دبوچ لی اور بولا۔

”چل اوئے تھانے۔“ دوسرے سپاہی بھی مجھے تھپڑ مارنے لگے۔ سکھ سپاہی مجھے گھسیٹنے لگا۔ اس کے بعد مجھے سانپ کی پھنکار سنائی دی اور جس سکھ سپاہی نے مجھے گردن سے دبوچ رکھا تھا اور مجھے گھسیٹ کر لیے جا رہا تھا اس کی گرفت اچانک میری گردن پر ڈھیلی پڑ گئی اور وہ دھڑام سے فٹ پاتھ پر گر پڑا۔ دوسرے سپاہی اس کو اٹھانے لگے تو ایک ایک کر کے وہ بھی وہیں ڈھیر ہو گئے۔ پاروتی نے اپنا کام کر دیا تھا۔ مجھے پاروتی کی آواز آئی۔

”اب یہاں سے بھاگ چلو۔ میری فکر نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

تینوں سپاہی فٹ پاتھ پر بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ چوک خالی ہونے کی وجہ سے کسی نے یہ ڈرامہ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ میں سڑک پر جس طرف سے آیا تھا اس طرف دوڑ پڑا۔

.....

میں فٹ پاتھ پر دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ پاروئی ضرور پیچھے رہ گئی ہوگی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ سانپ آدمی سے زیادہ تیز دوڑتا ہے۔ جب میں چوک سے کافی آگے نکل گیا تو میں دوڑنے کی بجائے تیز تیز چلنے لگا۔ میں نے چلتے چلتے اپنی دائیں بائیں جانب دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے سانپ کہیں نظر نہ آیا مگر سانپ نے مجھے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ سانپ کو اندھیرے میں بھی نظر آ جاتا ہے۔ مجھے پاروئی کی آواز آئی۔

”فکر نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

میں نے تیز تیز چلتے ہوئے ایک نظر پیچھے گردن موڑ کر دیکھا۔ چاندنی چوک میں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے پاروئی سے پوچھا۔

”تم نے ان کو مار تو نہیں دیا؟“

پاروئی نے جواب دیا۔

”دو آدمی تمہیں پھڑ مار رہے تھے۔ ایک سکھ تمہیں گھسیٹ رہا تھا۔ میں انہیں کیسے زندہ چھوڑ سکتی تھی۔ میں نے انہیں ڈس کر پورا زہران کے خون میں شامل کر دیا اب تک تو ان کے جسم پانی بن کر بہہ گئے ہوں گے۔“

میرے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی مگر پاروئی انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے بھی جب سے اس نے سنا تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد ہندو اور سکھ کرمسلمانوں کو قتل کر کے ان کے گھروں کو آگ لگا رہے ہیں وہ ہندو اور سکھوں کی دشمن ہو گئی تھی۔ وہ مجھے اکثر کہتا کرتی تھی کہ ہندو اور سکھ بنیادی طور پر بزدل ہوتے ہیں اس لیے وہ ظالم ہوتے ہیں اور ظلم کرتے ہوئے وہ گھنیا سطح پر اتر آتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مسلمان ایک بہادر اور کشادہ دل قوم ہے۔ مسلمان دشمن کو معاف بھی کر دیتا ہے اور عورتوں

اور بوڑھوں اور بچوں پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ اس قسم کی باتیں پاروئی کے ذہن میں پیدا ہونے شروع ہو چکی تھیں۔ خدا اسے سیدھی راہ پر لارہا تھا۔ میں اب تیز تیز نہیں چل رہا تھا۔ دوڑتے اور تیز چلنے سے میں تھک گیا تھا اور سانس بھی چڑھ گیا تھا۔ میں فٹ پاتھ پر ایک ہندوکان کے بٹھے پر بیٹھ گیا۔ پاروئی بھی اندھیرے میں سے نکل کر رینگتی ہوئی میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔

”یہاں کوئی سواری بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اور مجھے اسٹیشن کا راستہ معلوم نہیں ہے۔“

پاروئی نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے۔“

”تمہیں اتنی جلدی کیسے معلوم ہو گیا؟“

پاروئی کی آواز آئی۔

”سانپ جس راستے سے ایک بار گزر جاتا ہے وہ راستہ اسے ہمیشہ کے لیے یاد ہو جاتا ہے۔“

مجھے سڑک پر دور سے ایک تانگہ تا نظر آیا۔ میں نے پاروئی سے کہا۔

”شاید یہ تانگہ خالی ہے۔ میں اسے روکتا ہوں۔“

وہ کہنے لگی۔ ”اگر خالی نہ بھی ہوا تو تم اس پر سوار ہو جانا کم از کم اس علاقے سے تو نکل جائیں گے۔“

تانگہ قریب آیا تو وہ خالی تھا۔ میں نے ہاتھ دیا۔ کوچوان نے تانگہ روک دیا۔

”صرف اسٹیشن تک جاؤں گا بابو۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے بھی اسٹیشن پر ہی جانا ہے۔“

میں جلدی سے تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگہ خالی سڑک پر دوڑنے لگا۔ اس سے پہلے میں نے پاروئی سانپ کو اٹھا کر اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ دلی ریلوے اسٹیشن کے سامنے ایک باغ ہوا کرتا تھا۔ تانگہ اس باغ کے قریب پہنچا تو میں نے کوچوان

کو پیسے دیے اور وہیں اتر پڑا۔ میں ایک طرف اندھیرے میں آ گیا۔ میں نے پاروئی کو ٹیس کے اندر سے نکال کر کہا۔

”پاروئی! میرا خیال ہے اب تمہیں سانپ بن کر میرے ساتھ سفر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بہتر ہے کہ اپنی انسانی شکل میں آ جاؤ۔ کم از کم ایک دوسرے سے سب کے سامنے بات تو کر سکیں گے۔“

پاروئی اسی وقت انسانی شکل میں آ گئی۔ ہنس کر بولی۔

”تم تو اب اپنے ماں باپ کے پاس پاکستان جا رہے ہو۔ وہاں میں نہیں ہوں گی تو کس سے باتیں کرو گے؟ خیر وہاں تو تمہارے گھر والے ہوں گے بہن بھائی ہوں گے۔ تم تو مجھے بھول جاؤ گے۔“

میں نے کہا۔ ”تمہیں پاروئی! ایسی بات نہیں ہے۔ ہمارا اتنا عرصہ ساتھ رہا ہے۔ اور پھر ہم ایک دوسرے کے گہرے دوست بھی ہیں۔ میں تو تمہیں پاکستان جا کر ضرور یاد کیا کروں گا۔ ہو سکتا ہے تم مجھے بھول جاؤ۔“

ہم آہستہ آہستہ ریلوے اسٹیشن کی عمارت کی طرف جا رہے تھے۔ پاروئی نے اداس آواز میں کہا۔

”نہیں انور! میں بھی تمہیں نہیں بھلا سکوں گی۔ تم نے میرے اندر پیار کی جو جوت جگادی ہے وہ ہمیشہ روشن رہے گی۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اگرچہ مجھے بھی پاروئی سے ایسا ہی پیار ہو چکا تھا مگر میں پیار محبت کے ڈانٹا لگ بول کر اس تصویر میں مزید رنگ نہیں بھرنا چاہتا تھا۔ اسے آخر ایک روز مٹ جانا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”تم بھی میرے ساتھ پاکستان چلی چلو۔ وہاں تمہیں بہادر مہمان نواز اور کشادہ دل لوگ ملیں گے تم بڑی خوش رہو گی۔“

پاروئی نے آہستہ سے کہا۔

”میں نے تمہیں کہا تھا ہو سکتا ہے میں کبھی نہ کہیں تمہیں ملنے پاکستان آ جاؤں۔ میں اب بھی یہی کہوں گی کہ مجھے مسلمانوں کے ملک پاکستان جا کر بڑی خوشی ہوگی۔ تم مجھے اپنا پتہ دیتے جانا۔ میں تمہیں ملنے کم از کم ایک بار پاکستان ضرور آؤں گی۔“

میں نے اس سے کہا۔

”میں تمہیں امرتسر میں اپنا ایڈریس ضرور لکھوا دوں گا۔ بلکہ یاد کروا دوں گا۔“ پاروئی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں تو بھول ہی گئی تھی۔ تم مجھے اپنا ایڈریس بتاؤ چاہے نہ بتاؤ مگر میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی تمہاری خوشبو مجھے تمہارے پاس لے آئے گی۔ شاید تمہیں معلوم نہیں سانپ اگر ایک بار کسی کے لباس یا اس کے جسم کی بو سونگے تو وہ سات سمندر پار کر کے بھی اس شخص کے پاس پہنچ جاتا ہے۔“

ہم باتیں کرتے ریلوے اسٹیشن کی عمارت کے اندر آ گئے۔ یہاں عجیب ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم پر بھی بہت کم مسافر نظر آ رہے تھے۔ زیادہ تر ہندو سکھ ہی تھے۔ پولیس کے سپاہی بھی سکھ ہی تھے۔ پاروئی اور میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ ٹرین کا کچھ پتہ نہیں تھا کب روانہ ہوگی۔ پاروئی نے دلی کی دہشت زدہ فضا کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ ہندو اور سکھ ہندوستان کے مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ انہیں موقع ملا تو وہ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں گے۔ دیکھو ہندوستان میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ خدا مسلمانوں کو اس قوم سے محفوظ رکھے۔“

میں نے کہا۔ ”مشرقی پنجاب میں بھی مسلمانوں پر بڑا ظلم ہو رہا ہے۔“

پاروئی نے فکر مند ہو کر کہا۔

”میں تمہیں انڈیا کا بارڈر کراس کر رہی واپس آؤں گی۔ تمہیں امرتسر میں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔“
”جو میرے خدا کو منظور“ میں نے آہستہ سے کہا۔
رات کے دوڑھائی بجے کہیں امرتسر جانے والی ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر گئی۔ وہ پہلے ہی مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ میں اور پاروتی ایک ڈبے میں کسی نہ کسی طرح گھس کر بیٹھ گئے۔ کافی انتظار کروانے کے بعد ٹرین روانہ ہوئی۔ ٹرین جس وقت انبالے پہنچی تو صبح ہو چکی تھی۔ میں نے انبالے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر برقعہ پوش مسلمان عورتوں کو ایک ہجوم کی شکل میں اپنے بال بچوں اور مردوں کے ساتھ بے کسی کے عالم میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ یہ انبالے کے مسلمان مہاجرین تھے جو شاید کسی پیش کش ٹرین کے انتظار میں تھے۔
انبالے سے ہماری گاڑی چلی تو راستے میں کوئی اسٹیشن ایسا نہ تھا جہاں مسلمان مہاجرین سیٹنگروں کی تعداد میں بے سرو سامانی کے عالم میں بیٹھے ہوئے ہوں۔ مشرقی پنجاب شروع ہوا تو کھیتوں پر موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور کہیں کہیں دھواں اٹھتا نظر آ جاتا تھا۔ ظاہر ہے یہ مسلمانوں کے گھر تھے جنہیں نذر آتش کیا جا رہا تھا۔ گاڑی جالندھر اسٹیشن پر کی تو پلیٹ فارم پر ہر طرف سکھ ہی سکھ نظر آ رہے تھے جو تلواریں بندوبست لیے پھر رہے تھے۔ پاروتی نے میرا ہاتھ تھام لیا اور آہستہ سے کہا۔

”یہاں تو حالات بہت خراب ہیں۔“

جالندھر سے ٹرین چلی تو ایک جگہ ریلوے لائن کے ساتھ کٹی ہوئی بے شمار لاشیں ادھر ادھر پڑی تھیں۔ کھیتوں میں گھروں کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ یہاں مسلمانوں کے کسی قافلے پر سکھوں کے جتنے حملہ کر دیا تھا۔ ٹرین امرتسر شہر کے مضافات میں داخل ہو چکی تھی۔ اس شہر کے گلی کوچوں بازاروں سے میں

اچھی طرح واقف تھا۔

ٹرین امرتسر کے پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔

پلیٹ فارم پر ہندو سکھ کرپائیں اور اسلحہ لیے دندناتے پھرتے تھے۔ وہ ہر ڈبے میں داخل ہو کر پوچھتے۔ یہاں کوئی مسلمان تو نہیں ہے؟ دو سکھ کرپائیں ہاتھوں میں لیے ہمارے ڈبے میں بھی آگئے۔ ایک سکھ نے پوچھا۔

”یہاں کوئی مسلمان تو نہیں ہے؟“

مسافر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ایک مسافر نے کہا۔

”سردار جی یہاں مسلمان کا کیا کام؟“

سکھ نے میری طرف گھور کر دیکھا۔

”تم مجھے ملے لگتے ہو۔ نکل آؤ باہر۔“

پاروتی نے کہا۔

”یہ میرا بچہ ہے میں ہندو ہوں۔ میرا نام پاروتی ہے۔“

سکھ نے مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

”ابھی اس کے ختنے دیکھ کر پتہ چل جائے گا کہ یہ ہندو ہے کہ مسلمہ۔“

دونوں سکھ مجھے کھینچتے ہوئے ڈبے سے باہر لے آئے۔ پاروتی بھی باہر نکل آئی۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی۔

”یہ میرا بچہ ہے۔ میں ہندو ہوں۔ ہم مسلمان نہیں ہیں۔“

وہاں تین چار اور سکھ آ گئے۔ ان کے پاس بھی تلواریں تھیں۔ ”چلو اے اس کو اندر لے جا کر دیکھو مسلمان ہے کہ ہندو۔“

وہ مجھے سامنے والے کمرے میں لے گئے۔ دوسرے لمحے ان پر یہ راز کھل گیا کہ میں مسلمان ہوں۔ پاروتی بھی دوڑتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔

پلیٹ فارم پر ریلوے کا کوئی دفتر تھا۔ بالکل خالی پڑا

تھا۔ دونوں سکھوں نے مجھے پکڑ کر فرش پر گرایا۔ ایک سکھ کے پاس کرپان تھی۔ اس نے کرپان میری گردن پر چلائی چاہی۔ میں ٹرپ کر اس کے نیچے سے نکل گیا۔ دوسرے سکھ نے تلوار والا ہاتھ اٹھایا کہ ایک ہی وار سے میری گردن الگ کر دے مگر اب پاروتی میری مدد کو وہاں پہنچ چکی تھی۔

پاروتی نے سکھ پر چھلانگ لگا دی۔ اور اسے اپنے ساتھ ہی دوسری طرف گرایا۔ میں نے دوسرے سکھ کے کرپان والے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ اس دوران پاروتی پہلے سکھ کی گردن میں ناخن چھو کر اسے ہلاک کر چکی تھی۔ پاروتی نے دوسرے سکھ کی گردن پر دونوں ہاتھ زور سے مارے اور اپنی انگلیوں کے ناخنوں سے اس کی گردن نوچنے لگی۔

بس اتنا ہی کافی تھا۔ خدا جانے اس کے ناخنوں میں ایسا ہلاکت خیز زہر کہاں سے آ گیا تھا۔ دوسرا سکھ وہیں دہرا ہو کر بے حس ہو کر منہ کے بل فرش پر گر پڑا۔ اب باہر سے سکھوں کے اندر آ جانے کا زبردست خطرہ تھا۔ پاروتی نے ہاتھ کو جھٹک کر کہا۔

”ان کی لاشیں اس طرف کر دو۔ جلدی کرو۔“

ہم نے دونوں سکھوں کی لاشوں کو میز کے نیچے ڈھیل دیا۔ باہر سے دوسرے سکھ غنڈوں کی آواز آئی۔

”باہر نکل نہاں گھسا۔ اندر کیا کر رہے ہو؟“

میں نے پاروتی سے کہا۔

”اب کیا کریں؟“

پاروتی کا خیال تھا کہ باہر سکھ ادھر ادھر ہو گئے ہوں گے اور وہ یہ کہتی ہوئی مجھے لے کر باہر نکل جائے گی کہ میرا خاندان ہندو ہے۔ تمہارے ساتھیوں کو پتہ چل گیا ہے مگر سکھ باہر ہمارے نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ پاروتی دروازہ تھا۔ میں نے اسے کھولا تو وہ غسل خانہ غسل خانے میں بھی ایک چھوٹا دروازہ تھا۔ پاروتی

نے اسے کھولا دوسری طرف احاطہ تھا جہاں گائے بندھی تھی۔ ہم تیزی سے نکل کر احاطے میں آئے اور دوڑتے ہوئے اسٹیشن کی عقبی سڑک پر نکل گئے۔ یہاں چھوٹے سے باغیچے میں ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی تھی جس کو سکھوں نے توڑ پھوڑ دیا تھا۔

ہمیں پلیٹ فارم پر سکھوں کے نعروں کی آوازیں سنائی دیں۔ شاید انہیں اپنے ساتھیوں کی ہلاکت کا پتہ چل گیا تھا۔ پاروتی نے کہا۔

”کسی طرف کو بھاگ چلو۔ میں تمہیں دشمنوں کے اتنے ہجوم سے نہیں بچا سکوں گی۔ بھاگو۔“

ہم نے دوڑتے ہوئے سڑک پار کی۔ سامنے لکڑیوں کا ٹال تھا۔ اس کی بغل سے ایک راستہ کھیتوں کی طرف جاتا تھا۔ ہم دوڑتے ہوئے کھیتوں میں آ گئے۔ یہاں فصل کھڑی تھی۔ ہم نے فصل کے درمیان جو پگ ڈنڈی تھی اس پر جتنی تیزی سے بھاگ سکتے تھے بھاگنا شروع کر دیا۔ کھیت ختم ہو گئے۔ ایک چھوٹا سا میدان آ گیا جہاں خالی تانگے کھڑے تھے۔ ہم وہاں سے بھی بھاگتے ہوئے گزر گئے۔ آگے کسی احاطے کی اوچی دیوار آ گئی۔ ہم دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے ریلوے سینیما کے عقب میں آ گئے۔ یہ سینیما راجا نا پچا تھا۔

وہاں آ کر ہم ٹالہ کی درخت کے نیچے بے دم سے ہو کر گر پڑے۔ پاروتی کا سانس اتنا نہیں پھولا تھا۔ مگر میرا سانس بہت پھول گیا تھا۔ بعد میں پاروتی نے مجھے بتایا کہ ناگن ہونے کی وجہ سے اس کا دم زیادہ نہیں پھولا تھا۔ جب ذرا میرے اوسان بحال ہوئے تو میں نے پاروتی سے کہا کہ ہمیں اب اسٹیشن کی طرف ہرگز نہیں جانا چاہیے۔

اس نے پوچھا۔

”تم اس شہر سے واقف ہو۔ یہ کونسا علاقہ ہے اور

یہاں سے پاکستان کی سرحد کی طرف ہے کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ تمہیں جتنی جلدی ہو سکے پاکستان کی سرحد کے اندر پہنچا دوں۔“

میں نے کہا۔

”ہم سکھوں سے کافی دور نکل آئے ہیں مگر پاکستان کو جو سڑک جاتی ہے اس پر ایک بہت بڑا گوردوارہ ہے۔ شہر کی جو حالت دیکھ رہا ہوں اس کے پیش نظر وہاں میرا بچ کر نکلنا ممکن نہیں لگتا۔“

”ہم سڑک چھوڑ کر کھیتوں کھیت بارڈر کی طرف چلتے ہیں۔ ابھی دونوں ملک نئے نئے آزاد ہوئے ہیں بارڈر پر کوئی فوج وغیرہ نہیں ہوگی۔“

اس کا یہ مشورہ بڑا اچھا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر ہم یہاں سے خالصہ کالج کی طرف چلتے جائیں تو آگے کھیتوں کھیت چھ ہرٹہ کا گوردوارہ پار کر کے اسی طرح کھیتوں میں چلتے لاہور پہنچ سکتے ہیں۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ امرتسر شہر مسلمانوں سے خالی ہو چکا ہے اور جس طرف ہم جانے والے ہیں اس طرف سکھ غنڈے کھیتوں میں کئی مسلمانوں کو قتل کر چکے ہیں اور ان کی لاشیں وہیں پڑی ہیں اور سکھاؤں پاس کے کھیتوں میں چھپے ہوئے مسلمانوں کو تلاش کر رہے ہیں۔

میں نے پاروٹی کو ساتھ لیا اور کھیتوں میں خالصہ کالج کی طرف چل پڑا۔ فضا میں ایک دہشت ناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شہر کی طرف دو تین جگہوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں نے پاروٹی کو دھوئیں کے بادل دکھاتے ہوئے کہا۔

”یہ مسلمانوں کے مکان جل رہے ہیں۔“ کھیت میں فصل اونچی تھی۔ فصل ختم ہوئی تو بائیں جانب کچھ فاصلے پر امرتسر کے دائم گنج کی آبادی کے مکان دکھائی دیئے۔ ان مکانوں پر بھی ایک سکوت

طاری تھا۔ آگے کھیت میں کسی فصل کی دیوار آگئی۔ ہم اس دیوار کی اوٹ میں چل رہے تھے۔ یہ کھیت ختم ہوا تو آگے چھوٹا سا چھپر آ گیا۔ یہاں کئی ہوئی انسان لاشیں پڑی تھیں۔ پاروٹی نے میرا بازو تھام لیا۔ یہ مسلمانوں کی لاشیں تھیں اور آگے گئے تو کھیتوں میں جگہ جگہ انسانی لاشیں پڑی تھیں جن کا خون ابھی تک بہہ رہا تھا۔ پاروٹی کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

اچانک ایک طرف سے آدمیوں کے دوڑنے کی آوازیں آئیں۔ ہم وہیں بیٹھ گئے۔ فصل ہمارے چہروں تک آئی تھی۔ ہم نے چار پانچ سکھوں کو بلیم اور تلواریں لیے دائم گنج کی آبادی کی طرف دوڑتے دیکھا۔ ہم وہیں دیک کر بیٹھے رہے۔ جب سکھ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو ہم پھر چھ ہرٹہ کی طرف تیز تیز قدموں کے ساتھ چلنے لگے۔ خالصہ کالج کی عمارت بائیں جانب پیچھے رہ گئی تھی۔ کھیتوں میں ایک طرف تین چار مکان تھے۔ ادھر سے ایک بوڑھا آدمی ہمیں دیکھ کر دونوں ہاتھ اٹھا کر اس طرح ہلانے لگا جیسے ہمیں رک جانے کا اشارہ کر رہا ہو۔ پاروٹی نے کہا۔

”یہ بوڑھا کیا کہہ رہا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”کچھ بھی ہو۔ ہمیں رکتا نہیں چاہیے۔“

ہم تیز تیز چلتے گئے۔ بوڑھا کھیت میں سے گزر کر ہمارے سامنے آ گیا وہ سکھ نہیں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اونچی آواز میں کہا۔

”السلام علیکم!“ میں نے سلام کیا کہہ کر رک گیا۔ ”بابا تم مسلمان ہو؟“ بوڑھے کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر جسم کمزور تھا۔ سر نے صافہ باندھ رکھا تھا۔ کہنے لگا۔

”ہاں بیٹا میں مسلمان ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ تم بھی مسلمان نکلے۔ سکھوں نے یہاں مسلمانوں کو بہت قتل کیا ہے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب کسی مسلمان کا خون نہیں بہنے دوں گا۔ بہتی میں جو کوئی بچا کچا مسلمان ملا اسے یہاں سے نکال کر اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤں گا۔ بیٹا اس طرف آ جاؤ آگے بڑا خطرہ ہے۔ جلدی کرو۔ سکھوں کا جتھا ادھر کھڑا رہا ہے۔“

ہم پہلے ہی ڈرے ہوئے تھے۔ ایک مسلمان کو دیکھا تو کچھ حوصلہ ہوا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ وہ ہمیں کھیتوں میں جو مکان تھے اس طرف لے گیا۔ راستے میں وہ بولتا جا رہا تھا۔

”امرتسر میں مسلمانوں پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ ہندو سکھوں نے ڈوگرہ فوج کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا بڑا خون بہایا ہے۔ جلدی چلو بیٹا۔“ وہ ہمیں ایک مکان میں لے آیا۔ مکان خالی پڑا تھا۔ کہنے لگا۔

”میں دائم گنج میں نان بائی کی دکان کرتا تھا۔ سکھوں نے حملہ کیا تو یہاں آ کر چھپ گیا۔ تم یہاں بیٹو! میں باہر جا کر معلوم کرتا ہوں کہ سکھوں کا جتھا ادھر نہیں آ رہا۔ ہاں دروازہ اندر سے بند کر لینا۔“

یہ کہہ کر وہ بوڑھا مکان سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے پاروٹی کی طرف دیکھا۔

”یہ تو کوئی فرشتہ ہمیں مل گیا ہے۔ نہیں تو ہمیں سکھوں کے جتھے نے زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔“

یہ مکان کا چھوٹا سا کمرہ تھا جو بالکل خالی تھا۔ صرف ایک پرانی چار پائی دیوار کے ساتھ کچھ ہوئی تھی۔ بوڑھے کو گئے بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ باہر کچھ آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ یہ آواز قریب آئی تو میں نے دروازے کے

سورخ میں سے جھانک کر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ وہی بوڑھا آدمی جو ہمیں مکان میں چھوڑ کر گیا تھا دو سکھوں کے ساتھ کسی بات پر جھگڑتا ہوا کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ دونوں سکھوں میں سے ایک سکھ کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں ہاکی تھی۔ بوڑھا کہہ رہا تھا۔

”ایک عورت بھی ساتھ ہے۔ جوان عورت ہے۔ میں زیادہ پیسے لوں گا۔“

تلوار والے سکھ نے جھومتے ہوئے اسے گالی دی۔

”اوتے ننھے جالا لانا نہیں تو تیری گردن اڑا دوں گا۔ جتنے پیسے دیئے ہیں ٹھیک ہیں۔“

بوڑھا کہنے لگا۔

”سردار! بڑی مشکل سے گھیر کر دونوں مسلمان مرد عورت کو لایا ہوں دس روپے ہی دے دو۔“

دوسرے سکھ نے اسے خوش گالی دے کر ہاکی اٹھائی تو وہ بوڑھا جو اصل میں ہندو تھا اور جس کا کام اس آبادی کے بچے کچے مسلمانوں کو گھیر کر لانا تھا وہاں سے چلا گیا۔

میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے گھبراہٹ میں پاروٹی سے کہا۔

”پاروٹی! ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ وہ بوڑھا ہندو تھا۔ اس نے ہمیں سکھوں کے حوالے کر دیا ہے۔ دو سکھ ہماری طرف آ رہے ہیں۔“

اتنے میں سکھوں نے دروازے کو زور سے دھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ سکھوں نے دروازے پر ہاکی اور لاتیوں پر سانا شروع کر دیں۔ کمرے میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ کوئی روشندان تھا۔ دروازہ ٹوٹنے لگا۔ میں نے پاروٹی سے کہا۔

”پاروٹی! کچھ کرو۔ لگتا ہے اب بچنا مشکل ہے۔“ پاروٹی نے مجھے دروازے سے ایک طرف کرتے

ہوئے کہا۔

”تم ادھر ہو جاؤ۔“

میں کوئے میں جا کر بیٹھ گیا۔ دروازے کی چنجی اکھڑ گئی۔ دروازہ کھل گیا اور دونوں سکھ بڑکیں مارتے ہوئے کمرے میں آ گئے۔ اس دوران پاروتی ناگن کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ جیسے ہی دونوں سکھ اندر آئے اور میری طرف بڑھے پاروتی نے ان دونوں کو اچھل کر ڈس دیا۔ یہ کچھ ایسے غائب کا زہر تھا کہ دونوں سکھ اپنی جگہ پر ساکت ہو گئے۔ پاروتی نے ایک غلطی کی وہ بھنکارتے ہوئے پھن پھیلا کر ان کے سامنے آ گئی۔

جس سکھ کے ہاتھ میں تلوار تھی اس میں ابھی کچھ سکت باقی تھی دوسرا سکھ گر پڑا تھا۔ پہلے سکھ نے گرتے گرتے تلوار والا ہاتھ سانپ پر مارا۔ میری آنکھوں کے سامنے تلوار پاروتی کو لگی اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا سکھ بھی ڈھیر ہو گیا۔

ایک لمحے کے لیے تو میں جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھا رہا۔ پاروتی ناگن کے روپ میں تھی اور اس کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ دونوں ٹکڑے فرش پر پڑے تھے۔ اوپر والے ٹکڑے کا پھن سکڑ گیا تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر پاروتی ناگن کے دونوں ٹکڑے اٹھائے۔ گردن سے ذرا نیچے تلوار نے سانپ کو کاٹ دیا تھا۔ خون ذرا سا بھی نہیں بہا تھا۔ میں نے سانپ کے دونوں ٹکڑے جیب میں ڈالے اور کھلے دروازے سے نکل کر باہر آیا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ میں دوڑ کر مکان کے پیچھے چلا گیا۔ پیچھے باجرے کا کھیت تھا۔ ایک گیڈنڈی بارڈر کی جانب جو علاقہ تھا اس طرف جارہی تھی۔ مگر اب مجھے اس طرف نہیں جانا تھا۔ مجھ پر ایک بھاری ذمے داری عائد ہو چکی تھی۔ مجھے پاروتی کی زندگی پھر سے واپس لانے کے لیے کوہ ہمالیہ کے

پہاڑی سلسلے میں واقع کیلاش پر بت جانا تھا۔ میں نے وہیں سے اپنا رخ اس سڑک کی طرف کر لیا جو امرتسر شہر کے قریب سے گزرتی ہوئی آگے جالندھر لدھیانہ انبالے کی طرف جاتی تھی۔

.....

میرا خیال تھا کہ میں جس چھوٹی سڑک پر جا رہا ہوں یہ جالندھر لدھیانے کی طرف ہی جاتی ہوگی لیکن میرا خیال غلط تھا۔ یہ پچی سڑک امرتسر کی جیل کے قریب جا کر دائیں جانب ایک برساتی نالے کے پل کی طرف چلی گئی تھی۔ میں نالے کے پل پر سے گزر کر دوسری طرف آ یا تو میرے سامنے پچنی بارغ کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ امرتسر جیل کی طرف میں پہلی بار آیا تھا۔ سڑک اور کھیتوں پر ایک دہشت طاری تھی۔ کہیں کہیں سوائے ملٹری کے سپاہیوں کے اور کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ میں ان سے بھی چھپ کر آگے نکل گیا۔ صرف اس ڈر سے کہ اگر انہوں نے پکڑ کر میری تلاشی لی اور میری جیب سے کٹا ہوا سانپ نکلے گا جس کو وہ زمین پر پھینک کر پھل ڈالیں گے اور پھر شاید میں پاروتی کی زندگی بھی نہیں بچا سکوں گا۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی تھا کہ یہ ساری ملٹری ہندو ڈوگرہ اور گورکھوں پر مشتمل ہے انہیں جب معلوم ہوگا کہ میں مسلمان ہوں تو وہ مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہندو ملٹری نے بھی امرتسر میں سکھوں کے ساتھ مل کر سیڑیوں مسلمانوں کو شہید کیا تھا۔ امرتسر کے پچنی بارغ کی ایک ایک سڑک میری دیکھی ہوئی تھی۔ یہاں سے مجھے جالندھر انبالے کی طرف جانے والی جی ٹی روڈ کا راستہ بھی آتا تھا۔ میں بانگوں بارغ جی ٹی روڈ پر نکل جانا چاہتا تھا۔ امرتسر شہر کی طرف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اوپر سے شام ہو رہی تھی۔ میں پچنی بارغ والی مال روڈ کی طرف جانے کی بجائے اس سڑک

پر آ گیا جو ریالٹو سینما اور پوسٹ آفس کی عمارت کے آگے سے ہو کر بڑے اسپتال کی طرف جاتی تھی۔ یہ پچنی بارغ کی مشرقی سڑک تھی۔ بالکل خالی بڑی تھی۔ میں کپڑوں سے ہندو ہی معلوم ہوتا تھا۔ تنگ موری کی پتلون تھی اور ماتھے پر ہندوؤں کی طرح میں نے ایک لال ہندی بھی لگائی ہوئی تھی۔ یہ اگست 1947ء کے آخری دن تھے۔ فضا میں بڑا جھٹکا تھا۔ پچنی بارغ کے درخت شام کے اندھیرے میں دھندلے ہو رہے تھے۔ ریالٹو سینما والی سڑک جس پر میں جا رہا تھا دور تک خالی بڑی تھی۔ میں ریالٹو سینما سے ذرا پہلے چوک میں سے پچنی بارغ کی طرف ہو گیا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ آگے ملٹری نہ ہو۔ پچنی بارغ ویران پڑا تھا۔ میں الیکٹریٹر راگروائڈ میں سے ہوتا ہوا پچنی بارغ کے اس حصے میں آ گیا جہاں اس کا رام بارغ والا گیٹ تھا۔ یہاں سے میں چھوٹی نہر پر چڑھ گیا۔ یہ چھوٹی سی نہر دو موہنی کی طرف سے آتی تھی اور پچنی بارغ کو سیراب کرتی تھی۔ نہر کے کنارے چلتا چلتا میں دو موہنی پر جا کر بائیں جانب ہنسی کے اوپر چلنے لگا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے شام کا اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تھا۔ یہ ہنسی دراصل اسی نالے کی چھت تھی جس میں سے نہر کا تازہ پانی امرتسر کے دربار صاحب والے تالاب میں جا کر گرتا تھا۔

آگے ریلوے لائن آ گئی۔ میں ہنسی سے اتر کر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میرا رخ جالندھر انبالے کی طرف تھا مگر میں وہاں تک پیدل نہیں جاسکتا تھا۔ کوئی ریل گاڑی بھی ملنی مشکل تھی۔ کیونکہ اس وقت پاکستان سے ہندو سکھ شرناتھیوں سے بھری ہوئی ٹرینیں ہی آتی تھیں اور ان کا بھی کوئی وقت نہیں تھا کہ کب آجائیں۔ ویسے بھی ان میں بیٹھنا خطرناک تھا۔ ہو سکتا تھا کہ ہندو سکھ شرناتھیوں

کو مجھ پر مسلمان ہونے کا شک پڑ جائے۔ میں اللہ توکل ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ امرتسر کے چالیس کنوئیں بھی گزر گئے۔ اس کے بعد رات کا اندھیرا پوری طرح چھا گیا۔

یہ فسادات کی خون آلود رات تھی۔ ہر طرف وحشت طاری تھی۔ اگست کی جس آلود رات کی فضا میں آگ اور خون کی بورچی ہوئی تھی۔ ریلوے لائن سے دور ایک گاؤں میں لگی ہوئی آگ نظر آئی۔ سست سری اکال کے نعرے بھی سنائی دیئے۔ میں موت کے منہ میں چلا جا رہا تھا۔ خیال آیا کہ یہاں کی جگہ چھپ کر رات گزار دینی چاہیے۔ صبح کی روشنی میں آگے چلوں گا تاکہ معلوم تو ہو کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ لیکن پھر سوچا کہ رات کے اندھیرے میں تو میں پھر بھی خطرناک علاقے سے گزر جاؤں گا۔ دن کی روشنی میں سکھوں کے قابو آ گیا تو پاروتی کے ساتھ میں بھی ختم ہو جاؤں گا۔

میرے پاس اتنے پیسے موجود تھے کہ میں بڑی آسانی سے کیلاش پر بت پہنچ سکتا تھا۔ کیلاش پر بت پہنچنے کے لیے مجھے جالندھر سے انبالے جانا تھا جہاں سے گاڑی بدل کر مراد آباد اور پھر گورکھپور کی طرف نکل جانا تھا۔ اس کے آگے شمال کی جانب ہمالیہ کا پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ہمالیہ کی پہاڑیوں میں ہی کیلاش پر بت نام کی ایک پہاڑی تھی۔ یہ سب کچھ مجھے پاروتی نے سمجھا دیا تھا۔ اس پہاڑی کے دامن میں کوئی مندر تھا۔ مندر کے صحن میں ایک تالاب تھا۔ اس تالاب میں مجھے پاروتی ناگن کے جسم کے ٹکڑے کسی ڈبے میں بند کر کے چھ دن تک رکھنے تھے۔ ساتویں دن پاروتی کے جسم کے ٹکڑوں نے آپس میں جڑ جانا تھا اور پاروتی نے سانپ کے روپ میں پھر سے زندہ ہو جانا تھا۔

”مسلمان ہو۔ موت سے چھپتے پھر رہے ہو گے۔“
میں اس کی بات پر اس کا منہ تنکے لگا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک اور مقناطیسی کشش تھی کہ میں زیادہ دیر اس کی طرف نہ دیکھ سکا۔ میں نے نظریں جھکا لیں اور کہا۔
”مجھے آپ بھی مسلمان لگتے ہیں۔“
”ہاں میں بھی مسلمان ہوں مگر تمہاری طرح موت سے چھپتا نہیں پھرتا۔“

مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔
”کیا آپ رات کے وقت یہاں آتے ہیں یا دن کے وقت بھی آتے ہیں؟“
وہ بولا۔ ”رات اور دن میں کیا فرق ہوتا ہے؟ میں دن کے وقت بھی اسی جگہ رہتا ہوں رات کو بھی یہیں رہتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”آپ کے چاروں طرف ہندو سکھ مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ آپ کسی قافلے کے ساتھ پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے؟“
وہ بولا۔ ”کیا پاکستان میں کوئی اور خدا ہے؟ اگر خدا نے مجھے بچانا ہے تو یہاں بھی بچالے گا۔ یہاں بھی وہی خدا ہے۔“
اس آدمی کی باتیں میری سمجھ سے بالا تھیں۔ میں نے کہا۔

”مجھے انبالے جانا ہے۔ کیا یہاں آگے کسی جگہ سے مجھے انبالے جانے والی کوئی گاڑی مل سکتی گی؟“
وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ پھر بولا۔
”تمہیں آگے کرتار پورے کے اسٹیشن سے ہی جالندھر انبالے جانے والی کوئی گاڑی مل سکتی ہے۔“
میں نے کہا۔

”مگر ساری گاڑیاں پاکستان سے آنے والے ہندو سکھ شرتا تھیوں کی ہیں اور میں مسلمان ہوں۔“

”مسلمان ہو۔ موت سے چھپتے پھر رہے ہو گے۔“
اس نے آنسو ہری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
”تم کہاں سے آ رہے ہو؟“
میں نے پانی پیا اور آنسو ہری صف پر رکھتے ہوئے کہا۔
”بس راستہ بھول گیا تھا۔“

میں اسے یہ بتاتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ میں مسلمان ہوں یا ہندو ہوں۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ برسرِ فقر ہندو ہے یا مسلمان۔ اس لیے میں نے گول مول بات کہہ دی تھی۔ وہ میرے سامنے صف پر بیٹھ گیا۔ اس نے کرتے کی جیب میں سے سگریٹ کا پیٹ نکال کر کھولا۔ اسے میری طرف بڑھا کر کہا۔
”سگریٹ پیتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”جی نہیں شکریہ۔“
”لے لو۔ میں جانتا ہوں تم سگریٹ پیتے ہو ڈرو نہیں۔ یہاں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ تم مسلمان ہو یا ہندو ہو تو اپنے گھر ہو گے۔ یہاں بے فکر ہو کر بیٹھو۔ سگریٹ لگاؤ۔“
سگریٹ کڑوا اور سخت تھا۔ مجھے پہلے ہی کش کے ساتھ کھانسی آ گئی۔ وہ آدمی بولا۔

”گلے کو اتنا نازک کیوں بنا رکھا ہے؟ میرے پاس تو تمہیں یہی تار کا سگریٹ ملے گا۔“
تار مار کہ سگریٹ اس زمانے میں دنیا کا سب سے گھٹیا سگریٹ تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس میں تمباکو کی بجائے سڑکوں کی مٹی اور گھاس بھری ہوتی تھی۔ مجھے دوسرا کش لگانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس آدمی نے پوچھا۔
”کیا نام ہے تمہارا؟“

میں نے نام بتایا تو وہ ہنس کر بولا۔

کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ بڑے گھنے سیاہ تاریک درخت ہیں۔ ان کے نیچے ایک جگہ چراغ جل رہا ہے۔ میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا دوسری طرف سے درختوں کے پاس آ گیا۔ میں نے ایک جھونپڑی دیکھی جس کے آگے چوکور مٹی کا چبوترہ تھا۔ چبوترے کی اینٹوں پر دیا روشن تھا۔ جھونپڑی کا کوئی دروازہ نہیں تھا اس پر کوئی پوریا بھی نہیں لٹک رہا تھا۔ وہاں کوئی آدم زاد بھی نظر نہیں آتا تھا۔ میں چبوترے کے قریب آ کر رک گیا۔ مجھے ایک جانب دیئے کی مدھم روشنی میں ایک کنوئیں کی چرخی نظر آئی۔ یہاں ایک کنواں بھی تھا۔ شاید یہ کوئی تکیہ تھا۔ فسادات کی وجہ سے یہاں جو ملنگ درویش وغیرہ رہتے تھے وہ یا تو قتل ہو گئے تھے یا بھاگ کر پاکستان چلے گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ جھونپڑی کے اندر دیکھنا چاہیے اگر جھونپڑی خالی ہو تو یہاں بڑے آرام سے میں رات بسر کر سکوں گا۔

جیسے ہی میں جھونپڑی کی طرف بڑھا۔ پیچھے سے کسی مرد کی بھاری آواز آئی۔
”کون ہے تو؟“

میرے قدم وہیں رک گئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دیئے کی روشنی میں مجھے ایک آدمی نظر آیا جس کا سرمندہا ہوا تھا۔ بدن پر درویشوں والا سیاہ لبا کرت اور تہہ تھا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں جیسے ہی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے مجھ سے پختابی میں بات کی تھی۔ میں نے پختابی میں ہی جواب دیا۔
”مسافر ہوں۔ یہاں لگی تھی پانی پینے آ گیا ہوں۔“
”یہاں بیٹھ جا میں تمہیں پانی پلاتا ہوں۔“

چبوترے پر صف بھی ہوتی تھی۔ میں صف پر بیٹھ گیا۔ وہ آدمی جھونپڑی کے اندر گیا اور میرے لیے کسی مٹکے میں سے مٹی کے آنسو ہری میں پانی بھر کر

یہ بڑا لبا سفر تھا مگر جان کا خطرہ صرف مراد آباد تک ہی تھا۔ اخبارات کے ذریعے معلوم ہوتا تھا کہ آگے گورکھ پور کے علاقے میں اتنے زیادہ فسادات نہیں ہو رہے۔
بہر حال مجھے کسی نہ کسی طرح کیلاش پریت پہنچنا ہی تھا۔ سوال یہ تھا کہ جالندھر انبالے تک کیسے پہنچا جائے۔ پاروٹی کے ساتھ امرتسر کی طرف سفر کرتے ہوئے میں نے دیکھ لیا تھا کہ ان دونوں شہروں میں ہندو سکھ مسلمانوں کا قتل عام کر رہے تھے اور ان شہروں میں ایک بھی مسلمان نہیں بچا تھا۔ سب سے پہلے مجھے جالندھر پہنچنا تھا۔ میں وہاں تک پیدل نہیں جاسکتا تھا۔ ریلوے لائن کے ساتھ چلتے چلتے میں تھا تو نہیں تھا مگر اندھیرے میں میرے پاؤں بار بار پتھر وپ پر پڑ رہے تھے۔ وہاں کوئی روشنی وغیرہ بالکل نہیں تھی۔ دونوں جانب اندھیرے میں ڈوبے ہوئے کھیتوں کا سلسلہ تھا۔

میں نے غلطی کی جو شام کے وقت اس طرف نکل آیا۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں کمپنی باغ میں کسی جگہ درختوں میں چھپ کر رات گزار دیتا۔ بار بار یہی افسوس ہو رہا تھا مگر اب واپس کمپنی باغ بھی نہیں جاسکتا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ شہر میں کرفیولگ گیا ہو۔ چلتے چلتے مجھے ایک طرف کھیتوں میں کچھ فاصلے پر جھلملاتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔

میں رک کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ یہ کسی گاؤں کی روشنی نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر گاؤں کی روشنی ہوتی تو اس کے ساتھ دو تین اور روشنیاں بھی ضرور نظر آتیں۔ یہ ایسی روشنی تھی جیسے کسی نے درختوں کے اندھیرے میں کوئی چراغ جلا رکھا ہے۔

میرے قدم بے اختیار اس روشنی کی طرف اٹھ گئے۔ میں اونچی ریلوے لائن سے نیچے اتر کر روشنی

مجھے وہاں جان کا خطرہ ہے۔“
 ”جان کا خطرہ تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ آدمی کو کہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں جان کا خطرہ ہے اور کہیں معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں بھی جان کا خطرہ ہے۔ تم کس خطرے کی بات کر رہے ہو؟“
 یہ پراسرار آدمی پھر معرفت کی باتیں کرنے لگا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آ سکتی تھیں۔ میں نے کہا۔
 ”اچھا آپ یہ بتائیں کہ کرتار پورے کا اسٹیشن یہاں سے کتنی دور ہے؟“
 وہ کہنے لگا۔ ”رات یہاں پڑے رہو۔ صبح بتا دوں گا تم کو بھوک لگی ہوگی تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔ مجھے مہمان زہر لگتے ہیں اور مہمانوں کی خدمت کرنا تو بہت ہی زہر لگتا ہے مگر تم مجھ پر مصیبت بن کر نازل ہو گئے ہو تو تمہیں کچھ نہ کچھ کھلانا ہی پڑے گا۔“
 یہ کہہ کر وہ جھوپڑی میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں تھالی تھی جس میں گرم گرم کابلی چنوں کا پلاؤ تھا۔ پلاؤ میں سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ خدا جانے اندر کوئی دیگ پک رہی تھی کہ جہاں سے وہ گرم گرم پلاؤ نکال کر لے آیا تھا۔
 ”لو کھاؤ۔“
 اس نے تھالی میرے ہاتھوں میں تھادی۔
 ”اب تمہارے لیے پانی بھی اندر سے لانا پڑے گا۔ بڑی مصیبت ہے۔“
 میں حیران ہو رہا تھا کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے۔ جب میں کھانا کھا چکا تو اس نے مجھ سے کہا۔
 ”تمہیں ڈر لگا ہے کہ کہیں رات کو سکھ کر تمہیں مار نہ ڈالیں اس لیے تم جھوپڑی میں جا کر سو جاؤ۔ میں باہر سو جاؤں گا۔“
 جھوپڑی میں ایک جھلنگ چار پائی پڑی تھی جس

پر نہ کوئی بستر تھا نہ ٹکیا باہر سے اس آدمی کی آواز آئی۔
 ”تیکے کی جگہ بے شک باہر سے ایک اینٹ لے جاؤ۔“
 خدا جانے یہ بات اس آدمی نے طنز کے انداز میں کہی تھی یا واقعی وہ چاہتا تھا کہ میں اینٹ کا سربان بنا کر سوؤں۔ بہر حال میں نے جھوپڑی کے جس اور گرمی میں رات کاٹ دی۔ صبح اٹھا تو وہ آدمی چوہرے کی صف پر ایک طرف بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔
 ”نہانا ہے تو کنوئیں پر بوتے نکال کر نہالو۔“
 میں نے صرف منہ ہاتھ ہی دھویا پھر میں اس کے پاس آ کر صف پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔
 ”کرتار پورہ یہاں سے کتنی دور ہوگا؟“
 ”دس پارہ میل تو ہوگا۔ سوچ لو۔ پیدل جاؤ گے تو راستے میں تمہیں سکھ مار ڈالیں گے۔“
 میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔
 ”اچھا میں تمہارے لیے چائے لاتا ہوں۔“
 وہ جھوپڑی کے پیچھے درختوں میں چلا گیا۔ واپس آیا تو ہاتھ میں تین کاٹرے تھا۔ جس میں چائے کی چینک دو پیالیاں اور ایک بن پڑا تھا۔
 ”یہ لو ناشتہ کر لو۔ میں تو صرف چائے پیوں گا۔“
 میں بڑا حیران ہو رہا تھا کہ یہ شخص گرم گرم چائے کہاں سے لے آیا ہے۔ پیچھے درختوں میں مجھے تو کوئی چائے کی دکان نظر نہیں آ رہی تھی۔ اگر اس نے چوہے پر خود بنائی تھی تو اتنی جلدی وہ چائے نہیں بنا سکتا تھا۔ جتنی جلدی وہ چائے لے کر آیا تھا۔ رات کو بھی جھوپڑی سے وہ کابلی چنے کا پلاؤ لے آیا تھا۔ میں نے جھوپڑی میں صبح کی روشنی میں اچھی طرح دیکھا تھا وہاں کوئی پلاؤ کا دیگ وغیرہ نہیں تھا۔

پانی کا مڈکا بھی نہیں تھا۔ میں نے بن کے ساتھ چائے پی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔
 ”تم ابنا لے کیا لینے جا رہے ہو؟“
 میں نے یونہی کہہ دیا۔
 ”وہاں میرے کچھ رشتے دار پھنسے ہوئے ہیں انہیں نکالنے جا رہا ہوں۔“
 وہ ہنسنے لگا۔ سگریٹ کا کش لگا کر بولا۔
 ”جھوٹ بولنے سے تمہیں کیا مل گیا ہے؟“
 میں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور کہا۔
 ”کیا پاکستان سے آنے والی ہندو سکھوں کی ریفیو جی ٹرین کرتار پورے پھرتی ہے؟“
 ”کیوں نہیں پھرتی گی۔ یہ شرناتھیوں کی بلائیں تو جگہ جگہ اتر رہی ہیں۔“
 ابھی دھوپ زیادہ تیز نہیں ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ زیادہ گرمی ہونے سے پہلے پہلے کرتار پورے کے جتنا نزدیک پہنچ سکتا ہوں پہنچ جاؤں۔ میں اس آدمی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے ہاتھ ملانے لگا تو اس نے اپنا ہاتھ آگے نہ بڑھایا۔
 ”ٹھیک ہے ہاتھ ملانے کی کوئی ضرورت نہیں اب تم جاؤ نہیں تو سکھ جائیں گے۔ سکھائے تو میں تو بڑے رام سے مر جاؤں گا۔ تم بڑا شور مچاؤ گے۔“
 میں وہاں سے آگے روانہ ہو گیا۔
 میں کھیتوں کھیت چلتا ایک بار پھر ریلوے لائن پر آ گیا۔ ریلوے لائن پر چلنا زیادہ محفوظ تھا اور اس طرح میں راستے سے ہٹ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ دھوپ نکل ہوئی تھی۔ گرمی بڑھ گئی تھی۔ مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ ارد گرد بڑی ویرانی تھی۔ کھیتوں میں کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ دور دور کہیں کہیں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ فضا میں موت کا خوف طاری تھا۔ مجھے لائن پر کچھ دور ریلوے کا سگنل دکھائی دیا۔ یہ کوئی اسٹیشن تھا۔

جلدی اپنا سامان اتار رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ پاکستان سے جو ہندو سکھ انڈیا آ رہے تھے وہ اپنا سامان بھی ساتھ لا رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ رواداری مسلمان کے خون میں شامل ہے۔ وہ معاف کرنا بھی جانتا ہے اور دشمن سے انتقام لینا بھی جانتا ہے۔ مسلمان کے دل میں خدا کا خوف ہوتا ہے جبکہ میں اس حقیقت کا شاہد ہوں یعنی گواہ ہوں کہ سن 47ء کے فسادات میں سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کو بڑی بے دردی سے شہید کیا تھا۔ بچوں تک کو معاف نہیں کیا تھا۔ میں نے درختوں پر محصور بچوں کی شکنی ہوئی لاشیں دیکھی ہیں۔ میں یہ لاشیں پاکستان کی نئی نسل کے ان نوجوانوں کو دکھانا چاہتا ہوں جو انڈیا کی فلمیں اور انڈیا کے گانے نہ صرف گھروں میں لے جا کر دیکھتے اور سنتے ہیں بلکہ ان گانوں پر ڈانس بھی کرتے ہیں۔ میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ انڈیا کے گانوں پر نہیں بلکہ اپنے آباؤ اجداد کی لاشوں پر رقص کر رہے ہیں جنہیں انڈیا کے ہندو سکھوں نے قتل کر دیا تھا۔

مجھے اس ٹرین میں بیٹھنا تھا کیونکہ یہ ٹرین آگے جا رہی تھی۔ میں ایک ڈبے میں گھس کر فرش پر بیٹھ گیا۔ کیونکہ وہاں کوئی دوسری جگہ نہیں تھی۔ ٹرین تھوڑی دیر بعد چل پڑی۔ ایک سکھ نے مجھے گھور کر دیکھا اور پنجابی میں پوچھا۔

”کہاں سے آئے ہو تم؟“

میں نے پنجابی میں کہا۔

”جی میں لاہور سے آ رہا ہوں۔“

”وہاں کہاں رہتے تھے؟“ سکھ نے پوچھا۔

میں نے محسوس کیا کہ اسے مجھ پر کچھ شک ہو رہا ہے کہ میں ہندو نہیں ہوں۔ خدا جانے شاید میری شکل پر لکھا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ میں لاہور کی

ایک ایک گلی ایک ایک بازار سے واقف تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کون سے محلے میں ہندوؤں کی اور کون سے علاقے میں سکھوں کی آبادی زیادہ ہے۔ میں نے کہا۔

”سنت نگر میں ہمارا مکان تھا جی مسلمانوں نے اسے آگ لگا دی۔ میرے ماما پتا جی بھی میرے ساتھ ہی نکلے تھے۔ انہیں کی طرف جاتے ہوئے وہ مجھ سے بچھڑ گئے۔“

سکھ مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک پوٹلی کھول کر مین کا ڈبہ نکالا۔ اس میں وال کے ٹین لڈو تھے۔ ”یہ لو تم بھی کھاؤ۔“

میں ایک لڈو لے کر کھانے لگا۔ ٹرین آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ سکھ کے ساتھ اس کی میلی اور دوسرے ہندو سکھ شران تھی بھی بیٹھے تھے۔ وہ سب پاکستان کے خلاف باتیں کر رہے تھے۔ اگر کوئی ان میں سے میری طرف دیکھتا تو میں ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ اس طرح ٹرین کبھی تیز بھی آہستہ چلتی کبھی رکتی رات کے وقت انبالے پہنچی۔ یہاں سے مجھے مراد آباد کے لیے گاڑی بدلتی تھی۔ میں ڈبے سے اتر گیا۔ سانپ کی شکل میں پاروتی کی کٹی ہوئی لاش یعنی سانپ کے جسم کے دونوں ٹکڑے رومال میں بندھے میری جبب میں تھے۔ مراد آباد میں بھی بڑے خوفناک فسادات ہوئے تھے۔ انہیں پرویرانی برس رہی تھی۔ اتنا ضرور تھا کہ یہاں سے کلکتہ اور اوپر گورکھپور کی جانب ٹرینیں چل رہی تھیں۔ میں نے ایک قلی سے پوچھا کہ گورکھپور جانے والی ٹرین کس وقت روانہ ہوئی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ مجھے مراد آباد سے لکھنؤ جانا ہوگا، لکھنؤ سے مجھے گورکھپور جانے والی گاڑی ملے گی۔

میرے پاس پیسے موجود تھے۔ میں نے سب سے پہلے انہیں پر ہی تھوڑا بہت کھانا کھایا اور پلیٹ فام کے ایک کونے میں بیٹھ کر لکھنؤ جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ ساڑھے دس بجے ایک گاڑی آئی۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ اس گاڑی نے مجھے آدھی رات کے وقت گورکھپور پہنچایا۔ گورکھپور میں کچھ امن وامان کی صورت تھی۔ یہاں سے کوہ ہمالیہ کی چڑھائی شروع ہوئی تھی۔ پاروتی نے ایک بار مجھے سمجھاتے ہوئے بتایا تھا کہ گورکھپور میں بیرنگ جانے والی چھوٹی لائن کی ریل گاڑی میں سوار ہوں گا۔ بیرنگ سے ایک پہاڑی سڑک اوپر کیلاش پر بت کے مندر کو جاتی ہے۔

گورکھپور اتر کر وہیں انہیں کے مسافر خانے میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ یہاں اتنی گرمی نہیں تھی جتنی پنجاب کے میدانی علاقے میں تھی۔ جس بھی نہیں تھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا مسافر خانے میں کافی لوگ تھے۔ خدا جانے یہ مسافر تھے یا شران تھے۔ مجھے اب ہر جگہ اپنے آپ کو ہندو ہی ظاہر کرنا تھا۔ کیونکہ میں ہندو اکثریت کے علاقے میں سفر کر رہا تھا اور ہندوؤں کے مندر میں جا رہا تھا۔

میں نے وہیں رات گزار دی۔ یہ میں نے معلوم کر لیا تھا کہ بیرنگ کو ایک میٹرنگ یعنی چھوٹی ریلوے لائن والی ٹرین دوپہر کو جائے گی۔ مجھے یہ وقت انہیں پر ہی گزارنا تھا۔ اگرچہ لوگوں کی زبانی معلوم ہو گیا تھا کہ شہر میں امن وامان ہے اور کرفیو بھی اٹھالیا گیا ہے مگر میں شہر میں جا کر اپنے آپ کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ دوپہر کے وقت میں نے مسافر خانے میں ہی تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ پھر بیرنگ جانے والی چھوٹی ڈبوں کی ریل گاڑی میں سوار ہو گیا۔ گاڑی تقریباً خالی تھی۔ میں اپنے ڈبے میں کونے

والی سیٹ پر کھڑکی کے پاس بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اوپر میں جہاں جا رہا تھا ادھر کوہ ہمالیہ کی پہاڑیوں کے دامن میں ہندوؤں کے بڑے مندر تھے۔ گاڑی میں کئی سادھو لوگ بھی بیٹھے تھے۔ وہ بڑے مزے سے چوڑیاں مار کر سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ لوگ ان کی خاطر تواضع کر رہے تھے۔ میرے ڈبے میں سادھو کوئی نہیں تھا۔ مندروں کی پاترا کرنے والے پاتری ہی تھے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ مندر کی مورتیوں پر چڑھانے کے لیے پھولوں کے ہار اور خدا جانے کیا کیا کچھ لے جا رہے تھے۔

گاڑی چلنے لگی تو ایک بوڑھی عورت ڈبے میں آ گئی۔ اس کے سفید بال رسیوں کی طرح کے تھے۔ اس نے ایک کٹھری اٹھائے ہوئے تھی۔ وہ سیدھی میرے ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس عورت کی عمر ساٹھ ستر کے قریب ہوگی۔ رنگ کالا تھا۔ جسم بڑیوں کا ڈھانچہ تھا۔ اس نے گہرے رنگ کی میلی سی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ کٹھری اس نے پاس ہی رکھ دی۔ میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگی۔ اس کے منہ میں چند ایک دانت ہی باقی رہ گئے تھے۔ بولی۔

”بیٹا میں غریب بھلشی ہوں۔ کیلاش ماتا کے درشن کرنے جا رہی ہوں۔“

میں مسکرا کر خاموش رہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

(باقی آئندہ ماہ)

آدھی پڑی

محترمی و مکرمی
عمران احمد صاحب
السلام علیکم!

جب تک آپ کا تعاون رہے گا مفتیشی کہانیاں ارسال کرتا رہوں گا۔ میرے لیے سب سے خوشگوار لمحہ وہ ہوتا ہے جب قارئین کی طرف سے حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ زیر نظر کہانی درس عبرت بھی ہے اور سوچ کے در بھی وا کرتی ہے۔ انسان کو ہر حال میں صراطِ مستقیم پر چلنا چاہیے۔

ریاض ہٹ

تھانے دار بھی انسان ہوتے ہیں، بیماری شیماری سے ان کا بھی واسطہ پڑتا ہے۔ اس دن میں دیر سے تھانے پہنچا تھا کیونکہ رات نزلہ زکام کی وجہ سے طبیعت کافی خراب رہی تھی۔ دوسرے ایک گولی نیند کی بھی کھالی تھی تاکہ پرسکون نیند کے بعد تازہ دم ہوسکوں۔ یہ اس لیے کرنا پڑا تھا کہ رات ایک بجے تک نیند نہیں آ رہی تھی۔ جب میں اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تو مجھے بتایا گیا دو آدمی ایک اطلاع لے کر آئے ہیں، میں نے فوراً انہیں اپنے کمرے میں بلا لیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ایک زیر تعمیر مکان میں ایک لاش پڑی ہے، لاش کیسے دریافت ہوئی اس کا ذکر آگے آئے گا۔

بہر حال میں نے ایک کانٹیل (سلطان محمود) اور دو سپاہیوں کو 'ضروری' تیاری کا حکم دیا۔ ایک گھنٹے کے بعد ہم لاش کا معائنہ کر رہے تھے۔ مکان زیر تعمیر تھا اس میں ایک طرف اینٹوں کا ڈھیر تھا ایک اینٹ کا کونا لاش کی کھوپڑی میں تقریباً تین انچ تک اترا ہوا تھا۔ ایک سپاہی نے لاش کے سر میں سے اینٹ کا کونہ نکالا اور میں نیچے بیٹھ کر لاش کا تفصیلی معائنہ

لاش سے چند گز دور مجھے ایک چیز ملی تھی، جس کا ذکر کرنی الحال مناسب نہیں، لاش کی جامہ تلاشی سے ایک پرس ملا تھا۔ جس میں ایک معقول رقم تھی، علاوہ ازیں ایک سونے کی انگلی لاش کی انگلی میں پڑی تھی۔ میں ایک کھلے صحن والے گھر میں بیٹھ گیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ زیر (مقتول) کا باپ اس وقت اسپتال میں تھا۔ بیٹے کی لاش دیکھ کر وہ بے ہوش ہو گیا تھا اس کی بیوی فوت ہو چکی تھی دو بیٹیاں جو بیاتنی ہوئی تھیں۔

کانٹیل سلطان محمود کو میں نے ادھر ادھر سے معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ جو دو بندے اطلاع دینے تھانے گئے تھے وہ اس وقت میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ گاؤں کے دو معزز اشخاص بھی میں نے پاس بٹھالیے اور سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تھانے میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں پہلے ان کا ذکر ہو جائے۔

زیر تعمیر مکان کا مقدمہ لگا ہوا تھا، ایک اور پارٹی نے زمین کا عدالت میں کیس کیا ہوا تھا اور اسٹے آرڈر لیا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے مکان کی تعمیر کی ہوئی تھی یہ دونوں بندے کسی کام سے قریبی شہر جا رہے تھے، ابھی سورج نہیں نکلا تھا لیکن مشرق میں پھیلی سرخی سورج کی آمد کا گویا اعلان کر رہی تھی۔

ان میں ایک کی نظر زیر تعمیر مکان کے اندر پڑی اور اس نے دوسرے کو اس طرف متوجہ کیا۔ اس طرح لاش دریافت ہوئی تھی۔ انہوں نے مقتول کو پہچان لیا اور مقتول کے باپ کو اطلاع دی، وہ دوڑا دوڑا (ان کے ساتھ) زیر تعمیر مکان میں آیا۔

بہر حال باقی باتوں کا ذکر آچکا ہے۔ دونوں میں ایک کا نام کرامت جب کہ دوسرے کا بشیر تھا۔

”ہاں تو بشیر صاحب!“ میں نے ایک کو مخاطب کیا۔ ”جب آپ دونوں لاش کے پاس پہنچے، میرا مطلب ہے گرے ہوئے آدمی کے پاس پہنچے تو کیا اس میں زندگی کی کوئی رُمق باقی تھی؟“

”نہیں تھانے دار صاحب! بالکل نہیں۔“

”آپ زیر کے پڑوسی ہیں آپ کے خیال میں زیر کیسا تھا؟ میرا مطلب ہے کردار کے لحاظ سے.....“ میں نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تھانے دار صاحب! زیر کی کبھی کوئی بات ایسی ویسی ہمارے کانوں تک تو نہیں پہنچی، آگے دلوں کا حال تو صرف وہ باری تعالیٰ ہی جانتا ہے۔“

”دونوں نے یک زبان ہو کر کہا، لگتا تھا وہ کچھ نہ کچھ چھپا رہے ہیں۔ اب میں دونوں معزز آدمیوں کی طرف متوجہ ہوا۔

”ہاں جی! آپ اس معاملے میں کیا کہتے ہیں؟“

دونوں کی عمریں پچاس سے اوپر تھیں۔ سرخ و سفید رنگ کے مالک تھے۔

”دیکھیں جی! ہمارا جواب بھی وہی ہے، جو بشیر اور کرامت کا ہے، ایک نے دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، دوسرے نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

”البتہ.....“ اس نے تھوک نگلا۔ پھر دھیسے لہجے میں گویا ہوا۔ ”یہ زمین اصل فساد کی جڑ ہے، یہ ایک بیوہ کی زمین ہے جو چوہدری افضل دہا کر بیٹھا ہوا ہے، ہم نے کئی بار اس کو سمجھایا کہ کچھ خدا کا

خوف کرو زمین حق دار کو دے دو لیکن.....“ وہ خاموش ہو گئے۔

”میں ساری بات سمجھ گیا ہوں آپ کے خیال میں زیر اس زمین کی وجہ سے مارا گیا ہے لیکن کیا وہ بیوہ اتنی طاقتور ہے؟“ میں نے ایک اہم سوال کیا۔

”تھانے دار صاحب! ہم اس معاملے میں مزید کچھ نہیں کہہ سکتے آپ اپنی تفتیش کریں، ہم مجبور ہیں۔ چوہدری افضل (زیر کا باپ) بڑی پہنچ والا ہے۔“

میں ان کی مجبوریاں سمجھ گیا تھا، قارئین بھی سمجھ گئے ہوں گے۔ کانٹیل محمود آ گیا تھا اور ہم وہاں سے اٹھ کر تھانے میں واپس آ گئے۔

ہم پولیس والوں کے بھی عام آدمی کی طرح مسئلے مسائل ہوتے ہیں۔ ان دنوں اے ایس آئی رانا تنویر چھٹی پر تھا، اس کی ساس بہت بیمار تھی۔

جتنے سوال و جواب میں نے لکھے ہیں ان سے کہیں زیادہ کہے تھے۔ صرف چیدہ چیدہ اور اہم سوال و جواب تحریر کے دائرے میں لایا ہوں۔

اس وقت دن کے تین بج چکے تھے کھانے اور چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں تھانے کے دوسرے کاموں میں الجھ گیا۔

اس دن کا اختتام (اس کیس کے سلسلے میں) صرف اس اطلاع پر ہوا تھا کہ چوہدری افضل کو ہوش آ گیا تھا لیکن انھی ڈاکٹروں نے اسے سکون آور ادویات پر رکھا ہوا تھا کیونکہ اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔

وہ کہتے ہیں نا کہ وقت کی رفتار کو کوئی نہیں روک سکا ہے سو دوسری صبح آ گئی تھی اور میں اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

کانٹیل سلطان محمود کو میں نے بلالیا تھا اور اس وقت وہ میرے سامنے اینٹن کھڑا تھا۔

”سلطان محمود! اب ذرا اپنی حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں اس کیس کے سلسلے میں مجھے اور قارئین کو روشناس کراؤ۔“

”سر! زیر کے متعلق کوئی ایسی ویسی بات کسی نے نہیں بتائی وہ باپ سے ذرا مختلف ہے کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا تھا اور در پردہ غریبوں اور ناداروں کی مدد کرتا تھا بلکہ سر! ایک بندے نے بات کو خفیہ راز میں رکھنے کے وعدے پر یہ بھی بتایا ہے کہ زیر بھی اس بات کے حق میں تھا کہ بیوہ کی زمین واپس کر دی جائے۔“

”اچھا۔“ میں نے ہنکارا بھرا۔ ”اصل سوال یہ ہے کہ وہ رات کے وقت وہاں کیا کر رہا تھا؟“

”سر! یہی سوال اہم ہے میں نے اپنے طور پر پتا کیا ہے وہ کسی نشے کا عادی بھی نہیں تھا۔ یہ میں نے اس لیے کیا تھا کیونکہ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے وہاں کسی نے پیٹھ کر ہیر وٹن پی تھی۔“

”ہاں یہ بات تو تم نے بڑی اچھی کی لیکن کیا تمہارے خیال میں اس واردات میں کوئی ہیر وٹنچی ملوث ہو سکتا ہے۔“ میں نے سلطان محمود کو شاباش دینے کے بعد استفسار کیا۔

”سر! یہ بات قرین قیاس نہیں لگتی کیونکہ لاش کی جیب میں ایک بھاری رقم اور انگلی میں سونے کی انگلی جوئی کی توں موجود تھی۔“ پھر اس نے مجھے کھروں کے متعلق بتایا۔ اس کے بعد میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

قارئین! کچھ باتوں کو میں نے جان بوجھ کر مخفی رکھا ہے۔ مناسب وقت پر اس کا ذکر آئے گا۔

شام تک پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی۔ موت کا باعث وہی اینٹن تھی جس کا کونا تین انچ تک لاش کی کھوپڑی میں گھس گیا تھا اور پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر نے لکھا تھا، موت بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ موت کا وقت رات تین اور چار کے درمیان لکھا تھا۔ ظاہر ہے پوسٹ مارٹم کے ساتھ لاش بھی آ گئی تھی۔ لاش وارث لے کر چلے گئے اور مجھے اس واردات کے ساتھ مغز کھپانے کے لیے چھوڑ گئے۔

زمین اس واردات کا باعث ہو سکتی تھی لیکن زیر تو زمین دینے کے حق میں تھا۔ اب کیس ایک سانچ پر آ گیا تھا کہ مجھے زیر کے دوستوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔

شام تک زیر کے دونوں دوست اختر اور ساجد آ گئے۔ میں نے دونوں کو اکٹھا بٹھالیا۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ انہیں اپنے دوست کے مرنے کا بہت دکھ ہے۔ میں نے وقت کے تقاضے کو نبھاتے ہوئے دونوں کے ساتھ اظہارِ افسوس کیا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے ان کے دل سے تھانے کا خوف دور کیا۔

”دیکھو اختر اور ساجد! میں اس طرح دو دو بندوں کو ساتھ بٹھا کر سوال و جواب نہیں کرتا لیکن تم دونوں کی حالت اور شرافت دیکھ کر دونوں کو اکٹھا بٹھالیا ہے مجھے امید ہے تم ہر بات سچ بتاؤ گے۔“

”جناب! ہمیں جو علم ہے ضرور بتائیں گے ہمارا دوست مر گیا ہے۔ وہ بہت اچھا تھا ہمارا بہت خیال رکھتا تھا، میں ایک موچی کا بیٹا ہوں اور یہ ساجد ایک کمہار کا۔“ اختر نے ساجد کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا کہ دونوں کی آنکھوں میں دلوں کا درد پانی بن کر پھٹک آیا ہے۔

”لیکن زیر نے کبھی اس کے متعلق نہیں سوچا تھا، ہمیں دوستوں سے زیادہ بھائیوں کی طرح رکھتا تھا۔“

”وہ اپنے دل کی ہر بات تم دونوں سے کرتا ہوگا، ذرا یہ تو بتاؤ کیا زیر کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا؟“

”جناب! ایک لڑکی فائزہ سے وہ محبت کرتا تھا لیکن یہ نیل موٹے نہیں چڑھ سکی تھی فائزہ کی ممکنگی ہو چکی تھی اور اب اس کی شادی ساتھ ہو چکی ہے۔“ اختر نے جواب دیا۔ زیادہ تر اختر ہی بولتا تھا۔

”فائزہ کہاں کی رہنے والی ہے؟ میرا مطلب ہے اس کا میکہ کہاں ہے؟“

”اسی گاؤں میں جناب! اور اس کا سسرال بھی اسی گاؤں میں ہے۔“

”کیا فائزہ شادی کے بعد بھی زیر سے ملتی تھی؟“ میں نے اختر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تھانیدار صاحب!“ ساجد نے پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے کہا۔ ”با خدا ہمارے علم میں ایسی کوئی بات نہیں، ہمیں تو زیر نے یہ بات بتائی تھی کہ وہ فائزہ کے راستے سے ہٹ گیا ہے۔ وہ اس کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتا۔“ اس کے بعد میں نے انہیں جانے کی اجازت دے دی تھی۔

اور بات یاد آجائے تو وہ تھانے میں آ کر ضروری اور فوری بتائیں۔

دونوں کی باتوں سے میں متاثر ہوا تھا اور زبیر کی شخصیت کا جو نقشہ انہوں نے کھینچا تھا وہ بھی زبیر کی شخصیت کو ایک اچھا، ہمدرد اور غریب پرور ظاہر کرتا تھا لیکن بندہ تو مرا تھا اور اس کی وجہ مجھے معلوم کرنا تھی۔

میں نے اپنی ایک منجر عورت کو بلالیا، یہ وہی عورت تھی جس کا ذکر میری تفتیش کہانی زرگزیدہ میں آچکا ہے۔

میں نے اسے ایک چیز دے کر ساری بات سمجھا دی اسے پتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے؟ اور کیسے کرنا ہے؟ اسے یہ بھی کہا کہ میں فائزہ سے ملنا چاہتا ہوں ابھی میں ادھر ادھر تفتیش کے گھوڑے دوڑا رہا تھا کسی بات کسی سراغ کی تلاش میں یہ سب تو کرنا پڑتا ہے۔

شام ڈھلے میں سپاہی خورشید کو لے کر بہوہ (جس کی زمین کا جھگڑا تھا) کے گھر پہنچ گیا۔ ہم سادہ لباس میں تھے بیوی کا نام مجھے خدیجہ معلوم ہوا تھا۔

اس نے ہمیں ایک سادہ سی بیٹھک میں بٹھایا، خدیجہ کی عمر کا انداز میں نے پچاس اور باون کے درمیان لگایا۔ رنگ تھوڑا سا ٹولا تھا آنکھیں چھوٹی اور ماتھا چوڑا تھا۔ اس وقت اس نے جامنی کلر کے کپڑے زیب تن کیے ہوئے تھے اسے دیکھ کر پاکیزگی کا اچھا تاثر ابھرتا تھا۔ وہ ہماری خاطر تواضع کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے منع کر دیا تھا۔

”دیکھیں محترمہ! آپ یہ نا سمجھیں کہ ہم آپ کو پریشان کرنے آئے ہیں ہم نے آپ کی عزت کا

خیال کیا ہے خود آگئے ہیں اس لیے مجھے امید ہے کہ آپ ہم سے تعاون کریں گی۔“

”کس قسم کا تعاون تھانے دار صاحب!“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جو باتیں میں آپ سے پوچھوں وہ بالکل سچ سچ بتائیں۔“ میں نے لہجہ سختی الامکان نرم رکھتے ہوئے کہا۔

”تھانے دار صاحب! میں آپ کے ہر سوال کا جواب بالکل صحیح دوں گی لیکن اگر آپ اس شک پر آئے ہیں کہ زبیر والے معاملے میں میرا کوئی ہاتھ ہے تو اس کی میں ابھی وضاحت کر دوں۔

زبیر بہت غریب پرور اور اچھا بچہ تھا اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے لیکن اس کی نیکی اور تعاون مجھے یاد ہے اور میں اسے مرتے دم تک یاد رکھوں گی۔“ خدیجہ نے اپنی آنکھوں میں آتے ہوئے آنسوؤں کو چادر کے پلو سے جذب کرتے ہوئے کہا۔

”کون سی نیکی اور تعاون؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تھانے دار صاحب! زبیر کہتا تھا کہ ظالم اس وقت تک ظالم ہے جب تک اس کا ظلم برداشت کیا جائے جب اس کے مقابلے میں کھڑے ہو جاؤ تو وہ ریت کی دیوار بن جاتا ہے۔ اس نے مجھے زمین کا مقدمہ کرنے کے لیے تیار کیا تھا اور یقیناً جانیں سارا خرچہ بھی وہی برداشت کر رہا تھا۔

میں ذرا حیران نہیں ہوا کیونکہ ماہر نفسیات اور تھانے داروں کے لیے انسان کی کوئی بھی بات ناقابل یقین یا اچھی نہیں ہوتی۔ زبیر جیسے کردار چاہے آٹے میں نمک کے برابر ہی کیوں نہ

ہوں لیکن ہوتے ضرور ہیں۔

یہاں میں بات کو ذرا مختصر کرتا ہوں خدیجہ نے زبیر کی نیکی کے متعلق یہ بتایا کہ اس کی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں اس نے مالی امداد کی تھی۔

بہر حال خدیجہ کے گھر سے ہمیں اس کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوا کہ زبیر کی شخصیت کے اچھے پہلو ہمارے سامنے آ گئے۔ جب ہم نے تھانے میں قدم رکھا تو کافی رات ہو چکی تھی۔ میں شبینہ ڈیوٹی والے ہیڈ کانسٹیبل کے سپرد تھانے کا انتظام انصرام کر کے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

ایک عجیب و غریب کیس تھا۔

اچھی طرح مجھے بتایا گیا کہ رات زبیر کو منوں مٹی تلے دبا دیا گیا تھا۔ یہاں ہماری عبرت کے لیے ایک بات ہے ذرا غور سے سنیے گا۔ رات چوہدری افضل اسپتال سے گھر آ گیا تھا اس نے اپنے بیٹے کی لاش کا آخری دیدار کیا تھا لیکن اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اپنے قدموں سے چل کر قبرستان میں جاتا اور اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارتا ایسے جنازے کم ہی ہوں گے جس میں بیٹے کی میت والی چارپائی کے ساتھ باپ کی چارپائی بھی قبرستان میں گئی ہو اور باپ نے دور چارپائی پر لیٹے لیٹے سب کچھ دیکھا ہو اور اپنے دل کے تاثرات آنکھوں کے راستے آنسوؤں کی صورت میں ظاہر کیے ہوں۔

اس وقت دوپہر کے بارہ بج چکے تھے کہ منجر عورت کا پیغام مجھے ملا اس نے مجھے اپنے گھر بلایا تھا میں نے وردی اتاری سفید کپڑے پہنے اور کانسٹیبل سلطان محمود کو بھی ایسا ہی کرنے کے لیے کہا۔

آدھے گھنٹے بعد ہم اپنی منجر عورت کے گھر میں

بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے ہماری خاطر تواضع کا بندوبست پہلے ہی کیا ہوا تھا۔ ابلے ہوئے انڈے گا کر کالوہ اور کشمیری چائے کے ساتھ ہم نے دو دو ہاتھ کیے تو اس شخصیت کو ہمارے سامنے لایا گیا جس کے لیے ہمیں بلایا گیا تھا۔

یہ فائزہ تھی لمبے قد اور خوب صورت آنکھوں والی لڑکی۔ جس کی عمر بیس سال کے قریب تھی اس کے حسن میں سادگی اور شش تھی۔ اگر زبیر اس پر مر مٹا تھا تو یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی فطرت کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔

اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی وہ نیچی نگاہیں کیے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو مروڑ رہی تھی۔ میں نے یہ کہہ کر اس کے دل کا خوف دور کرنے کی کوشش کی کہ دیکھو میں نے تمہیں تھانے میں نہیں بلایا، خود آہوں اور یہ دیکھو جو عورت تمہیں لائی ہے اسے بھی اپنے ساتھ بٹھالیا ہے۔ وہ کچھ نہ بولی البتہ میں نے اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک دیکھ لی تھی میرے لیے اتنا ہی بہت تھا۔

”ہاں تو فائزہ! تم زبیر کے ساتھ محبت کرتی تھیں یہ بات سچ ہے یا.....؟“

”تھانے دار جی! زیر تو پوچھنے کے قابل تھا۔“

پھر جو روٹی تو ہمارے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا بڑی تگ و دو اور مشکل سے منجر عورت نے اسے سنبھالا۔

جب اس کی حالت سنبھلی تو میں نے سوال کیا۔

”تم جانتی تھیں کہ تمہاری منگنی ہو چکی ہے تم نے پھر بھی زبیر کے ساتھ پیار کی پیشکشیں بڑھائیں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”تھانے دارجی! یہ بات اپنے بس میں تھوڑی ہوتی ہے، میرا منگیت اور موجودہ شوہر وحشی ہے، ابھی شادی کو دو مہینے بھی نہیں ہوئے ہیں اس نے ہاتھ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ میں نے تو ماں باپ کی عزت کی خاطر شادی کی ہے ورنہ مجھے تو قیر ایک آنکھ نہیں بھاتا۔“ فائزہ نے گویا اپنا دل چند لفظوں میں کھول کر میرے سامنے رکھ دیا لیکن ابھی وہ بات باقی تھی جس کی طرف میں اسے لانا چاہتا تھا۔ اس وقت لوہا گرم ہو چکا تھا، چوٹ لگانے کی دیر تھی۔

”ہاں تو فائزہ! جو بات میں اب تم سے پوچھنے لگا ہوں وہ بالکل سچ بتانا۔ کیا تم شادی کے بعد بھی زیر سے ملتی رہتی تھیں؟“

”بالکل نہیں تھانے دار صاحب! حالاں کہ میں نے دو تین بار ملنے کی کوشش کی تھی لیکن زیر نے منع کر دیا تھا، کہتا تھا تم اب کسی کی بیوی ہو میں تمہاری زندگی میں زہر نہیں گھولنا چاہتا البتہ اس نے ایک بات کہی تھی..... وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”کون سی بات؟“ میں نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

”وہ کہتا تھا کہ ہو سکتا ہے میں کسی کے ساتھ تعلق بنا لوں کیونکہ آخر میں کبھی جوان مرد ہوں میری بھی خواہشات ہیں لیکن ایک بات میں تمہیں واضح طور پر بتا دوں کہ تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ میں شادی نہیں کروں گا۔“

”یہ کیسے ممکن ہے فائزہ! کہیں تم کچھ بھول تو نہیں رہیں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ گڑبڑا گئی اور حیران نگاہوں سے میری اور بولی۔

طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب تھانے دار جی! میں آپ کی بات..... میرا مطلب ہے سوال کا مفہوم نہیں سمجھی؟“

”اری کوڑھ مغز! میرا سوال اتنا بھی مشکل نہیں ہے کہ تمہیں ارسطو کے دماغ کی ضرورت پڑے تم نے ہی تو کہا ہے کہ شادی کے بعد ملاقات نہیں ہوئی پھر یہ تمام باتیں کیسے تم تک پہنچیں؟“

”اوہ! میں وضاحت نہیں کر سکی۔ دراصل یہ تمام باتیں اس نے مجھے ایک خط میں لکھی تھیں۔“

فائزہ نے جواب دیا۔ لڑکی ذہین تھی بات اچھے طریقے سے کرتی تھی۔

”کیا تم وہ خط دکھا سکتی ہو؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تھانے دار جی! مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا کہ اس کی ضرورت پڑے گی اس لیے میں ساتھ لے آئی ہوں۔“ پھر اس نے مجھے خط نکال کر دے دیا۔

خط کا نفس مضمون وہی تھا جو فائزہ نے مجھے بتایا تھا۔

”یہ تو تم نے اچھا کیا لیکن ایسے خط کو اپنے پاس رکھنا عقل مند ہی نہیں ہے اگر تمہارے شوہر نے دیکھ لیا تو.....؟“ میں نے خط جیب میں رکھتے ہوئے کہا وہ کچھ نہ بولی۔

دراصل مجھے اس خط کی ضرورت پڑ سکتی تھی دوسرے مجھے پتا تھا کہ اگر میں نے فائزہ کو خط دے دیا تو وہ اپنے پاس رکھ لے گی اور وہ خطرہ تو موجود رہتا جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔

ہم نے اسے رخصت کر دیا۔ منجر عورت اس کو رخصت کرنے کے بعد ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی

”جو چیز آپ نے مجھے دی تھی اس کے متعلق فائزہ نے لامی کا اظہار کیا ہے؟“

اس کے بعد ہمارا وہاں کوئی کام نہیں تھا آتے آتے ہم اسے کہہ آئے تھے کہ اس چیز کے متعلق تحقیق جاری رکھے۔ تھانے میں واپس آ کر میں نے کاشیبل سلطان محمود کی ڈیوٹی لگائی کہ اس گاؤں کے تمام ہیروئیں (ہیروئن پینے والوں) کو تھانے لے کر آؤ اور ان سے کڑی پوچھ گچھ کرو۔

چوہدری افضل کے متعلق حوصلہ افزاء اطلاع یہ آئی کہ وہ بات چیت کے قابل ہو گیا ہے یہ اطلاع وہ سپاہی لے کر آیا تھا جس کی ڈیوٹی میں نے اس کام پر لگائی تھی سپاہی کا نام مسعود تھا۔

اسی دن شام ڈھلے میں نے سپاہی مسعود کے ساتھ جا کر چوہدری افضل سے پوچھ گچھ کر لی۔

چوہدری افضل کی اکڑفوں ختم ہو چکی تھی اس نے بات بڑی عاجزی اور دھیمے لہجے میں کی اسے جوان بیٹے کی موت کا بہت دکھ تھا۔ وہ تو لگتا ہے کہ ڈھسے سا گیا ہے وہ کوئی خاص بات نہ بتا سکا

ہم نے گھما پھر کر اس سے سوال کیے تھے لیکن لگتا نہیں تھا کہ اسے اپنے بیٹے کی اس حرکت کا علم تھا کہ بیوہ خدیجہ کو اس نے مقدمہ کرنے پر آمادہ کیا تھا البتہ فائزہ والی بات اس کے علم میں تھی۔ وہ اپنے جیسا کسی کو سمجھتا ہی نہیں تھا اس لیے رشتہ لے کر جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا تھا۔ فائزہ کے خاندان کی اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ ہم نے یہ بھی اندازہ لگالیا تھا کہ وہ کسی قسم کی اداکاری نہیں کر رہا تھا وہ کسی طرح بھی اپنے بیٹے کے معاملے میں ملوث نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ رات بھی گزر گئی اور صبح صبح میں حسب

معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو کاشیبل سلطان محمود نے مجھے رپورٹ دی۔

”سر! اس گاؤں میں صرف تین ہیروئنکی ہیں رات بھر ہم نے ان کے ساتھ محنت کی ہے لیکن وہ تو اپنی جان سے تنگ لگتے ہیں۔ بات بات پر رونے لگ جاتے ہیں وہ کسی طرح بھی زیر والے کیس میں ملوث نظر نہیں آتے“ مطلب ہے کہ.....“ آخر میں اس نے حسب معمول اپنا تکیہ کلام دھراتے ہوئے کہا۔

”میں تمہاری ساری بات کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”انہیں چھوڑ دو اور آفس ہوائے سے کہو کہ چائے لے کر آئے۔“ چائے پی کر سوچنے لگا جو بندہ یا بندی مشتبہ کے زمرے میں آئی یا آتا ہے وہ تفتیش کے بعد چھٹی مچھلی کی طرح ہاتھ سے..... خیر آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

میں اپنی کئی کہانیوں میں لکھ چکا ہوں کہ میں نے ہمت ہارنا اور مایوس ہونا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کیس کے سلسلے میں بھی مجھے امید تھی کہ ان شاء اللہ ضرور حل ہوگا۔

تھانے میں اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں وہ بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں اگلے دو دن اس کیس کے سلسلے میں کوئی مزید پیش رفت نہیں ہو سکی۔

یہاں اس بات کی وضاحت کرنے کا موقع آ گیا ہے کہ جو چیز ہمیں زیر تعمیر مکان سے ملی تھی اس کے سلسلے میں مجھے ایک بات یاد آگئی تھی میں نے سپاہی خورشید کو بھیج کر وہ چیز منگوائی تھی (جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ میں نے وہ چیز منجر عورت کو دے دی تھی)

اس وقت وہ چیز ہاتھ میں تھی اور میں اسے

الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا اور کھروں کے فوٹو بھی میرے سامنے تھے۔ چیز کے متعلق میں ابھی نہیں بتاؤں گا البتہ اتنا بتا دیتا ہوں کہ کھروں میں ایک کھرا کسی عورت کا تھا۔ ایک زیر کا تھا اور ایک کسی اور کا۔ فائزہ کا کھرا اس عورت کے کھرے سے لگا نہیں کھاتا تھا اور یہ کوئی اور ان تین ہیروئینوں میں سے ایک تھا جن کو تھانے میں پکڑ کر لایا گیا تھا اس نے اقرار کیا تھا کہ واردات والی رات کے پہلے پہر تقریباً (آٹھ بجے) اس نے زیر تعمیر مکان کے اندر بیٹھ کر بہروئن پی تھی۔

اس چیز کے اوپر ایک خاص نشانی مجھے محدب شیشے کی مدد سے مل ہی گئی وہ بہت مدہم تھی۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی میں نے سپاہی خورشید کو دوبارہ وہ چیز دے کر کہا کہ دوبارہ مخبر عورت کو دے آؤ اور نشانی کے متعلق اسے بتاؤ۔ لگتا تھا ہم کامیابی کے قریب پہنچ چکے ہیں محدب شیشے کی مدد سے دیکھنے کا خیال مجھے اچانک آ گیا تھا۔ اسے آپ اسی چھٹی حس کا کمال بھی کہہ سکتے ہیں جو تھانے داروں میں ہوتی ہے۔

دوسرے دن مخبر عورت نے حوصلہ افزاء رپورٹ دی۔ میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ حتی الامکان عورت ذات کو تھانے نہ بلایا جائے لیکن بعض اوقات یہ مجبوری ہوتی ہے۔ ہم نے مطلوبہ عورت کو تھانے بلالیا۔

جب وہ میرے سامنے آئی تو میں نے دیکھا اس کی آنکھیں ٹھہر گئی ہیں۔ خوف و ہراس اس کے چہرے پر جم کر رہ گیا تھا وہ کوئی اتنی خوب صورت نہیں تھی قبول صورت کہہ سکتے ہیں عمر پچیس سال ہوگی میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا وہ بڑی مشکل سے بیٹھی بلکہ یوں محسوس

ہوا۔ جیسے ڈھے گئی ہو۔

سپاہی خورشید کمرے میں موجود تھا باہر مخبر عورت بھی آئی بیٹھی تھی۔ میں نے سپاہی خورشید کو کہا کہ مخبر عورت کے ہاتھ ایک گلاس پانی بھیج دے اور کمرے کے باہر موجود رہے جب تک میں نہ کہوں کسی کو اندر نہ آنے دے۔

مخبر عورت پانی کا گلاس لے کر آئی اور میرے اشارے پر عورت کو پانی پلایا۔ اس کی حالت کچھ سنبھل گئی لیکن محسوس یہ ہوتا تھا کہ ابھی بے ہوش ہو جائے گی۔

کمرے کا دروازہ میں نے بند کر دیا اور مخبر عورت کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”ہاں تو خاتون! اب بتاؤ کیا ہوا تھا؟ اس زیر تعمیر مکان میں؟ دیکھو! جھوٹ بالکل نہ بولنا ورنہ یہی عورت جو تمہارے ساتھ بہنوں جیسا سلوک کر رہی ہے، تمہیں الٹا لٹکا دے گی۔“

”تھانے دار صاحب! میں نے کچھ نہیں کیا میں نے زیر کو نہیں مارا نہ ہی میرا ارادہ اسے مارنے کا تھا۔“ اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ہم نے اسے رونے دیا، اس نے اب کہاں جانا تھا وہ پہلی بار کسی تھانے دار کے سامنے تھانے میں بیٹھی تھی اور ایک بے بس اور مجروح پرندے کی مانند لگ رہی تھی۔

اس نے جو کہانی سنائی وہ میں اپنی زبان میں سنا دیتا ہوں۔ عورت کا نام روپی تھا اس کا خاوند کسی یورپی ملک روزگار کے سلسلے میں گیا ہوا تھا ملک کا نام نہیں لکھوں گا البتہ اتنا بتا دیتا ہوں کہ جو چیز ہمیں زیر تعمیر مکان سے ملی تھی وہ ایک پائل تھی اور اس کے اوپر بہت مدہم سا اس ملک کا نام لکھا ہوا

تھا جہاں روپی کا شوہر ملازمت کرتا تھا وہ پائلوں کا بورا وہاں سے ہی لے کر آیا تھا اور روپی کو دیا تھا۔

روپی نے ہمیں بتایا کہ اس کا شوہر تین سال ہوئے گیا ہوا ہے۔ ایک دن اس کی ملاقات زیر سے ہو گئی وہ تین سال سے شوہر کی قربت سے دور تھی زیر اسے اچھا لگا۔ اس کے ساتھ باتیں کرنے کو اس کا جی چاہا زیر بھی عورت کی قربت کو ترسا ہوا تھا جب آگ اور پانی اکٹھے ہوئے تو ملاقاتیں پڑھنے لگیں۔ اس میں محبت والی کوئی بات نہیں تھی، دونوں صرف فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر ملنے لگے لیکن روپی نے ہمیں بتایا کہ زیر نے اخلاقی حد بھی نہیں پھلانگی تھی۔

ان کی ملاقاتیں زیر تعمیر مکان میں ہونے لگیں پھر وہ رات آ گئی جس کی صبح ہمیں زیر تعمیر مکان سے زیر کی لاش ملی تھی۔

روپی نے ہمیں بتایا کہ وہ چودھویں کی رات تھی چاند کی روشنی زیر تعمیر مکان میں کھپ کر رہی تھی وہ قریب قریب بیٹھے تھے قریب ہی اینٹوں کا ڈھیر تھا۔ اس رات روپی کے بقول زیر بہت جذباتی ہو رہا تھا اور وہ بھی موم کی طرح پکھل رہی تھی اچانک اس کی نظر چاند پر پڑی اسے یوں محسوس ہوا جیسے چاند میں اس کے شوہر کی تصویر آ گئی ہو اور وہ اس سے کہہ رہا ہو۔ روپی یہ کیا کر رہی ہو میں تمہاری خاطر پردیس کاٹ رہا ہوں اور تم.....

اچانک جیسے اسے ہوش آ گیا اور اس نے اپنے آپ کو زیر کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا کر رہے ہو زیر! ہوش میں آؤ۔“ لیکن زیر پر پوری طرح جذبات غالب آ چکے تھے شیطان نے اس کے ذہن پر قبضہ کر لیا تھا۔

اس نے گرفت مزید سخت کر دی اور اس کے ہاتھ بیکٹے کو بے تاب ہونے لگے۔

مگر..... روپی اچانک پورا زور لگا کر کھڑی ہو گئی زیر بھی کھڑا ہو گیا اس سے پہلے کہ زیر اس کو دوبارہ اپنی گرفت میں لیتا روپی نے اسے ایک زو دار دھکا دیا اور وہاں سے نکل آئی شاید اس دھینکا مشتی میں اس کے پاؤں سے ایک پائل ٹوٹ کر وہیں گر گئی تھی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ زیر سیدھا اینٹوں پر گرا تھا اور ہو سکتا ہے کوئی اینٹ کھڑی حالت میں ہو۔ ہم روپی کو چھوڑ نہیں سکتے تھے فیصلہ عدالت نے کرنا تھا ہم نے چلان بنا کر روپی کو حوالہ عدالت کر دیا تھا۔

لیجس قارئین! کہانی تو ختم ہو گئی لیکن اس کہانی نے جو تاثرات چھوڑے تھے وہ بھی آپ کو سنا دوں۔ چوہدری افضل نے خدیجہ کو نہ صرف زمین واپس کر دی تھی بلکہ مکان مکمل کر کے دیا تھا۔ ایک دن وہ مجھ سے ملنے آیا تھا اور کہا تھا۔

”تھانے دار صاحب! میرے گناہوں اور غلط فیصلوں کی سزا میرے بیٹے کو ملی ہے۔ آپ دعا کریں خدا مجھے معاف کرے۔ شیطان ہر قدم پر انسان کو بہکا رہا ہے زیر ایک اچھے کردار اور اخلاق کا مالک تھا اسے بھی شیطان نے بہکا دیا تھا۔“

روپی کے متعلق خورشید نے بڑی دلچسپ بات کی تھی اس نے کہا تھا۔

”سر! روپی آدمی ٹیڑھی تھی۔“ قارئین! آپ کا کیا خیال ہے۔

آخری خط

جناب ایڈیٹر مہ افق

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

ایک سچی کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ امید ہے حوصلہ افزائی کریں گے۔ انسان جب شہرت اور دولت کے بھور میں پھنستا ہے تو اسے اپنے گرد صرف قبیحہ اور مصنوعی روشنیاں ہی نظر آتی ہیں لیکن ان روشنیوں کے عقب میں چھپا اندھیرا اسے نظر نہیں آتا اور نہ ہی وہ اس حقیقت کو دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ کہانی بھی ایک ایسی رقصہ کی ہے جو صرف اور صرف مصنوعی مسکراہٹیں ہی دیکھنا چاہتی تھی لیکن جب کسی نے اسے حقیقت سے آشنا کیا تو پھر.....

آپ سے درخواست ہے کہ اس کہانی کو ضرور پڑھنے میں جگہ دیں۔

دعاگو

محمد ثقلین

سیالکوٹ

سیاہ لباس میں اس کا گورابدن یوں چمک رہا تھا گویا کسی اندھیری رات میں ماہ تاب مٹھری پر اتر آیا ہوا اور اس پر اس کا بل کھاتے ہوئے تھرکنا پرستاروں کے سینوں پر چھریاں بن کر برس رہا تھا۔ سارا ہال تماشاخیوں سے کھچا کھچا بھرا ہوا تھا اور دیبا کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ پس پردہ گونجنے والا گانا کالوں کے پردے پھاڑ رہا تھا پوری آواز کے ساتھ گانا بج رہا تھا۔

میں ہوں مغرور لیلی..... چاند کا نور لیلی.....“ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شاعر نے خاص اسی کو خیال میں لا کر گانا لکھا ہوا۔ بلا کی حسین دیا ڈانس کے دوران بار بار اپنے مخصوص انداز میں صراحی دار گردن کو اڑاتے ہوئے اپنے انگ انگ میں چھپے غرور کا اظہار بھی کر رہی تھی۔ یہی غرور اس کے چاند سے چہرے کے تاثرات اور گرما گرم کافی کے دو قطرے جیسی آنکھوں کی دل چیراواؤں سے بھی چمک رہا تھا۔

تماشاخی لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنی سیٹوں پر کھڑے ہو گئے تھے اور خوب سیٹیاں بجا بجا کر اس پری صورت حسینہ کو داد دے کے اظہار پسندیدگی کر رہے تھے۔

”شہناز! جلدی سے کھانا گرم کر دو بہت زور کی بھوک لگی ہے۔“ دیبا نے گھر میں قدم رکھتے ہی بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملازمہ سے کہا جس نے اس کی آمد پر گٹ کھولا تھا۔ بوجھل قدموں سے آنگن چھلانگتے ہوئے جونہی وہ کوریڈور میں پہنچی تو لمحہ بھر کے لیے اس کے قدم رک گئے۔ خلاف معمول آج حسیہ اپنے کمرے کی بجائے کوریڈور میں ہی چائے نماز بچھائے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں بیج تھی اور بیج پڑھتے پڑھتے وہ کھا جانے والی نظروں سے دیا کو گھور رہی تھی۔ لمحہ بھر کو رک کر اس پر نظر ڈالنے کے بعد دیا نظر میں چرائی ہوئی تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں آنے تک حسیہ کی عیسیٰ نظریں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ دیا

نے جب زور سے دروازہ بند کیا تو حسیہ نے نظر اٹھا کر دال نکلا کر کو دیکھا جو ساڑھے بارہ بج رہا تھا۔ اپنا پرس صوفے پر اچھال کر دیا سیدی ڈرینگ ٹیبل کے سامنے جا بیٹھی اور ڈرینگ ٹیبل کے شیشے میں اپنا حسین عکس دیکھ کر خاموش مسکراہٹ کے ساتھ جیولری اتارنے لگی۔ آج وہ معمول سے کچھ زیادہ بے یار و خوش تھی۔ دراصل آج اس کے ایک رئیس پرستار نے شو کے اختتام پر اسے گاڑی گفٹ کی تھی جسے فی الحال وہ حسیہ کے سوالوں سے بچنے کے لیے اپنی ایک فرینڈ کے گھر پارک کر آئی تھی۔ آج مارے خوشی کے اس کی مسکراہٹ چھپائے نہ چھپ رہی تھی آخر جیولری اتارتے اتارتے اس نے اچانک اپنے ہاتھ روک لیے اور اپنے خوب صورت ٹمکس سے مخاطب ہو کر بولی۔

”واہ دیبا واہ! تو اسٹیج پر جا کر دو چار ادائیں کیا دکھاتی ہے لوگ اپنا سب کچھ تم پر وارنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔“ ”تو صرف ادائیں ہی نہیں دکھاتی دیبا! اس نیم عریاں لباس میں اپنے جسم کی نمائش بھی تو کرتی ہے۔“ ”دیبا اپنے ہی حسیں کے نشے میں مست ہو کر یوں خود کلامی میں مگن تھی کہ حسیہ کے کمرے میں داخل ہونے کا اسے احساس تک نہ ہوا جواب اس کے عقب میں دروازے کے قریب کھڑی طنز کے نشتر چھوڑ رہی تھی۔

”تم.....“ ”دیبا چونک کر پلٹی اور گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔“ ”تم یہاں کیوں آئیں؟“

”تمہیں اندازہ بھی ہے کہ آج کس وقت گھر آئی ہو۔“ اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے حسیہ نے اپنا سوال کیا۔ دیبا نے اپنے چہرے کے تاثرات سے بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے ایک تیز سانس خارج کی اور دوبارہ ڈرینگ ٹیبل کے شیشے کی طرف

گھوم کر باقی ماندہ جیولری کھڑے کھڑے اتارتے ہوئے بولی۔

”جاتی ہوں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے شو ختم ہوتے ہوتے کئی بار دیر بھی ہو جاتی ہے اب شواہد اور چھوڑ کر تو نہیں آ سکتی نا۔“ اس بے فکر انداز پر حسیہ تب کر بولی۔

”کچھ تو شرم کر دو دیبا! عیاش مردوں کے سامنے بخش لباس پہن کر ناپنے کا گھٹیا کام اگر تم نے کرنا ہی ہے تو کم از کم وقت پر گھر آ جایا کرو۔“

”تم ہونی کون ہو مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے والی۔“ ”دیبا طیش میں آ کر اس کی طرف پلٹتے ہوئے بولی۔ حسیہ کی سیدھی سیدھی لعن طعن نے اسے سلا گایا۔

”بڑی بہن ہوں تمہاری۔“ حسیہ رعب جھاڑتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا روز روز اتنی رات گئے گھر لوٹنا میں برداشت نہیں کر سکتی۔ تم تو آدھی رات تک نہ جانے کہاں کہاں عیاشیاں کرنی پھرتی ہو مگر مجھے محلے والوں سے طرح طرح کی باتیں سننی پڑتی ہیں۔“

”جسٹ شٹ اپ۔“ ”اب کی بار وہ چیخ ہی پڑی۔ حسیہ کی زبان کی مسلسل بے باکیوں پر وہ بھڑک اٹھی تھی۔ ”میں اپنا کام کرنے جاتی ہوں عیاشیاں کرنے نہیں اور تمہیں میری وجہ سے اب کسی کی بات نہیں سننی پڑیں گی کیونکہ اگلے مہینے سے ہی میں اپنے الگ گھر میں شفٹ ہو رہی ہوں، نہیں رہنا مجھے اس گھر میں جہاں ہر وقت تم میرا دماغ چاٹتی رہتی ہو۔“ ”بہت خوب“ تو اب تم الگ گھر میں اسی رہا کرو گی تاکہ سہولت کے ساتھ دن رات گل چھڑے اڑاتی پھرو اور کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔“ حسیہ جان چکی تھی کہ اب وہ ہتھیے سے اکھڑ چکی ہے پھر بھی اسے لٹاڑنے کا آخری موقع اس نے ضائع نہ کیا اور حسب توقع دیا

تلملا بھی۔

”ہاں ہاں..... اڑاؤں گی گل چھڑے۔ جوجی میں آیا میں کروں گی یہ میری زندگی ہے۔ تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی۔“

حسیہ ساکت کھڑی چند لمحوں کے بعد گھورتی رہی اور پھر مایوسی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بنا کچھ کہے کمرے سے باہر ہو گئی۔ غصے سے لال آنکھوں کے ساتھ دل گرفتہ سی کھڑی دیا گہری سانس لینے لگی۔ حسیہ سے ہونے والی تکرار نے اس کی دھڑکنیں اٹھل پھل کر کے رکھ دی تھیں جنہیں اب وہ لمبے لمبے سانس لے معمول پر لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

حسیہ اپنے کمرے میں آ کر نائیں لٹکاے بیڈ پر بیٹھی دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھک کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دیا کو ایک عرصے تک نرمی و شفقت سے سمجھانا بے سود ثابت ہوا تھا اور حسیہ کا

پیمانہ صبر کچھ دن پہلے سے ہی لبریز ہو چکا تھا۔ اس لیے پچھلے ڈیڑھ مہینے سے دیا کی رات گئے گھر واپسی پر تکرار کا یہ سلسلہ باقاعدگی اختیار کر گیا تھا مگر حسیہ پر یہ انکشاف آج ہی ہوا تھا کہ وہ بہن جسے پچھلے آٹھ

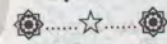
سالوں سے وہ ماں بن کر پال رہی تھی اس سے اس قدر متفرق ہو چکی ہے کہ اسے چھوڑ کر جانے کا پروگرام بنا رہی ہے۔ حسیہ نے ان آٹھ سالوں میں اپنی بساط

سے بڑھ کر اس کی ہر خوشی ہر ضرورت پوری کرنے کی کوشش کی تھی مگر آج وہ بے حد دل شکستہ ہو کہ یہ سوچنے پر مجبور تھی کیا آخر دیا کی تربیت میں اس سے کہاں کوتاہی ہوئی تھی نہ جانے تک اس کی ناک کے نیچے

وہ بے راہ روی کی ان خطرناک راہوں پر گامزن ہو گئی اور اسے علم تک نہ ہوا۔ ہوش تو اسے تب آیا جب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا اور اس کے بعد اسے راہ راست پر لانے کی کوشش بے ثمر ثابت ہوئی۔

تھوڑی دیر کے لیے یونہی بیٹھے بیٹھے دل بک کر کرنے کے بعد اس نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر سے ایک فریم اٹھایا جس میں اس کے پاپا کی مسکرائی تصویر لگی تھی۔ ہچکیاں لیتے ہوئے وہ ہاتھوں میں تھامی تصویر سے مخاطب ہوئی۔

”پاپا! آپ نے دیکھا آپ کی چھوٹی بیٹی کیا کر رہی ہے میرے ساتھ۔ وہ..... وہ مجھے چھوڑ کر جانے کی تیاری میں ہے پاپا! آپ نے آخری وقت میں مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں ہمیشہ دیا کا خیال رکھوں گی مگر وہ میرے پاس ہی نہ رہی تو میں کیسے خیال رکھ پاؤں گی اس کا۔ پاپا اس کے دل میں تو نفرت بھری ہوئی ہے میرے لیے وہ تو مجھ سے جان چھڑانے کی کوششوں میں ہے۔ کیا میں اتنی بری ہوں پاپا کہ وہ مجھ سے تنگ آ گئی ہے۔“



دیا بیڈ کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے نیم دراز ہو کر ابھی تک حسیہ کی کانٹوں کی طرح چھبتی باتیں یاد کر کے دانت پیستے ہوئے اپنے چہرے کے عجیب و غریب زاویے بنا رہی تھی کہ شہناز دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے بولی۔

”بی بی جی! کھانا گرم ہو گیا ہے ڈائننگ ٹیبل پر لگا دوں یا نہیں آپ کے کمرے میں لے آؤں؟“

”نہیں رہنے دو۔ اب بھوک نہیں ہے مجھے۔“ دیا نے انتہائی رکھائی سے جواب دیا۔ حسیہ کی خون چلانے والی باتیں اکثر اس کی بھوک بھی نکل جاتی تھیں اب تو شہناز بھی اس سب کی عادی ہو چکی تھی اس لیے وہ بنا اصرار کے جب چاپ واپس لوٹ گئی مگر کچھ ہی دیر بعد دوبارہ آ گئی۔

”اب کیا ہے؟“ دوبارہ اسے کمرے میں آتے دیکھ کر دیا جھڑکنے کے انداز میں چلائی۔

”وہ..... بی بی جی..... میں۔“ دیا کو اس قدر طیش میں دیکھ کر خوف کے مارے بے چاری کی زبان لڑکھڑا گئی۔ ”میں تو یہ خط دینے آئی تھی دوپہر کو کوئی آپ کے لیے دے گیا تھا۔“

”اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ شہناز کے ہاتھ سے خط کا لفافہ پکڑتے ہوئے وہ قدرے نرم لہجے میں بولی۔ اس سے پہلے کہ پھر سے اس کا لہجہ سخت ہوتا، شہناز نے فوری طور پر وہاں سے رفو چکر ہونا ہی مناسب سمجھا۔ اس کے جانے کے بعد دیا وہ لفافہ ٹٹولتے ہوئے بھیجنے والے کا نام تلاش کرنے لگی۔ لفافے کے ایک کونے میں لکھا تھا ”فرام..... ارجم!“

یہ نام پڑھتے ہی دیا کی پیشانی کی سلوٹیں مدھم مدھم چمکنیں۔ ایک ہی پل میں اس کے چہرے کی ساری جگہ مسکراہٹ میں بدل گئی۔ کچھ ہی دیر پہلے وہ اپنے اور حسیہ کے درمیان پیدا ہونے والی کشیدگی کو یوں بھول گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ بیڈ کی پشت گاہ کا سہارا چھوڑ کے حلق و چو بند ہو کر بیٹھتے ہوئے جلدی جلدی لفافہ کھولنے لگی۔

آئے دن اس کے پرستار اپنے محبت نامے اس کے گھر چھوڑ جاتے تھے جن میں سے اکثر خطوط کو وہ پڑھنے تک کی زحمت نہیں کرتی تھی اور بڑھے بغیر ہی روڑی کی ٹوکری کی نذر کر دیتی کیونکہ سبھی خطوط میں دل پھینک پرستار نے خوشامدانہ الفاظ میں تعریفیں یا پھر گھسے پھسے فنی مکالموں میں اظہار محبت ہی کیا ہوتا تھا جنہیں پڑھ کر اسے یوریت ہونے لگتی تھی مگر ارجم.....

اس کی تو بات ہی الگ تھی وہ ہمیشہ اس کے خطوط فرصت نکال کر پڑھا کرتی تھی اس کا انداز آخری سب سے جدا ہوتا تھا۔ ہر بار اپنے خط میں وہ نت نئے طریقوں سے یوں اس کی تعریفوں کے پل باندھتا کہ دیا کو پہلے سے زیادہ اپنے آپ پر فخر ہونے لگتا۔

دیگر پرستاروں کی طرح ارجم کے خطوط بھی ہوتے تو تعریفوں اور اظہار محبت پر مشتمل تھے مگر انہیں پڑھنے سے وہ بھی اکتانی نہیں۔ اسے یوں لگتا تھا کہ ارجم نے ایک ایک لفظ دل سے لکھا ہے اکثر وہ خط پڑھتے پڑھتے بول اٹھتی۔

”اوہ ارجم! کہاں سے سیکھا تم نے یہ غضب ناک انداز تحریر۔“

ہر بار ارجم کا خط پڑھ کر وہ خود کو کسی اور ہی جہاں کی مخلوق گمان کرنے لگتی۔ پڑھتے پڑھتے وہ بار بار اٹھ کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوتی اور اپنے اندر وہ نئی نئی خوبیاں تلاش کرنے لگتی جن کا ذکر ارجم نے اپنے خط میں کیا ہوتا اور جب وہ بہو وہی خوبیاں اپنے وجود میں تلاش کر لیتی تو اسے شدت سے احساس ہوتا کہ آج تک وہ خود بھی اپنے آپ کو اتنے دھیان سے نہیں دیکھ پائی جتنا کہ ارجم کئی فٹ کی دوری سے ہال میں موجود مٹاشانیوں کے بیچ بیٹھے بیٹھے دیکھ لیا کرتا تھا۔

اکثر ویش تر ارجم اپنے خطوط کے ذریعے اس سے کسی خاص طرز کے بناؤ سنگھار یا مخصوص قسم کے لباس کی فرمائش بھی کیا کرتا تھا جنہیں وہ بڑے شوق سے جان مار کر شو میں پورا کرتی۔ آج کے شو میں بھی اسی کی فرمائش پر اس نے سیاہ رنگ کا لباس زیب تن کیا تھا۔ وہ اکثر خط پڑھنے کے بعد ٹرپ کر کہتی۔

”اور کتنا تڑپاؤ گے ارجم! بس کرو پلیز، نہیں ہوتا مجھ سے مزید انتظار۔“

باقاعدگی سے خط لکھنے کے باوجود ارجم آج تک اس کے سامنے نہیں آیا تھا نہ ہی اس نے کبھی خط میں اپنے بارے میں کچھ لکھا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے گھر خط چھوڑ کر چلا جاتا اور دیا ہر بار اس سے ملنے کے لیے تڑپتی رہ جاتی۔ وہ ہمیشہ اسے امید پر تھی کہ کبھی نہ کبھی وہ ضرور اس کے سامنے آئے گا۔ آج

بھی وہ اسی امید پر بے صبری سے لفافہ کھول رہی تھی کہ شاید آج ارجم نے ملنے کی کوئی تدبیر بتائی ہو، لفافہ ایک طرف پھینک کر وہ خط پڑھنے لگی، لکھا تھا ”ڈیر دیا! آج میں تمہیں آخری بار خط لکھ رہا ہوں۔“

”آخری بار؟“ دیا چونک گئی لیکن اگلے ہی لمحے اپنی حیرانگی پر مسکرا دی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ارجم ہر بار اس کی توجہ پھینکنے کے لیے کوئی منفرد سا انداز اختیار کرتا ہے۔ بلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹک کر پھر سے پڑھنے لگی۔

”ہو سکتا ہے یہ خط پڑھ کر تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم غصے میں آ کر پورا خط پڑھے بغیر ہی پھاڑ دو۔“

ایک سرد آہ بھر کے کمر کے نیچے تکیہ دباتے ہوئے وہ دوبارہ بیڈ کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر بربوئی۔

”تم سے نفرت.....؟ اب یہ تو ناممکن ہے ارجم! تمہاری محبت نے تو مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔ اب تو میرے دل میں تمہارے لیے نفرت کی جگہ ہی نہیں بچی اور تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تمہارا خط پھاڑوں گی۔ کاش تم میرے سامنے آؤ تو میں تمہیں بتاؤں کہ میں کیسے پاگلوں کی طرح تمہارا ہر خط دل سے لگائے رکھتی ہوں تب تک ہر روز تمہارا خط پڑھتی ہوں جب تک تم آگلا خط نہ بھیج دو۔“ ایک بار پھر اس نے خط پر نظریں جمائیں۔

”تمہارا ری ایکشن جو بھی ہو مگر میرے پاس تمہاری جو امانت ہے وہ ہر اندیشے کے باوجود مجھے تم تک پہنچانی ہے۔“

”امانت..... یہ امانت کا کیا چکر ہے؟“ نا سنجی کے انداز میں بربو اکروہ مزید پڑھنے لگی۔

”پیاری دیا! جب تمہیں یہ خط ملے گا تب تک

میں یہ شہر چھوڑ کر جا چکا ہوں گا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“ دیا ہٹھک گئی لیکن پھر یہ سوچتے ہوئے اپنے دل کو تسلی دے کر آگے پڑھنے لگی کہ ہمیشہ کی طرح یہ بھی اس کا اظہار محبت کا کوئی نیا انداز ہوگا۔

”مجھے یقین ہے کہ آج بھی میری فرمائش پوری کرتے ہوئے تم نے کالے کپڑوں میں ہی اسٹیج پر پر فارم کیا ہوگا مگر شاید تمہیں یہ جان کا افسوس ہو کہ میں تمہاری پر فارمنس دیکھنے آج ہال میں موجود ہی نہیں تھا۔“

”اوہ! کمال کرتے ہو ارجم! تمہاری خاطر میں نے اپنا پسندیدہ جوڑا چھوڑ کر کالا رنگ پہنا اور تم دیکھنے ہی نہیں آئے۔“ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے دیا کے چہرے سے ناگواریت جھلکنے لگی اور برا سامنہ بنا کر اس نے اگلی طور پر نظر دوڑائی۔

”دیا! کل رات میں نے ایک عجیب سا خواب دیکھا جسے دیکھ کر میری روح تنک کانپ گئی۔ جانتی ہو میں نے اس خواب میں تمہیں دیکھا اور جب سے بیدار ہوا ہوں بے حد بے چینی سی چھائی ہے۔“

”ہاہاہا.....“ دیا قہقہے لگا کر ہنسنے لگی۔ اس کے چہرے سے ناگواریت کے تاثرات مٹ کر ہلکھلاہٹ میں بدل گئے خود کو قہقہے بولنے لگی۔ ”لو جی! بس یہی کسر باقی تھی اب ہم ان کے خوابوں میں بھی آنے لگے اور بھلا ہم جس کے خوابوں میں آجائیں اس کا چین و سکون کیسے نہ آئے۔“ ایک بار پھر ہلکھلا کر ہنسنے ہوئے وہ خط کی طرف پھر سے متوجہ ہوئی۔

”دیا! اس خواب میں میں نے تمہیں زمین پر نہیں دیکھا شاید تم آسمان کے کسی حصے پر تھیں میں بھی تمہارے قریب کھڑا تھا۔“

”ارے یہ کیا؟ اب دوسرے ایرے غیرے

پرستار کی طرح ارجم بھی ہمیں آسمانوں پر لے جانے کے خواب دیکھنے لگا۔“ دیا چپک کر شرارتی انداز میں خود سے ہم کلام ہوئی۔

”وہ بے حد ہولناک جگہ تھی دیا! میں نے زندگی میں کبھی ایسی ہیبت ناک جگہ نہیں دیکھی درحقیقت وہ جگہ جہنم تھی۔“

دیا کو اچانک ہزارواٹ کا کرٹ لگا خط کو بستر پر ہی ایک طرف پھینک کر وحشت زدہ انداز میں ہڑبڑائی۔

”یہ..... یہ کیا ہو گیا ہے ارجم کو یقین نہیں آتا کہ ایسا بے ہودہ خط ارجم نے لکھا ہے۔“ دو چار گھڑی کے لیے حیرت و ناخوش گواری کے سمندر میں غوطے کے بعد اسے خیال آیا کہ ارجم کا طریقہ تعریف ہمیشہ جدا ہوتا ہے انت نئے انداز سے تعریف کرنا ہی اس کا ہنر ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بھی اس کا تعریف کرنے کا کوئی نیا انداز ہو۔ پُر سوچ انداز میں اس نے پھر سے خط اٹھا کر آگے پڑھنا شروع کیا۔

”میں نے اس جہنم میں کچھ فرشتے بھی دیکھے جنہوں نے تمہیں ایک عجیب قسم کا آگ کا بنا لباس زبردستی پہنا دیا تم چیخنے چلانے لگیں۔“

دیا کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی وہ غصے کے عالم میں خط کو دو حصوں میں پھاڑ کر دائیں بائیں پھینکتے ہوئے دباڑی۔

”افوہ! یہ..... یہ کیا بکواس ہے دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ارجم کا۔ وہ..... وہ مجھتا کیا ہے خود کو اس کی بہت کیسے ہوئی میرے بارے میں ایسی بکواس لکھنے کی؟ میرے سامنے آیا تو میں اس کا خون پی جاؤں گی۔“

دونوں گھٹنے بازوؤں میں جکڑے بیڈ پر بیٹھی وہ دیر تک ارجم کو کوئی رہی ٹھوڑی دیر پہلے تک جسے ایک نظر دیکھنے کے لیے وہ تڑپ رہی تھی اب وہی شخص

اسے زہر لگ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے آئے اور یہ اس کا منہ نوچ لے گہری سانسیں لیتے لیتے جب اس کی بے ہنگم دھڑکنیں ذرا معمول پر لوٹیں تو دماغ بھی قدرے نارمل محسوس ہونے لگا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جو کچھ دیر کے لیے شدید ذہنی تناؤ کے باعث سلب ہو گئی تھی پھر سے بحال ہونا شروع ہو گئی پھر سوچتے سوچتے ایک بھیانک خیال نے اسے چونکا دیا۔

”کیا واقعی ارجم نے میرے متعلق ایسا خواب دیکھا ہے اور اگر دیکھا ہے تو کیا میرا انجام وہی ہوگا جو اسے خواب میں دکھائی دیا۔“

یہ خیال آتے ہی اس نے کانپتے ہاتھوں سے خط کے دونوں ٹکڑے اٹھالے اور انہیں ملاتے ہوئے وحشت سے پھٹی آنکھوں سے وہ خط کا بقیہ حصہ پڑھنے لگی آگے لکھا تھا۔

”آگ کا لباس پہنانے پر تمہارا جسم بُری طرح جھلنے لگا تمہاری کھال گل گل کر ہڈیوں سے اترنے لگی۔ تم درد ناک آواز میں اس قدر زور سے چیخ رہی تھیں کہ تمہاری چیخوں سے جہنم کی دیواریں لرز اٹھیں۔“ خوف سے پھٹی نگاہوں کے ساتھ وہ خط پڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا وحشت زدہ چہرہ ہیبت سے لال ہو رہا تھا مگر اس نے دل ہی دل میں مضبوط ارادہ کر لیا تھا کہ اب وہ مکمل خط پڑھ کر ہی دم لے گی لہذا وہ پڑھتی گئی۔

”جب تمہاری ساری کھال گل کر ہڈیوں سے علیحدہ ہو گئی تو تمہاری نئی کھال پیدا کر دی گئی اور فرشتوں نے دوبارہ تمہیں آگ کا لباس پہنا دیا۔ اسی طرح بار بار تمہاری کھال گل کر اتر جاتی اور فرشتے تمہاری نئی پیدا ہونے والی کھال پر پھر سے آگ کا بنا لباس پہنا دیتے۔ تم تڑپ تڑپ کر چیخ و پکار کر رہی

تھیں۔ یہ سب دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا میں نے بے تاب ہو کر فرشتوں سے پوچھا کہ اسے اتنی سخت سزا کیوں دے رہے ہو تو فرشتوں نے جواب دیا کہ یہ عورت دنیا کی زندگی میں فحش لباس پہن کر لوگوں کے سامنے جاتی اور اپنے جسم کی نمائش کرتی تھی اس لیے اس کے بدکار جسم کو اس کی بے پردگی و بے حیائی کی سزا دی جا رہی ہے۔

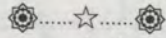
دیا کی آنکھیں برسے لگیں وہ ہلکی ہلکی سسکیاں بھی لینے لگی مگر اس ارادے پر قائم رہی تھی کہ خط مکمل پڑھے گی۔

”پھر کچھ اور فرشتے آئے ان کے ہاتھوں میں کلباڑے کی طرح کے اوزار تھے۔ ان اوزاروں سے وار کرتے ہوئے انہوں نے پنڈلیوں سمیت تمہارے پاؤں کاٹ ڈالے۔ ایک بار پھر تمہاری چیخوں کی آواز سے جہنم کی دیواریں اور زیادہ شدت سے لرزنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد تمہارے کٹے ہوئے پاؤں دوبارہ تمہاری ٹانگوں سے جڑ گئے فرشتوں نے دوبارہ اپنے اوزاروں سے انہیں کاٹ دیا۔ یہ عمل بھی مسلسل دہرایا جانے لگا تمہاری چیخوں سے مجھے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہونے لگا۔

میں نے تڑپ کر فرشتوں سے پوچھا کہ آگ کے لباس کی سزا کیا تھی جو یہ نئی سزا بھی شروع کر دی گئی فرشتوں نے جواب دیا کہ یہ اس عورت کے ان گناہ گار پاؤں اور ٹانگوں کی سزا ہے جن سے یہ ناحق مہینوں کے سامنے ناچ ناچ کر مال و دولت اکٹھا کرتی تھی ابھی اس کی وہ حرام ذرائع سے کمائی ہوئی دولت بھی غلاظت کی شکل میں اسے کھلائی جائے گی۔

مجھ سے تمہارا یہ حال دیکھا نہیں جا رہا تھا اب مزید کچھ دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں بچی تھی اس لیے میں چیختا چلاتا ہوا وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور

دامن پر لگے گناہوں کے یہ گہرے داغ۔“ بے بسی کی عکس کو گھورتی جا رہی تھی۔



حسیہ اپنے پاپا کی تصویر سینے سے لگائے نم آنکھوں کے ساتھ بیڈ پر لیٹ سوئے کی کوشش کر رہی تھی اچانک کچھ ٹوٹنے کی آواز سے وہ چونک کر اٹھی اور بھاگتی ہوئی دیا کے کمرے کی طرف لپکی۔ دیا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے ٹھہری تھی جس کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا اور شیشے کے ٹکڑے دیا کے پاؤں کے گرد فرش پر بکھرے پڑے تھے دیا کا دایاں ہاتھ بڑی طرح زخمی تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔

”یہ..... یہ کیا کیا تم نے..... تم نے..... اپنا ہاتھ زخمی کر لیا۔“ حسیہ بھاگتے ہوئے اس کے قریب آ کے اس کا زخمی ہاتھ پکڑ کر گڑبڑائی۔

”میں اپنے سارے جسم کو زخمی کر دوں گی کاٹ ڈالوں گی اپنے جسم کو چھلنی چھلنی کر ڈالوں گی۔“ دیا چیختے ہوئے بولی اور ٹوٹے ہوئے شیشے کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اپنے جسم پر کٹ لگانے شروع کر دیئے۔

”ارے..... یہ کیا کر رہی ہو..... رک جاؤ۔“ حسیہ نے بمشکل اس کے ہاتھ سے شیشے کا ٹکڑا چھین کر نیچے پھینکا اور اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر بولی۔ ”ہوش میں آؤ دیا! کیوں پاگلوں جیسی حرکتیں کر رہی ہو آخر ہوا کیا ہے تمہیں؟“ گلوگیر لہجے میں دیا باپوی سے بولی۔

”مجھے نفرت ہو گئی ہے اپنے جسم سے شرم آ رہی ہے مجھے اپنے آپ سے میں نجات پانا چاہتی ہوں اپنے اس گناہ کا وجود سے۔“

”نہیں دیا! پاگل مت بنو اپنے ہی جسم کو یوں اذیت دینے سے گناہ دھل نہیں جایا کرتے۔“ وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔

”تو پھر کیا کروں میں حسیہ! کیسے دھوؤں اپنے

شکجہ

برادر مرعمان احمد
امید ہے آپ ٹھیک ہوں گے

زیر نظر کہانی 1971ء سے قبل مشرقی پاکستان آج کے بنگلہ دیش میں ہونے والے ایک قتل کی ہے جو ایک بنگلہ فلمی اخبار میں کئی دنوں تک شائع ہوتی رہی۔ میں نے اسے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے امید ہے آپ کو ضرور پسند آئے گی۔

والسلام
ایم الیاس
کراچی

سورج ڈوبنے میں ابھی بہت دیر باقی تھی۔ موسم بے حد خوش گوار تھا۔ زرناب اور جمال بنگلہ کے باہر کھڑے تھے جو ایک بے حد اونچے ٹیلے پر بنا ہوا تھا۔ ایسے بہت سارے اونچے اونچے پہاڑی ٹیلے رنگامانی میں گھرے موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ایک دوسرے سے فاصلے پر واقع ہیں۔ ان ٹیلوں پر چھوٹے بڑے خوب صورت کالج، جدید طرز کے بنگلے پر شکوہ کوٹھیاں اور شاندار تفریح کے ایسے ہوٹلز تک بنے ہوئے ہیں جہاں زندگی کی ہر قسم کی آسائشیں اور سہولتیں میسر ہیں۔ ان پہاڑی ٹیلوں پر گھرانے فلمی ستاروں، صنعت کاروں، اسمگلروں اور ان دولت مندوں کے ہیں جو بنگلہ دیش کی آزادی کے وقت راتوں رات بہاریوں کو لوٹ کر دولت مند بن گئے تھے۔

رنگامانی پر شہاب بہار کے موسم میں آتا تھا۔ ادھر بارش طویل آتا دینے اور تباہی و بربادی پھیلانے والے موسم کا خاتمہ ہوتا تھا۔ ادھر بہار کے موسم کے ساتھ ساتھ گلابی جاڑے کے موسم کا بھی آغاز ہو جاتا تھا۔ بنگلہ دیش میں موسم سرما میں لوگ سیر و تفریح مناتے اور سیاحت کے لیے اپنے گھروں سے نکلتے ہیں۔ رنگامانی میں نومبر کے آغاز

ہی سے مقامی اور غیر ملکی سیاحوں کی آمد شروع ہو جاتی تھی اور یہاں رونقیں سمٹ آتی تھیں اور ان کا سنہر اجال کسی چادر کی طرح تن جاتا تو ایسا لگتا تھا کہ کوئی دہن اپنا رنگین سا گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہے۔ یہ قدرتی پہاڑی ٹیلے تھے۔ قدرت نے انہیں ہیروں کی طرح تراشا ہوا تھا۔ کیتائی ڈیم بننے کے بعد یہ علاقہ کسی دوشیزہ کی طرح حسین، پر شہاب اور پر کشش ہو گیا تھا۔ اس کا حسن اور شہاب سیاحوں کو یہاں ہر سال کشاں کشاں کھینچ لاتا تھا۔ سیاح خشکی پر آنے جانے کے لیے موٹر بوس اور کشتیاں استعمال کرتے تو پانیوں کا حسن اور بڑھ جاتا تھا۔

اس کی بیوی نے یہ بنگلہ گزشتہ دنوں خرید کر اسے خوب اچھی طرح آراستہ و پیرا کیا تھا۔ اب یہ بنگلہ کسی شاہی محل سے کم نہیں تھا۔ اس کی آرائشی پر زرناب نے پیسا پانی کی طرح بہایا تھا۔ وہ دونوں اس علاقے میں اس لیے آئے تھے کہ ایک مہینہ آرام و سکون سے گزارا جائے۔ آرام و سکون کی خاطر تو اس کی بیوی نے یہ بنگلہ خریدا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس گھر میں فلم کی کوئی بات نہ ہو۔ کسی ڈائریکٹر پروڈیوسر اور پرستاروں کی بھیڑ نہ ہو یہاں ڈولی کا کوئی خیال نہ آئے۔ ڈولی کا خیال بھی آیا تو

اس قدر نہ ستا سکے گا اس لیے یہاں کی پرسکون فضا میں وہ دونوں اس طرح رہے بے ہوش گئے کہ ڈولی کی یاد بھی نہیں آئے گی۔ اگر یاد آئے گی بھی وہ اس قدر نہ ستائے گی جتنا ڈھاکہ میں ستاتی تھی۔

زرناب دور بین آنکھوں سے لگائے مشرقی سمت دیکھ رہی تھی۔ جہاں دور بہت ساری موٹر بوس اور کشتیاں شریچوں کی طرح ادھر ادھر تیزی سے بھاگتی دوڑتی اور گھومتی دکھائی دے رہی تھیں۔ فضا میں رنگین آنچل پرچموں کی طرح لہرا رہے تھے۔ ان میں مرد بچے لڑکیاں اور عورتیں بھی تھیں مگر وہ تو اپنی حسین و جمیل بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ اپنی زندگی میں پہلی بار اسی عورت کو دیکھ رہا ہو۔ اس کے ذہن میں خیالات تیزی سے گردش کرنے لگے تھے۔ آج اس کی بیوی بنگلہ دیش کی سب سے بڑی ہیروئن تھی۔ کل جو ایک بے حد معمولی سی اداکارہ تھی جسے ہدایت کار اپنی فلموں میں لینا بھی پسند نہیں کرتے تھے آج وہ اتنی بڑی اداکارہ بن چکی تھی کہ عزت دولت اور شہرت اس کے قدم چوم رہی تھی۔ زرناب کے پاس اتنی دولت تھی کہ اس کی سمجھ میں خود نہ آتا تھا کہ اسے کیسے اور کہاں خرچ کرے۔ آج تک اس کی فلمی صنعت میں کسی کے نصیب اس طرح نہیں جاگے جس طرح اس کے جاگے تھے۔

زرناب کو اس مقام تک پہنچانے میں اس کا ہاتھ تھا۔ اس نے اس پر بڑی محنت کی۔ اس فلم ساز نے جس نے پہلی بار اس کو اپنی فلم میں بطور ہیروئن لیا تھا۔ اس سے کہا تھا کہ وہ زرناب پر توجہ دے گا اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے گا تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ کل ایک بڑی اداکارہ نہ بن جائے۔ اس فلم ساز نے زرناب کو اپنی فلم میں ہیروئن لے لیا کہ وہ بے حد سستی فلم بنانا چاہتا تھا۔ اس نے زرناب پر

اپنی ساری توجہ مرکوز کر دی تھی۔ ان دنوں وہ نہ تو اتنی حسین نظر آتی تھی اور نہ ہی پرکشش اور پھر اداکاری میں بھی ماہر نہ تھی۔ ایک روز اس نے سیٹ پر غصے میں آ کر اس کے منہ پر چاٹنا بھی دے مارا تھا۔ فلم ریلیز ہوئی تو اس فلم نے غیر متوقع طور پر اتنی زبردست کامیابی حاصل کی کہ بڑی بڑی فلموں کی آمدنی کے ریکارڈ بھی توڑ دیے۔ فلم کے ریلیز ہونے کے چند دن بعد زرناب کا ستارہ فلمی افق پر سب سے زیادہ روشن ستارہ تھا۔ بی کے داس لائن کے تنگ و تاریک فلیٹ کے باہر فلم سازوں کی قطاریں لگ گئیں۔ ایک فلم ساز نے اسے اپنا گلشن کا بنگلہ اپنی کار اور نوکر چاکر بھی دے دیے۔

زرناب نے اس کے احسان کو فراموش نہیں کیا۔ شہرت کی بلندیوں کو چھونے اور بے انتہا دولت مند بننے کے باوجود اس نے اس سے شادی کر لی۔ اس لیے بھی کہ زرناب کے پرستاروں اور دولت مندوں کے لڑکوں نے شادی کے لیے اس کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ لوگ اس کی خوش نصیبی پر رشک کرتے تو غلط نہیں کرتے تھے لیکن وہ کبھی بھی سوچتا ضرور تھا کہ اسے کیا ملا؟ شہرت اسے صرف شہرت ملی تھی۔ یہ شہرت اتنا کام نہیں دے سکتی تھی جتنی دولت دے سکتی تھی۔ اس کی وجہ سے زرناب نے دولت اور یہ مقام حاصل کیا تھا۔ گوا اسے اس فلم کی کامیابی کے بعد کئی فلمیں ملی تھیں لیکن معاوضہ میں اتنا اضافہ نہیں ہوا جو اس کے لیے خاطر خواہ ہو سکتا تھا۔ وہ خود بھی زرناب کی طرح بے پناہ دولت کا مالک بننا چاہتا تھا۔ وہ کئی دنوں سے نہیں مہینوں سے سوچ رہا تھا کہ کسی طرح وہ بھی دولت مند بن سکتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ خود سے کوئی فلم بنائے گا تو ہٹ ہو جانے کی صورت میں دولت

”وہ خادم چوہدری کے ساتھ آئی ہوئی ہے۔“
 ”کچھ بھی ہو، ہمیں اس سے ہوشیار رہنا ہوگا۔“
 خادم چوہدری بے حد خطرناک آدمی ہے۔ وہ ڈولی کے اشاروں پر ناناچ بھی سکتا ہے۔“
 ”تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔“ جمال نے اسے تسلی دی۔ ”وہ ہمارا بال تک بیک نہیں کر سکتے۔“
 دوسرے دن جمال اپنی بیوی کو لے کر ایک جنرل اسٹور میں داخل ہوا۔ وہاں اتفاق سے ڈولی بھی خادم چوہدری کے ساتھ موجود تھی اور اپنے پرستاروں کو آؤ گراف دے رہی تھی۔ پرستاروں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ اس اسٹور میں پولیس انسپکٹر سبھاں ورما بھی اپنے ماتحتوں کے ساتھ ایک طرف کھڑا تھا۔ ان پرستاروں کی نظریں جیسے ہی زرناب پر پڑیں وہ بادل کی طرح چھٹ کر اس پر چھا گئے۔
 ڈولی اپنی توہین اور سبکی برداشت نہ کر سکی اس نے ایسا رکیک جملہ استعمال کیا کہ وہ برداشت نہ کر سکی کسی خوں خوار جانور کی طرح اس کی طرف تیزی سے بڑھی۔
 ”کیمینی! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تو کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو.....!“
 سبھاں ورما فوراً ہی ان دونوں کے درمیان جاںک ہو گیا۔ ان دونوں کے درمیان جو چپقلش اور دشمنی تھی اسے اس کی خبر تھی۔ وہ اخبارات میں پڑھ چکا تھا اس نے دونوں سے مودبانہ انداز سے کہا۔
 ”پلیز آپ یہاں سیر و تفریح کے لیے آئی ہیں لڑنے جھگڑنے کے لیے نہیں۔ آپ دونوں رنگامانی کے مہمان ہیں۔ میں آپ دونوں سے درخواست کرتا ہوں کہ یہاں کی فضا میں بد مزگی نہ گھٹنے دیں۔“
 ڈولی خادم چوہدری کے ساتھ باہر نکل گئی۔

”کیمینی ڈولی ہی ہے۔“ اس نے تکراری۔
 ”یہ تمہارا وہم ہے۔“ جمال نے اسے تسلی دی۔
 ”جب سے تمہاری اس سے چپقلش شروع ہوئی ہے تب سے وہ تمہارے اعصاب پر بری طرح سوار ہو چکی ہے۔ بالفرض محال وہ یہاں آ بھی گئی ہے تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔“
 زرناب نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تو اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ زرناب کا چہرہ فق تھا اور اس نے اپنے دل کا خوف چھپانے کے لیے اپنی آنکھوں سے دور بین لگا رکھی تھی۔ دور بین اور اس کے ہاتھ نے اس کا چہرہ کافی حد تک چھپا رکھا تھا پھر بھی اس کے بھرے بھرے سرخ گداز ہونٹ کانپ رہے تھے۔ جمال نے محسوس کیا کہ اس کی حالت غیر ہو رہی ہے۔
 وہ اس کے قریب گیا تو اس نے دور بین آنکھوں سے ہٹائی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”لو تم خود دیکھ لو۔“
 جمال نے اس کے ہاتھ سے دور بین لے کر آنکھوں سے لگائی اور اس کی سمت دیکھنے لگا جس سمت اس نے اشارے سے بتایا تھا۔ ایک موٹر بوٹ جو راجا تری دیوارے کے محل کے قریب سے گزر رہی تھی۔ اس میں وہ خادم چوہدری کے ساتھ بیٹھی تھی۔ خادم چوہدری ڈھاکہ کا مشہور منشیات فروش اور عیاش شخص تھا۔ اس کا بھی ایک بنگلہ پہاڑی ٹیلے پر بنا ہوا تھا۔ کہ خادم چوہدری پر سے دور بین ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”ڈولی آئی ہوئی ہے تو اس میں خوف زدہ ہونے کی کیا بات ہے۔“
 ”مجھے اس کے ارادے کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے ہیں۔“ زرناب کے بدن میں ایک سرد لرہی اٹھی تھی۔

جو سلسلہ جاری کیا تو اس سے اخبارات کو فائدہ پہنچا تھا۔ ان کی ذات کو نہیں روز بروز ان دونوں کے درمیان عراق اور ایران کی جنگ جیسی شدت پیدا ہوتی چلی گئی تھی۔ اس نے زرناب کے کہنے پر دو ایک کرائے کے غنڈوں کی خدمات حاصل کیں۔ ان غنڈوں کو اس لیے کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی تھی کہ ڈولی اپنے پاس ایک پستول حفاظت کی غرض سے رکھنے لگی تھی اور ایک بد معاش کو باڈی گارڈ بھی رکھ لیا تھا۔ جب اس کے غنڈوں نے ڈولی کی کار روک کر اسے اغوا کرنے کی کوشش کی تو ڈولی نے اپنے پرس سے پستول نکال کر ان غنڈوں پر فائر کیا تھا۔ اس طرح وہ منصوبہ ناکام ہو گیا تھا۔ زرناب کی ابھی شریط پوری نہیں ہوئی تھی۔ لہذا اس سے رقم نہیں مل سکتی تھی۔ کبھی بھی تو اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ زرناب کو ہی راستے سے ہٹا دے۔ اس طرح وہ اس کی ساری دولت کا تہما لک بن جائے گا لیکن اس کو راستے سے ہٹا تو آسان تھا لیکن قانون کے ہاتھوں سے بچنا آسان نہیں تھا۔ اس خیال سے وہ پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ بہر کیف اسے آزاد زندگی بہت پسند تھی۔
 ”جمال! وہ حرافہ تو یہاں بھی پہنچ گئی ہے۔“
 زرناب جو کتنی ہی دیر سے دور بین آنکھوں سے لگائے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اپنی جگہ سے ایک دم سے اچھل پڑی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دور بین نہیں ہٹائی تھی۔ اس کی آواز میں لرزیدگی تھی۔ وہ اسی سمت دیکھنے لگی جیسے ڈولی اس سمت آ رہی ہو۔
 ”ڈولی یہاں کیسے آ سکتی ہے۔“ جمال بولا۔
 ”وہ تو اپنی فلم کی شوٹنگ میں حصہ لینے سہل گئی ہوئی ہے۔“

اس کے گھر کی لوٹڈی بن جائے گی۔ وہ زرناب کی شراکت میں فلم بنانا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اس سے رقم بطور قرض لے کر بنائے گا۔ زرناب نے اسے دس لاکھ لٹکا کی رقم قرض دینا منظور کر لیا مگر ایک شرط پر وہ شرط تھی ڈولی کو راستے سے ہٹانے کی۔
 ڈولی بھی اس فلم انڈسٹری کی ابھرتی ہوئی اداکارہ تھی۔ اپنے فن سے زیادہ اس نے ہمیشہ سستے عشوہ اور جسم کی آزادی سے فائدہ اٹھایا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ اس سے زیادہ پرکشش اداکارہ اور کوئی نہیں تھی۔ دوسری اداکارائیں اس سے بہت خائف رہتیں وہ جانتی تھیں کہ اس کی کوئی نہ کوئی فلم ایسی زبردست کامیابی حاصل کر لے گی کہ ان کی چمک دمک ماند پڑ جائے گی۔ ڈولی نے چڑے کے ایک تاجر کو پھانس کر ایک فلم بنانے کا اعلان کیا اور وہ فلم اسے ڈائریکٹ کرنے کے لیے کہا تھا۔
 زرناب کے کہنے پر اس نے فلم ڈائریکٹ کرنے سے معذرت کر لی۔ ڈولی اپنی یہ توہین برداشت نہ کر سکی۔ ایف ڈی سی اسٹوڈیو کے ایک فلور پر ڈولی پہنچی جہاں زرناب کی ایک نئی فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ ڈولی نے زرناب کو خوب لتاڑا اور طعنے دیے تو وہ برداشت نہ کر سکی۔ وہ کسی خوں خوار بلی کی طرح اسے پر جھپٹ پڑی۔ دونوں آپس میں بلیوں کی طرح ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئیں۔ ان دونوں کی زبردست جنگ میں لباس کا جو حشر ہوا تھا۔ اس سے زرناب کو بڑی خفت اٹھانا پڑی تھی۔ ڈولی پر کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ اس لیے کہ وہ ہر فلم میں ایسے مناظر میں پیش پیش رہتی تھی۔
 اخباروں میں کئی دنوں اس جنگ کا چرچا رہا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف بیانات کا

زرناب اپنے بنگلے پر پہنچ کر اس سے بولی۔ ”ڈولی کو راستے سے ہٹانے کے لیے اس سے اچھی جگہ اور سنہرا موقع نہیں مل سکتا ہے۔ اگر تم اسے راستے سے ہٹا دو تو میں تمہارے نام اپنی نصف دولت کر سکتی ہوں۔“

”مگر زرناب ڈارلنگ.....!“ جمال تذبذب میں پڑ گیا۔

زرناب نے اپنے پرس سے چیک بک نکال کر اس پر دستخط کر کے بلیک چیک اس کی طرف بڑھایا۔ ”تمہیں میرے بینک بیلنس کے بارے میں معلوم ہے۔ تم اس میں سے نصف رقم لے سکتے ہو۔ اس رقم سے فلم بناؤ یا شراب جوئے میں اڑا دو میں تم سے کوئی سوال نہیں کروں گی۔ کیا کوئی ایک انسانی جان کے لیے اتنی بڑی قیمت ادا کر سکتا ہے۔“

بلیک چیک دیکھتے ہی جمال کو لگا کہ وہ کوئی رنگین سپانڈیکھ رہا ہے۔ اس بینک میں چالیس لاکھ کی رقم جمع تھی۔ اس نے چیک لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ لوہا بہت گرم تھا۔ اس پر شدید ضرب کی ضرورت تھی۔ اس نے زرناب سے کہا۔

”ڈولی کو قتل کرنا بہت آسان ہے لیکن قانون سے بچنا بہت مشکل۔ اگر میں گرفتار ہو گیا تو تم بھی گرفتار کر لی جاؤ گی۔ پولیس کہے گی اصل جھگڑا اور دشمنی تم سے تھی اور تم نے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر اسے قتل کیا ہے۔“

”میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے۔“ وہ بولی۔ ”اس منصوبے پر عمل کرنے سے سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔“

”کیسا منصوبہ؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ زرناب نے اسے اپنا منصوبہ بتایا تو وہ بولا۔

”تمہارا منصوبہ تو بہت آسان ہے عیب اور سادہ سا ہے پولیس تفتیش کرنے آئی تو تم اس کا اطمینان کیسے کر اسکوگی؟“

”تم اور میں ایک ہی بیان پراڑے رہیں گے ہم میں سے یہاں سے کوئی نہیں گیا تھا۔ سارا دن اور رات بنگلے ہی میں تھے اور پھر نوکر کو سمجھا دس گے کہ وہ بھی ہمارے بیان کی تائید کرے۔ پولیس کو ہمارے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملے گا نہ کوئی عینی گواہ ہوگا جو اپنا بیان ہمارے خلاف دے سکے۔“

”ڈولی بھی تو اپنے پاس ہر وقت سائیلنسر لگا پستول رکھتی ہے۔“ جمال نے اپنے انجانے خوف کا اظہار کیا۔

”تو کیا ہوا تمہارے پاس بھی میرا سائیلنسر لگا ہوا پستول ہوگا۔“ زرناب کہنے لگی۔ ”یہ پستول تم اس وقت استعمال کرو گی جس وقت ڈولی خادم چوہدری کی خواب گاہ میں نشے میں دھت ہوگی۔ اس وقت تم اپنا پستول بڑے اطمینان سے استعمال کرو گے۔ اگر خادم چوہدری نے کوئی مزاحمت کی تو ایک گولی کا تحفہ اس کی خدمت میں بھی پیش کر دینا۔“

”اب یہ دیکھنا اور معلوم کرنا ہے کہ ڈولی خادم چوہدری کے ساتھ ٹھہری ہے یا کسی اور کے ساتھ ہے۔ یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ چوہدری کے ساتھ اس بنگلے میں کون کون رہتا ہے کتنے نوکر ہیں وغیرہ۔“

دوسرے دن جمال خریداری کے بہانے نکلا۔ بازار پہنچ کر اس نے مقامی شخص سے جو اس کا شناسا تھا اور کرائے پر موٹر بوس اور کشتیاں دیا کرتا تھا غیر محسوس انداز سے خادم چوہدری اور ڈولی کے

بارے میں پوچھا تو اس کے بتایا کہ ڈولی ایک پروڈیوسر کے بنگلے میں ٹھہری ہے جو خادم چوہدری کے بنگلے سے نصف فرلانگ پر واقع ہے۔ ڈولی کے ساتھ اس کے نوکر ہیں جو دونوں میاں بیوی ہیں۔ خادم چوہدری کے ساتھ صرف ایک نوکر ہے۔ وہ نوکر رات دس بجے ایک ہوٹل میں آ کر ٹھہر جاتا ہے جو گھوٹ پر واقع ہے۔ وہ اپنے نوکر کو اس لیے بھیج دیتا ہے کہ کوئی اس کی تفریح میں خلل نہ ہو۔ رات ٹھیک گیارہ بجے ڈولی موٹر بوٹ سے اس کے پاس پہنچتی ہے اور صبح دس بجے واپس آتی ہے۔ میں تین دن سے یہی تماشا دیکھ رہا ہوں۔

اسی روز رات آٹھ بجے رات کا کھانا کھانے کے بعد جمال نے اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے چائے میں خواب آور گولیاں ملا کر اپنے نوکر کو پینے کے لیے دیں۔ کچھ دیر کے بعد اس سے کہا کہ وہ جا کر اپنے کوارٹر میں سو جائے رات ٹھیک دس بجے اس نے نوکر کے کمرے میں جھانکا تو وہ کمبل اوڑھے گہری نیند میں سو رہا تھا۔ اس نے کوٹ پہننے کے بعد مفکر کو اچھی طرح سے کانوں پر لپیٹ لیا۔ اس لیے کہ باہر سردی بڑھ گئی تھی۔ پھر اس نے زرناب سے پستول لے کر اس کی نال پر سائیلنسر لگا کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ وہ ایسے بے باور ہدایت دیتی رہی اور اس کا حوصلہ بڑھاتی رہی تھی اور پھر اسے رخصت کرنے ڈاک پر آئی۔ وہ اس وقت تک ڈاک پر کھڑی ہاتھ ہلاتی رہی تھی جب تک اس کی موٹر بوٹ پہاڑی ٹیلے کی اوٹ میں چلی نہ گئی۔

آسمان پر دسویں تاریخ کا چاند تھا۔ اس کی مدہم پید چاندنی پانیوں پر منجمد ہو گئی تھی۔ وہ ایک گھنٹہ پہلے ہی اس لیے روانہ ہو گیا تھا کہ کسی ایسی جگہ گھات لگا کر پیٹھ جائے جہاں سے ڈولی کی موٹر

بوٹ پر نظر رکھ سکے۔ فضا بڑی پرسکون تھی لیکن اس خاموش فضا میں دور کی نہ کسی موٹر بوٹ کے انجن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ رات بھی لوگ گھاٹ سے اپنے گھر آتے جاتے تھے۔ وہ اپنی موٹر بوٹ کو آہستہ آہستہ چلاتا ہوا اس پہاڑی ٹیلے کی طرف لے جا رہا تھا جو ڈولی کے اس ٹیلے کے پاس ہی تھا۔ جہاں وہ ٹھہری تھی اس ٹیلے پر ایک زیر تعمیر بنگلہ تھا۔ یہ بنگلہ اس چاندنی رات میں کسی کھنڈر کی طرح ویران لگ رہا تھا۔ اس کے ڈاک پر اس نے اپنی موٹر بوٹ روک لی۔ ڈولی اس راستے سے خادم چوہدری کے بنگلے پر جاتی تھی۔ ادھر ہوا کا رخ نہیں تھا اس لیے اسے سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ موٹر بوٹ سے اتر کے ٹیلے پر لیٹ گیا آسمان پر چاند کو دیکھنے لگا چاند کو دیکھتے دیکھتے کب اس کی آنکھ لگی اسے کچھ پتا نہیں چلا۔

وہ نیند سے بے دار ہوا تو اس کے کانوں میں موٹر بوٹ کے انجن کی صدا سنائی دینے لگی۔ جولوہ بہ لمحہ اس کے قریب ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے یک دم چونک کر اپنی دستی گھڑی میں وقت دیکھا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ تیزی سے اپنی موٹر بوٹ میں آیا جلدی سے اس نے جیب سے پستول نکال کر اپنے قدموں میں رکھ لیا۔ پھر اس نے موٹر بوٹ کا انجن اسٹارٹ کیا۔ ڈولی کی موٹر بوٹ اس ٹیلے کا چکر کاٹ کر آ رہی تھی۔ اس نے اپنی موٹر بوٹ کا رخ اس طرف پھیرا اور اس سمت بڑھنے لگا۔

چند لمحوں کے بعد ڈولی کی موٹر بوٹ اس کے سامنے تھی۔ ڈولی نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا اور چونک پڑی تھی۔ اپنی موٹر بوٹ روک کر وہ بڑی نفرت اور حقارت سے بولی تھی۔

”آپ میں سے کوئی یہاں سے دس گیارہ بجے کے درمیان گھومنے کے لیے موٹر بوٹ میں تو نہیں نکلتا تھا۔“

”جی نہیں ہم دونوں میں سے آج کسی نے بھی یہاں سے باہر قدم نہیں نکالا۔ سارا دن ایک نئی فلم کے اسکرپٹ پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔ سہ پہر کو سو کرات آٹھ بجے اٹھے تھے۔ کھانا کھا کر ٹیلی ویژن دیکھتے رہے۔ پھر شراب اور باتوں سے دل بہلاتے رہے تھے اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے تو میری بیوی سے دریافت کر سکتے ہیں اور میرے نوکر سے بھی پوچھ گچھ کر سکتے ہیں۔ جو کچھ دیر پہلے جا کر سوا ہے۔“

”اچھا“ انسپکٹر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”پہلے آپ اپنی بیگم کو جگا کر لے آئیں میں ان سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔“

جمال مسکراتا ہوا بیڈروم کی طرف بڑھا۔ بیڈروم میں داخل ہو کر اس نے سوچے آن کیا۔ زرناب سردی کی وجہ سے سر سے پیر تک مبل اوڑھے سو رہی تھی۔ اس نے پلنگ کے پاس جا کر اس کے چہرے پر سے مبل اٹھایا اور اس کے اوپر جھک گیا۔ دوسرے لمحے وہ دہشت زدہ سا ہو کر کھڑا ہو گیا اور ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس کی آنکھیں باہر کو نکلی پڑی تھیں۔ چہرہ سفید پڑا تھا۔ اس کا سارا بستر اور لباس خون میں لت پت تھے۔ اس کے بدن میں سوراخ تھے جس میں سے بہت سارا خون بہہ کر خشک ہو چکا تھا۔ وہ موت کی وادی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پہنچ چکی تھی۔

اسے قتل کیا ہے؟“

”میں نے اسے قتل کیا ہے؟“ اس کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔ ”یہ بات آپ کس بناء پر کہہ رہے ہیں؟“

”اس بناء پر کہ کل آپ کی بیگم نے میرے سامنے اسے قتل کی دھمکی دی تھی اور پھر آپ دونوں ہی ڈولی کے جانی دشمن تھے۔ دشمنی دو ایک سال سے چلی آ رہی ہے۔ ماضی میں اس پر جو دو ایک قاتلانہ حملے ہوئے تھے اس نے آپ دونوں ہی کو مورد الزام ٹھہرایا تھا۔“

”میری بیوی نے کل جو کچھ بھی کہا تھا وہ غصے کی حالت میں کہا تھا۔ اس نے جو ریک جملہ کہا تھا اس سے کوئی بھی آپ سے باہر ہو سکتا ہے۔ میری بیوی بھی اس ریک جملے کو برداشت نہ کر سکی تھی۔ رہی دشمنی کی بات، فلم انڈسٹری میں کون ایک دوسرے کا دشمن نہیں ہوتا ہے کوئی ظاہر میں ہوتا ہے کوئی باطن میں۔ عزت شہرت اور دولت ایک دوسرے سے حسد، جلن اور رقابت پیدا کر دیتی ہے۔ رہی بات قاتلانہ حملے کی یہ شخص ایک الزام تھا زرناب تھا اس کی دشمن نہیں تھی ڈولی کے دوست کم دشمن زیادہ ہیں۔ اسے کبھی دوست بنانے نہیں آئے۔“

”اچھا تو آپ اتنی دیر تک کیوں جاگ رہے ہیں؟“

”ہم یہاں راتوں کو جاگے، سیر و تفریح کرنے اور زندگی کی لذتوں سے محفوظ ہونے کے لیے آتے ہیں۔ اگر راتوں کو سونا ہوتا تو ہم ڈھاکہ میں ہی رہتے۔ یہاں کا رخ بھی نہیں کرتے۔“

”آپ کی بیگم کہاں ہیں؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”وہ پانچ دس منٹ پہلے ہی سونے کے لیے بیڈروم میں گئی ہیں۔“

کی بوتل اور ایک گلاس ٹھہرایا۔ نصف سے زیادہ بوتل خالی تھی۔ گویا وہ اس کے انتظار میں شراب پیتے پیتے اکتا کر سونے چلی گئی تھی۔ اس نے بیڈروم کی طرف دیکھا تو دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر اپنے حواس پر قابو پانے کے لیے گلاس میں شراب انڈیل کر پینے لگا۔ اس نے ایک گلاس شراب ایک ہی سانس میں حلق میں اتاری تو اس کے اعصاب پر سکون ہو گئے۔ وہ دوسرا گلاس بھر رہا تھا کہ اس نے ایک آواز سنی۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر باہر جھانکا تو اس نے پولیس کی گشتی لالچ کو آتے دیکھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ لالچ اس کے ٹیلے کے ڈاک پر آ کر رک گئی۔ اس میں سے انسپکٹر سبشاش ورما اور چند سپاہی اتر کے تیزی کے ساتھ اوپر آ رہے تھے۔

کیا پولیس کو پتا چل گیا؟ اس کی حالت غیر ہونے لگی لیکن اتنی جلدی کیسے پتا چل گیا۔ وہاں نہ تو کوئی شخص تھا اور نہ ہی راستے میں اسے کسی نے دیکھا تھا۔ وہ ان خیالات میں گم تھا اور بدحواس ہو رہا تھا کہ انسپکٹر نے دروازے پر دستک دی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا پھر وہ انجان بن کر بولا۔ ”انسپکٹر آپ؟ اتنی رات گئے خیریت تو ہے؟“

”خیریت نہیں ہے جی اتنی رات گئے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔“ انسپکٹر نے جواب دیا۔

”آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ کسی نے مس افروزہ ڈولی کو قتل کر دیا۔“

”جی..... کیا کہا.....؟“ وہ اچھل پڑا۔

”آج رات دس گیارہ بجے کے درمیان اسے قتل کر دیا گیا ہے؟“ انسپکٹر نے نشست گاہ پر اچھتی ہوئی نظر ڈالی۔ ”میں اس قتل کی تفتیش کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں میرا شک آپ پر ہے۔ آپ نے ہی

”تم زرناب کے پالتو کتے میں تو سمجھی تھی کہ تم شاید ڈھاکہ کی چلے گئے۔“ پھر اس نے جیسے خطرے کی بوسونگی لی تھی۔ اس نے اپنے اوپر کوٹ کی جیب سے پستول نکالنے کے لیے ہاتھ ڈالا تھا کہ جمال سمجھ گیا کہ وہ پستول نکال رہی ہے۔ اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جھک کر اپنا پستول اٹھا کر ڈولی کو نشانے کی زد میں لیا تو دو لی ہر سکتے چھا گیا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی رہ گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ چیختی پے در پے دو فائر ہوئے۔ وہ چیخ بھی نہ سکی۔ کشتی میں منہ کے بل گر پڑی۔ اس کا جسم تڑپا اور ٹھنڈا ہو گیا۔

جمال نے اپنا پستول پانی میں پھینک دیا زرناب نے سختی سے اسے تاکید کی تھی کہ ڈولی کو قتل کرنے کے بعد وہ ایک منٹ کے لیے بھی پستول اپنے پاس نہ رکھے پھر وہ اپنی موٹر بوٹ تیزی سے چلاتا ہوا جدھر منہ اٹھا دھر کو چل پڑا۔ وہ ایک طرح سے بڑا بدحواس ہو گیا تھا اور گھبراہٹ سے اس کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آج وہ ایک قاتل بن گیا ہے۔ اس نے دولت کے اندھے جنون میں مبتلا ہو کر ایک لڑکی کا خون کر دیا ہے۔ اس نے خود پر قابو پانے کی بہت کوشش کی۔ وہ سوچنے لگا کہ گھر پہنچ کر خوب شراب پیے گا اور نشے میں دھت ہو جائے گا پھر کوئی احساس اسے نہیں ستائے گا۔

وہ اپنے گھر پہنچا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ اسے دیر اس لیے ہو گئی تھی کہ وہ راستا بھول گیا تھا۔ اس نے ڈاک پر موٹر بوٹ کھڑکی کی اور اوپر پہنچا۔ سب سے پہلے اس نے نوکر کے کمرے میں جا کر جھانکا۔ نوکر گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ نشست گاہ میں آیا تو اسے زرناب دکھائی نہیں دی۔ البتہ تپائی پر شراب



محترم مدیر نئے افق کراچی
کسی ڈائجسٹ کے لیے پہلی بار کوئی کہانی لکھ رہی ہوں۔ نئے افق دیکھا اور
مطالعہ کیا تو لگا آپ لوگ نئے لکھنے والوں کو موقع دیتے ہیں سو بہت کر کے یہ
تحریر پیش کر رہی ہوں۔ یہ کہانی ہمارے معاشیہ کی نہیں البتہ یہ سچی کہانی
ضرور ہے میں نے بڑی محنت سے اسے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے امید ہے یہ آپ
کے معیار پر ضرور پورا اترے گی۔ قارئین اسے پڑھ کر اپنی بے لاگ رائے سے ضرور
آگاہ کریں۔

غزالہ جلیل رائو
لوکاڑہ

سرجن شہریار کی شہرت متضاد تھی۔ ملک بھر میں
ان سے بڑا نیوروسرجن اور کوئی نہیں تھا۔ وہ
نیوروسرجری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے لیکن ان
کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بے حد سخت مزاج اور
لاچکی فطرت کے حامل ہیں۔ اپنا معاوضہ طے کرنے
اور وصول کرنے میں وہ بے رحمی کی حد تک اصول
پرست تھے لیکن ہر مزاج کے پس پردہ کچھ تلخ حقائق
ہوتے ہیں۔

یہ حیثیت حاصل کرنے کے لیے انہیں بڑی
مشکلات سے گزرنا پڑا تھا۔ ایسے ٹھن حالات
گزرے تھے کہ اب تو ان کا تصور بھی خوف زدہ
کردیتا تھا۔ دنیائے ان کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا
تھا تو اب وہ اس دنیا کے ساتھ تعاون کیوں کرتے؟
اس وقت ان کا کوئی دوست نہیں تھا۔ اپنی ہر ضرورت
پوری کرنے کے لیے وہ کیوں کلبج پھاڑتے وہ اپنے
فن اپنی مہارت کا پورا پورا معاوضہ وصول کرتے تھے
اور اس میں کسی کے ساتھ رعایت نہیں برتتے تھے۔

ایک بڑے سرکاری اسپتال کے سب سے بڑے
نیوروسرجن تھے لیکن ذاتی اسپتال بھی تھا۔ آپریشن
اسپتال میں ہوتے تھے لیکن سودے پرانیوٹ
”جی۔“ سرجن شہریار خشک لہجے میں بولے۔
ان کے پاس آنے والے عموماً کپکپاتے تھے یہ کوئی
نئی بات نہ تھی۔

”ایک آپریشن کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں
جناب!“ آنے والے کی آواز بھی لرز رہی تھی۔
”جی۔“ سرجن شہریار کے الفاظ کی بھی قیمت تھی

اور بلاوجہ اپنا کوئی لفظ ضائع نہیں کرتے تھے۔ اسی
لئے بچے تلے انداز میں ہی بولا کرتے تھے۔

”جی وہ میرا بیٹا ریاض حسن نام ہے اس کا آپ
کے ہیڈ انرجی ڈیپارٹمنٹ میں ایڈمٹ ہے کل صبح
دس بجے اس کا آپریشن ہونے والا ہے۔ میں اس
سلسلے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔“
”جی۔“ سرجن شہریار نے اسی انداز میں کہا۔
”کیا چاہتے ہیں آپ؟“

”میں چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب آپ کی خصوصی
توجہ اسے حاصل ہو۔ میں مختصر آپ کو اپنے بارے
میں بتانا چاہتا ہوں میری عمر کے بائیس سال سرکاری
ملازمت میں گزرے ہیں اور میرا شمار ان لوگوں میں
ہوتا ہے جنہوں نے اپنے ریکارڈ میں کوئی خرابی نہیں
ہونے دی۔ ڈاکٹر صاحب! میں جس شعبے سے
منسلک ہوں اس میں رشوت کے بے شمار مواقع میسر
ہیں لیکن میں نے اپنا دامن اس آلودگی سے پاک
رکھا ہے۔ کلرک ملازم ہوا تھا اور اب ہیڈ کلرک ہوں
چھوٹا سا گھر ہے ایک بیٹا ہے میرا۔ بیوی مرچکی
ہے۔ ریاض حسن ایل ایل بی کرچکا ہے اور کچھ عرصہ
بعد وکیل بننے والا تھا لیکن میری بد نصیبی کہ وہ اسکوٹر
سے گرا اور سر میں شدید چوٹ آگئی۔ ڈاکٹر صاحب!
آپ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ آپ مسجاہد
آپ بڑے ہوئے حالات سنوا دیتے ہیں۔ آپ
آپ..... میں چاہتا ہوں کہ.....“

”ہوں“ سنے آپریشن کل صبح دس بجے ہے؟“
سرجن شہریار نے پوچھا۔

”جی ہاں ڈاکٹر صاحب! کل ٹھیک دس بجے۔“
”لیکن آپ میرے پاس بہت دیر سے پہنچے
ہیں۔“

”ڈاکٹر صاحب میں نے چار دن سے آپ سے

ملاقات کی کوششیں جاری رکھی ہیں آج ہی وقت مل
سکا۔“

”ہوں! اچھا ٹھیک ہے تو پھر آپ یوں کیجیے کہ
ممکن ہو تو آج رات کسی وقت درنہ کل صبح ساڑھے نو
بجے تک ایک لاکھ روپے میرے اکاؤنٹ میں جمع
کرادیجیے آپ یہ رقم میرے دفتر میں کیش کی شکل
میں بھی دے سکتے ہیں لیکن مجھے ساڑھے نو بجے تک
اس کی اطلاع مل جانی چاہیے۔“ سرجن شہریار نے
بچے تلے انداز میں کہا۔ آنے والے کا چہرہ تاریک
ہو گیا تھا۔ پھر اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے
سرجن شہریار کو دیکھ کر کہا۔

”لیکن سر.....“

”چار منٹ پورے ہو چکے ہیں ایک منٹ میں
آپ یہ فرمادیجیے کہ آپ صبح ساڑھے نو بجے تک اس
رقم کا بندوبست کر رہے ہیں یا نہیں؟“

”ڈاکٹر صاحب..... ہم..... میں..... میں۔“

”میں سیکنڈ اور ہو چکے ہیں باقی رہے چالیس
سیکنڈ۔ آپریشن تو کل صبح ضرور ہوگا لیکن اس کی
کامیابی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ وہاں جو کچھ میں
کرنا ہوں اس کا کرنا میرا فرض ہے باقی سب کچھ
آپ کی قسمت کا کھیل ہے۔ ہاں اگر آپ مطلوبہ رقم
مجھے فراہم کر سکتے ہیں تو پھر آپ کو آپریشن کی کامیابی
کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ باقی رہے صرف دس
سیکنڈ اس میں آپ فیصلہ کر کے مجھے اطلاع دے
دیں۔“

نو وارد کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے اس کے
چہرے کی رنگت اتر گئی تھی۔ اس کی زبان گویا مڑ گئی
تھی اور وہ بولنے میں بھی دقت محسوس کر رہا تھا۔ اس
نے بمشکل تمام مدد ہم لہجے میں کہا۔

”یہ رقم..... یہ رقم آپ تک پہنچ جائے گی ڈاکٹر

صاحب!

”ساڑھے نو بجے تک۔ نو بج کر اکتیس منٹ ہو گئے تو پھر ہمیں یہ رقم درکار نہیں ہوگی۔“ سرجن شہریار نے خشک لہجے میں جواب دیا اور دوسرے ملاقاتی کو بلانے کے لیے گھنٹی بجادی۔

نوادرد کا اب یہاں رکنا بے مقصد تھا اس نے کرسی کے دونوں ہتھوں پر ہاتھ ٹکائے اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے پاؤں اس کا ساتھ نہ دے پا رہے ہوں۔ اس نے لڑنی آواز میں کہا۔

”ڈاکٹر صاحب! میں اپنا ماضی آپ کے سامنے بیان کر چکا ہوں آج تک سرکاری مکان میں رہ رہا ہوں اپنا مکان تک نہیں بنوا سکا۔ معمولی سی تنخواہ میں صرف اپنی بیوی کا علاج کر سکا ہوں یا پھر بیٹے کو تعلیم دلوا سکا ہوں اب بھی صورت حال یہ ہے کہ.....“

”دیکھیے مسٹر! میں ہر ملاقاتی ہر مریض کو زیادہ سے زیادہ تین منٹ دیتا ہوں آپ کا ڈیڑھ منٹ صرف ہو گیا ہے۔ باقی ڈیڑھ منٹ میں آپ اپنی گفتگو ختم کر لیجیے یہ میرا اصول ہے۔ میں نے آپ کی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے صرف ایک لاکھ کا مطالبہ کیا ہے آپ نے ساری زندگی رشوت نہیں لی گھر نہیں بنوایا اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے اپنی تعلیم پر اس مہارت پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا ہے اور جس انداز میں کیا ہے اس کے بارے میں آپ کو بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا مجھے اس رقم کی واپسی مطلوب ہے مجھے ان لمحات کی قیمت درکار ہے اور یہ قیمت آپ سے ایک لاکھ لی جاسکتی ہے۔“

نوادرد کا اب یہاں رکنا بے مقصد تھا اس نے کرسی کے دونوں ہتھوں پر ہاتھ ٹکائے اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے پاؤں اس کا ساتھ نہ دے پا رہے ہوں۔ اس نے لڑنی آواز میں کہا۔

”ڈاکٹر صاحب! میں اپنا ماضی آپ کے سامنے بیان کر چکا ہوں آج تک سرکاری مکان میں رہ رہا ہوں اپنا مکان تک نہیں بنوا سکا۔ معمولی سی تنخواہ میں صرف اپنی بیوی کا علاج کر سکا ہوں یا پھر بیٹے کو تعلیم دلوا سکا ہوں اب بھی صورت حال یہ ہے کہ.....“

”دیکھیے مسٹر! میں ہر ملاقاتی ہر مریض کو زیادہ سے زیادہ تین منٹ دیتا ہوں آپ کا ڈیڑھ منٹ صرف ہو گیا ہے۔ باقی ڈیڑھ منٹ میں آپ اپنی گفتگو ختم کر لیجیے یہ میرا اصول ہے۔ میں نے آپ کی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے صرف ایک لاکھ کا مطالبہ کیا ہے آپ نے ساری زندگی رشوت نہیں لی گھر نہیں بنوایا اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے اپنی تعلیم پر اس مہارت پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا ہے اور جس انداز میں کیا ہے اس کے بارے میں آپ کو بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا مجھے اس رقم کی واپسی مطلوب ہے مجھے ان لمحات کی قیمت درکار ہے اور یہ قیمت آپ سے ایک لاکھ لی جاسکتی ہے۔“

کوشش کرنے لگا۔ لیکن اسے اس شاندار انیئر کنڈیشنڈ دفتر سے باہر جانا ہی تھا جس طرح بھی بن پڑا وہ لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل گیا۔

نئے ملاقاتی کے آنے سے پہلے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور ڈاکٹر نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھ کر ریسیور اٹھا لیا۔

”ہیلو۔“

”ڈاکٹر! میں ڈی آئی جی کرامت بول رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔

”اوہ کرامت صاحب! فرمائیے کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“ ڈاکٹر کے لہجے میں ذرا سی تبدیلی پیدا ہو گئی۔

”ٹھیک ہوں ڈاکٹر صاحب! آپ کی فرمائش پوری کر دی گئی ہے آپ کو اطلاع مل گئی ہوگی۔“

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”اطلاع تو نہیں ملی لیکن اگر میری فرمائش پوری ہو گئی ہے تو ٹھیک ہے۔“

+

ماتحتوں نے آج کی آپریشن شیڈ پیش کر دی پہلا آپریشن ٹھیک دس بجے ریاض حسن نوجوان کا تھا۔ دوسرا آپریشن ڈی آئی جی صاحب کی صاحب زادی سعدیہ کا تھا اور تیسرا آپریشن ایک اور نوجوان کا تھا آج صرف یہی تین آپریشن تھے۔

ریاض حسن کے نام پر سرجن شہریار کو شام کا ملاقاتی یاد آ گیا۔ انہوں نے ماتحتوں سے واپس جانے کے لیے کہا اور ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر اپنے پرائیوٹ کلینک سے رابطہ قائم کیا۔

”ریاض حسن نامی شخص کے سلسلے میں کوئی چیک یافتہ رقم وصول ہوئی ہے؟“

”ابھی تک نہیں جناب!“ دوسری طرف سے

جواب ملا۔

سرجن شہریار نے گھڑی میں وقت دیکھا ساڑھے نو بج چکے تھے انہوں نے فون بند کر دیا اور آپریشن کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ ان کا چہرہ پرسکون تھا مریض کو آپریشن روم میں پہنچا دیا گیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ قینچیاں چھریاں استعمال کی جانے لگیں۔

ماتحتوں کی پوری ٹیم نرسوں کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھی۔ سرجن شہریار آپریشن کر رہے تھے اس وقت ان کے ذہن میں کوئی خیال نہیں تھا بس وہ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھے پھر ایک لمحے کے لیے نرسوں اور ڈاکٹروں کی گہری گہری سانسیں نکل گئیں انہوں نے محسوس کیا تھا کہ سرجن شہریار کے انداز میں بے پروائی ہے۔

وہ بالکل بے نوجہمی سے یہ آپریشن کر رہے تھے اکثر ایسا ہو چکا تھا اور اس جرم میں دوسرے ڈاکٹرز اور نرسیں اپنے آپ کو برابر کے شریک محسوس کرتے تھے ان کے سینے میں ایک لمحے کے لیے خدا کا خوف آتا تھا لیکن ان کی حیثیت کچھ بھی نہ تھی وہ تو صرف آپریشن انسٹرومنٹ کی مانند تھے جو سرجن شہریار کے اشارے پر نچا جاتی ہیں۔

آپریشن مکمل ہو گیا نرسوں اور ماتحت ڈاکٹروں کی کارروائی شروع ہو گئی۔ انہوں نے سر کی ہڈی جوڑی اور اس کے بعد مریض کو اسٹریچر پر لٹا کر دوسرے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

اس کے بعد ڈی آئی جی کرامت کی صاحب زادی کو آپریشن ٹیبل پر لایا گیا۔

+

غم زدہ باپ نے محبت بھری نگاہوں سے اپنے بیٹے کو دیکھا اس کی آنکھیں کھل چکی تھیں اور اس نے ان کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی وہ تو بالکل

نئے افق 207

نے کئی بار ہوش مندی سے اپنے باپ سے گفتگو کی تھی اور انور علی خوشی سے پھولے نہیں سمائے تھے ان کا رواں رواں سرجن شہریار کا احساس مند تھا جنہوں نے کچھ نہ لے کر بھی ان کے بیٹے کا کامیاب آپریشن کیا تھا۔

لوگ بہکاتے تھے بہکاتے رہیں لیکن وہ اس فرشتے کا احسان کیسے نہ مانتے لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ انور علی کی تقدیر ہے کہ ریاض حسن کا آپریشن کامیاب ہوا۔ اس میں سرجن شہریار کی کوششوں کا کوئی دخل نہیں انہوں نے صرف اصولی طور پر یہ سب کیا ہوگا جس کے لیے انہیں اسپتال ادائیگی کرتا ہے۔

لیکن انور علی کا رُواں رواں سرجن شہریار کا شکر گزار تھا ہاں اس وقت ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ جب ریاض حسن نے ایک شام کو ہستہ سے ان کے کان میں کہا۔

”ڈیڈی میں قتل کرنا چاہتا ہوں۔“

”ایں.....“ انور علی متحیرانہ انداز میں بولے۔

”زور سے نہ بولیں لوگ سن لیں گے میرے دل میں ایک خواہش بار بار چلتی ہے میں کسی کو قتل کر دوں خون کی سرخ چادر اس کے بدن پر پھیلی ہوئی دیکھوں۔ ہاں ڈیڈی مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسے قتل کروں؟ میرے ذہن میں مختلف چہرے ابھرتے ہیں مختلف شکلیں سامنے آتی ہیں مجھے کب ایسے شخص کی ضرورت ہے جسے قتل کر کے مجھے روحانی مسرت حاصل ہو۔ سفید سفید بال ہیں اس کے لیکن چہرہ یوں لگتا ہے جیسے ان سفید بالوں سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو بس وہی شخص میرا پہلا شکار ہوگا۔ ڈیڈی مجھے یہاں سے کب چھٹی مل جائے گی؟“

انور علی حیرت سے بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی وہ تو بالکل

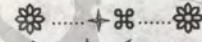
نئے افق 206

ٹھیک تھا اس کی ذہنی قوتیں بحال تھیں ہر شخص کو پہچانتا تھا ساری باتیں اسی انداز میں کر رہا تھا جیسے حج الدماغ لوگ کرتے ہیں لیکن یہ الفاظ.....؟ انہوں نے سوچا کہ کسی بھی طرح سرجن شہریار سے مل کر اس سلسلے میں بات کی جائے۔

سرجن شہریار سے اسپتال میں ملاقات نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بے حد مصروف انسان تھے ان سے ملاقات کے لیے ایک ہزار روپے درکار ہوگا چنانچہ انور علی صاحب نے یہ کڑوی گولی بھی نگل لی۔ سرجن شہریار سے ملے اور سرجن شہریار انہیں دیکھ کر بولے۔

ہر ممکن کوشش کر لی سرجن صاحب! جس کے ذریعے اتنی رقم اکٹھی کر سکتا لیکن وہ رقم چھ سات ہزار سے زیادہ نہیں بنی جس میں سے ایک ہزار روپے میں نے ابھی آپ سے ملنے کی فیس کے طور پر ادا کیے ہیں اور بقیہ رقم میں اپنے بیٹے پر خرچ کر چکا ہوں میں مقروض ہو گیا ہوں سرجن! میں یہ ادائیگی نہیں کر سکتا۔

”تین منٹ پورے ہو رہے ہیں آپ جاسکتے ہیں۔“ سرجن شہریار نے کہا اور نئے ملاقاتی کو بلانے کے لیے گھٹی بجا دی۔



کرامت صاحب کی بیٹی کا جشن صحت تھانی زندگی ملی تھی ڈی آئی جی صاحب کی بیٹی خوب صورت لباس میں تلی کی طرح اٹھلاتی پھر رہی تھی۔ اس کا آپریشن کامیاب رہا تھا اور اب وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی تھی۔

ڈی آئی جی صاحب نے دل کھول دیا تھا مہمانوں سے کوشی اٹی پڑی تھی اور سعدیہ کرامت کو سب مبارک باد پیش کر رہے تھے دفعتاً اس کی نظر صابر علی کے مسکراتے چہرے پر پڑی اور اس کی نگاہیں ان پر جم کر رہ گئیں۔

صابر علی کے سامنے کے دو دانت سونے کے تھے باہر سے منگوا کر لگائے تھے۔ اتنے خوب صورت تھے کہ جب وہ مسکراتے تھے تو روشنی سی پھیل جاتی تھی وہ ڈی آئی جی صاحب کے خاص دوستوں میں سے تھے اور سعدیہ کرامت کو انہوں نے اپنی گود میں کھلایا تھا۔ اس وقت بھی وہ خاصے سرور نظر آ رہے تھے سعدیہ کرامت ان کے پاس پہنچ گئی۔

”انکل! آپ کے یہ دونوں دانت کتنے حسین ہیں۔“

”ہوں تو اس سلسلے میں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ انہوں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”جناب میں یہ چاہتا تھا کہ اس کی یہ کیفیت ہے اس کے یہ الفاظ.....“

”اس لیے کہ آپ نے مطلوبہ معاوضہ ادا نہیں کیا۔“ سرجن شہریار بے رحم لہجے میں بولے اور انور علی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

”تو..... تو..... تو..... اس کا مطلب ہے اس کے دماغ میں کوئی قسم رہ گیا ہے۔“

”رہنا چاہیے تھا میں نے لاکھوں روپیہ خرچ کیا ہے مہارت حاصل کرنے کے لیے۔ پاگل سمجھا ہے آپ لوگوں نے مجھے۔ دیوانہ ہوں! اتق ہوں! کیا سمجھتے ہیں آپ؟ جانیے ایک لاکھ کا بندوبست کر لیجیے اس کا آپریشن دوبارہ ہو جائے گا ورنہ پھر اسے قتل کرنے دیجیے وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا“ سمجھے آپ؟“ انور علی پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگے پھر ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولے۔

”اگر میں ایک لاکھ ادا کر سکتا سرجن صاحب! تو آپ یقین کیجیے پہلے ہی روز ادا کر دیتا۔ میں نے

”ہاں بیٹی! اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بہترین ہیں مگر میں نے انہیں یہاں نہیں بنوایا بلکہ فرانس کے بہت بڑے کاریگر سے بنوا کر انہیں اپنی بیٹی میں فٹ کروایا ہے۔“

”انکل! آپ اپنے یہ دونوں دانت مجھے دے دیں۔“

”اے واہ بیٹے! ان کا کیا کردیگی؟“

”بس میں انہیں اپنے نادر خانے میں محفوظ کر دوں گی۔“

”ایسی بات ہے تو میں تمہیں یہ دانت بنوا کر منگوا دوں گا۔“

”نہیں انکل! آپ سوچ لیں میں نے آپ سے صرف اس لیے مانگ لیے ہیں کہ آپ میرے اپنے انکل ہیں ورنہ.....“

”ورنہ.....؟“

”کچھ نہیں انکل! آپ یہ مجھے ابھی اور اسی وقت دے دیجیے۔“

”ارے بھئی کیوں میرا مذاق اڑانے پر تلی ہو تمہاری شرارت ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”کچھ نہیں ہے انکل! ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“

سعدیہ کرامت نے جواب دیا اور بات مل گئی۔

باری ختم ہو گئی سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ صابر علی بھی اپنے گھر آ گئے تھے لیکن اس وقت رات کے ڈھائی بجے تھے جب انہوں نے اپنے کمرے کی کڑی پر ایک ہلکی سی آہٹ سنی وہ تنہا سونے کے عادی تھی اس وقت نہ جانے کیوں جاگ رہے تھے۔ بس کچھ ایسے خیالات ذہن میں آ گئے تھے کہ نیند نہیں آ رہی تھی پاری سے واپسی میں کافی وقت لگ گیا تھا گھر واپس آنے کے بعد انہوں نے لباس تبدیل کیا تھوڑی دیر گھر کے دیگر افراد سے

باتیں کرتے رہے اور اس کے بعد اپنے کمرے میں آ گئے۔

لیکن یہ آہٹ کچھ عجیب سی تھی وہ متعجبانہ انداز میں کچھ سوچتے رہے یہ آہٹ کیسی تھی؟

وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور کھڑکی کے پاس پہنچ گئے کھڑکی میں سلاخیں نہیں تھیں انہوں نے کھڑکی کھولی اور بری طرح چونک پڑے۔ سعدیہ کرامت تھی دکتے چہرے والی سفید رنگ کے خوب صورت لباس میں ملبوس۔

”تم..... یہاں..... اس وقت.....؟ دروازے سے آؤ بیٹی! کیا بات ہے؟“

”مجھے سہارا دیں انکل! ایک ضروری کام ہے۔“

اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور صابر علی نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ سعدیہ اندر آ گئی اس نے بند دروازے پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر مسکرانے لگی۔

”کیا بات ہے بیٹی! اس وقت اس انداز میں کیسے آئیں؟ تنہا ہو یا کوئی اور بھی ساتھ ہے؟“

”اس وقت میں سعدیہ کرامت نہیں ہوں انکل! بلکہ سلطانہ ڈاکو ہوں۔ انکل یہ سلطانہ ڈاکو مرد تھا یا عورت تھی؟“

”مرد..... لیکن میں سمجھا نہیں۔“

”میں آپ کے دانت لینے آئی ہوں انکل! بلکہ یہ نادر شے مجھے پسند ہے۔ زندگی چاہتے ہیں تو مجھے یہ نکال کر دے دیں ورنہ.....“ اس نے اپنے لباس سے پستول نکال لیا پولیس کا سرورس پستول تھا۔ صابر علی کے بدن میں کپکپاہٹ دوڑ گئی۔

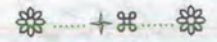
”کیا مذاق ہے سعدیہ! یہ شاید تمہارے ڈیڈی کا پستول ہے؟“

”جلدی کریں ورنہ..... زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔“

”لیکن سعدیہ! یہ دانت ایسے نہیں نکل سکتے۔ یہ تھا۔“

دوسرے دانتوں سے منسلک ہیں۔“
”میں اس کا بندوبست کر کے آئی ہوں، دیکھیے۔“
سعدیہ نے ایک چھوٹے سے بیگ سے کچھ اوزار نکال کر انہیں دکھائے اور صابر علی پریشان ہو گئے۔
”لیکن..... لیکن..... یہ۔“

”ایک منٹ میں بتائی ہوں۔“ اس نے کہا صابر علی سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ وہ کیا کرنا چاہتی تھی۔ پستول بلند ہوا اور اس کا وزنی دستہ ان کے سر پر پڑا۔ ان کی آنکھوں میں ستارے ناچ گئے تھے دوسری ضرب نے اس کے حواس چھین لیے اور وہ کئے ہوئے تنے کی طرح زمین پر آگرے۔ سعدیہ ان کے سینے پر سوار ہو گئی۔ اس کے حسین خدوخال اب ایک سفاک چہرے میں بدل گئے تھے اس نے عمل شروع کر دیا۔ سونے کے دانت واقعی دوسرے دانتوں سے منسلک تھے اس لیے انہیں نکالنے کے لیے آس پاس کے چند اور دانت بھی اکھاڑنے پڑے اور صابر علی کے حلق میں خون بھر گیا لیکن تھوڑی سی جدوجہد کے بعد دانت سعدیہ کے قبضے میں آ گئے۔



ریاض حسن تو مندو جوان تھا سرجن شہریار کی تمام مدافعت بے کار گئی۔ اس قوی بیکل نو جوان نے انہیں زیر کر لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ تھی۔ سرجن اسے پہچان گئے تھے لیکن..... لیکن۔

”سرخ چادر میں تمہیں سرخ چادر میں لپیٹ دینا چاہتا ہوں۔“ اس نے بھیا نک آواز میں کہا۔
”ب..... بچاؤ..... بچاؤ۔“ سرجن شہریار نے چیخا چاہا لیکن نو جوان کا چوڑا ہاتھ ان کے منہ پر آ پڑا

”بے کار کوشش ہے اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ دیکھو یہ ہتھوڑا ہے اور یہ اس کا عمل۔“ اس نے ہتھوڑا سرجن شہریار کے سر پر دے مارا اور سرجن کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ پھر نو جوان نے وزنی ہتھوڑے سے ان کے بدن کا ایک ایک عضو توڑ ڈالا۔ سرجن شہریار خون کی چادر میں لپٹ گئے تھے اور نو جوان کے چہرے پر بے پناہ خوشی جھلک رہی تھی۔
”تم جیسے جتنے ہوں گے میں ان سب کو قتل کر دوں گا۔ سب کو یہ سرخ چادر اور ہاڈوں گا۔ اچھا خدا حافظ۔“ وہ اپنا سامان لپیٹ کر واپس نکل آیا۔ اس کے رگ دپے میں سرور دوڑ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے اپنی زندگی کا اہم فریضہ پورا کر دیا ہو۔

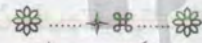
”لیکن.....“ اس نے خود سے کہا۔ ”میری اس پہلی کوشش کی کوئی یادگار ہونی چاہیے۔ ہاں یادگار ضروری ہے اس کا کوئی انتظام کرنا ہوگا..... انتظام۔“ دوسری صبح وہ ایک شخص کے سامنے کھڑا ہوا تھا عارف نامی یہ شخص شہر کے فٹ پاتھ پر گدائی کا کام کرتا تھا ہاتھوں بدن کے دوسرے حصوں پر ایک چھوٹی سی میٹین سے نام اور دوسرے نقوش گودنا اس کا کام تھا۔

”ایک حسین ساقش بنا کر اس پر میرے پہلے شکار کا نام لکھ دو۔“ نقاش اتنا حسین ہونا چاہیے کہ میری روح اسے دیکھ کر جھوم جائے۔ تمہیں اس کی منہ مانی قیمت ادا کروں گا۔“ نقاش نے نو جوان کی شکل دیکھی بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی تاہم اس نے کچھ تفصیلات معلوم کیں اور پھر اس کی خواہش کے مطابق نقاش پناہ میں مصروف ہو گیا۔ نو جوان نے

ایک نام کے چند حروف بازو پر کندہ کرائے نقاش نے اس کی خواہش کے مطابق خوب صورت نقاش نگاری میں وہ نام لکھ دیا تھا اور نو جوان اسے دیکھ کر مسرور ہو گیا۔

”تم واقعی ذکاور ہو، بولو اپنے فن کی کیا قیمت طلب کرتے ہو؟“
”جو تمہارا دل چاہے دے دو۔“ نقاش نے جواب دیا اور نو جوان نے دس دس کے دس نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے یہ بہت زیادہ رقم تھی۔ نقاش ایسے نقاش گوڈنے کے زیادہ سے زیادہ دس یا تیس روپے لیا کرتا تھا۔ سو روپیہ اس کی توقع سے نہیں زیادہ تھے۔ اس نے خوش ہو کر یہ رقم قبول کر لی تب نو جوان نے پوچھا۔

”میں تمہارے پاس آتا رہوں گا اگر تم یہاں نہ ملو تو میں تمہیں کہاں تلاش کروں؟“
”میں تمہیں اپنے گھر کا پتا بتائے دیتا ہوں شام کو کسی بھی وقت مجھ سے مل سکتے ہو۔“ نقاش نے جواب دیا اور نو جوان کو اپنے گھر کا پتا دے دیا۔ نو جوان خوشی خوشی واپس چلا گیا تھا۔



صابر علی کی حالت کئی دن میں ٹھیک ہوئی تھی ڈی آئی جی صاحب سے اگر ان کی دوستی نہ ہوتی تو شاید وہ پولیس میں رپورٹ درج کر دیتے لیکن جو نبی ان کی حالت بہتر ہوئی وہ ڈی آئی جی صاحب کی کوشی پر پہنچ گئے۔ ڈی آئی جی صاحب نے ان کا ہر تپاک خیر مقدم کیا تھا لیکن ان کا چہرہ دیکھ کر انہیں ہنسی آ گئی۔

”ارے بھئی صابر علی! یہ تمہارے دانت کچھ اور بھی دانت غائب ہو گئے تمہارے؟“
”میں سخت تکلیف کا شکار ہوں، تین چار دن سے

عجیب عذاب کا شکار رہا ہوں۔ اگر میری صحت نگہداشت نہ ہو جاتی تو ممکن تھا کچھ اور خرابیاں بھی پیدا ہو جاتیں۔“
”مگر ہوا کیا؟“

”کرامت صاحب صورت حال کچھ ایسی عجیب و غریب ہے کہ میں خود بھی نہیں سمجھ پایا ہوں سمجھو کہ تمہارے لیے بھی کچھ پریشانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ سعدیہ کہاں ہے؟“ صابر علی نے پوچھا اور ڈی آئی جی کرامت چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔
”اندر موجود ہے کیوں سعدیہ سے کوئی کام ہے؟“

”میں تمہیں ایک عجیب و غریب واقعہ سنانا چاہتا ہوں، کیا تم یقین کرو گے کہ میری یہ حالت سعدیہ نے بنائی ہے اور کیا تم یہ بھی یقین کرو گے کہ وہ تمہارا سرور پستول لیے پھرتی ہے اور لوگوں کو ڈرا دھمکا کر مختلف حرکات کرتی ہے؟“

”کیا.....؟“ کرامت صاحب کا چہرہ حیرت سے پھیل گیا۔

”ہاں کرامت! اس رات جب میں اس کے جشن صحت کی تقریب سے واپس گیا رات کو تقریباً ڈھائی بجے وہ میری کوشی پر پہنچی اس نے کھڑکی کے ذریعے اندر داخل ہو کر میرے سینے پر پستول رکھ دیا اور مجھ سے کہا کہ اسے میرے یہ دانت درکار ہیں اگر عام سی بات ہوتی تو کوئی حرج نہیں تھا میری پتی ہے میں اس کی خواہش پوری کر دیتا لیکن میرے وہ دانت دوسرے دانتوں سے منسلک تھے۔ تمہیں علم ہے کہ میں نے باہر جا کر یہ دانت لگوائے تھے میں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ کہنے لگی کہ اسے یہ دانت بہت پسند ہیں اور جس طرح بھی ممکن ہوگا وہ انہیں حاصل کر لے گی چنانچہ اس نے میرے

سینے پر پستول رکھ کر اوزاروں سے میرے وہ دانت اکھاڑ لیے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے دانت بھی۔ مجھے اس نے شدید زخمی کر دیا تھا، تین چار دن ڈاکٹر ہاشم سے اپنے دانتوں کا علاج کراتا رہا ہوں ابھی تک میں نے اس بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ آج مجھے بولنے میں شدید تکلیف ہو رہی ہے، میں اس سے زیادہ بول بھی نہیں سکتا۔ صابر علی نے کہا۔

”کیا کہہ رہے ہو صابر! تمہارا دماغ تو درست ہے؟“

”ہاں میاں! یہی کہو گے اب لیکن یہ حقیقت ہے۔ خدا جانے ایسا کیوں ہوا؟ براہ کرم تم سعدیہ کو میرے سامنے بلا کر بات کرو۔“

”صابر صاحب بات عقل میں آتی ہو تو کچھ کہوں ایسی انوکھی بات بتائی ہے آپ نے کہ اس پر یقین کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

”تمہارے خیال میں میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“

”نہیں! میں یہ تو نہیں کہتا لیکن کوئی عجیب سی بات کوئی ایسی غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو جو ناقابل فہم ہے پھلا سعدیہ کو ان سونے کے دانتوں کی کیا ضرورت تھی؟“

”دن میں اس نے مجھ سے ان دانتوں کے حصول کی فرمائش بھی کی تھی۔ میں نے اس فرمائش کو ایک مذاق ہی تصور کیا تھا لیکن وہ میرے ساتھ یہ حشر کرے گی اس کا تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔“

”مگر میاں کوئی عقل میں آنے والی بات ہو تو میں اس سلسلے میں کوئی تفتیش بھی کروں۔“

”کرامت صاحب میں تو تمہارا دوست ہوں لیکن خدا کے لیے اس سے معلوم کرو کہ یہ اسے کیا سوچھی؟“

”ہوں وہ اس قدر شری فطرت بھی نہیں ہے نا ہی میں نے اس کی فطرت میں کوئی جارحیت پائی ہے نرم و معصوم سی لڑکی۔ تعجب کی بات ہے تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”تحقیقات کر لو اس کے بعد مجھ سے رابطہ قائم کرنا۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کہہ سکوں گا۔ تمہیں بتانا ضروری سمجھا ظاہر ہے کہ اس کے علاوہ میں اور کبھی کیا سکتا تھا۔“ صابر علی نے کسی قدر ناخوش گواری کے انداز میں کہا اور پھر کرامت صاحب سے اجازت لے کر چلا آئے لیکن کرامت صاحب شدید حیرت کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے سعدیہ کو بلایا اور اس سے اس سلسلے میں سوالات شروع کر دیئے سعدیہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”جی ہاں ڈیڈی! میں نے انکل صابر علی کے دانت نکالے تھے وہ میرے نوادر خانے میں موجود ہیں۔ دراصل ڈیڈی! کچھ دنوں سے میرے ذہن میں نوادرات جمع کرنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ دنیا کی انوکھی چیزیں اپنے نوادر خانے میں جمع کروں چنانچہ اسی سلسلے میں مجھے صابر انکل کے دانت پسند آئے تھے اور میں نے وہ دانت جس طرح بھی ممکن ہو سکنا حاصل کر لیے۔“

”گویا..... گویا تم نے..... تم نے میرا سروں پستول ان کے سینے پر رکھ کر ان کے دانت نکال لیے تھے؟“

”جی ہاں ڈیڈی! اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔“

”سعدیہ! تمہارا دماغ درست ہے؟“

”ایں ہاں ڈیڈی! دماغ تو میرا درست ہی ہے بس یہ خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی ہے اب میں

کیا کروں؟ آپ ہی مجھے بتائیے۔“

”کیا بکواس کر رہی ہو تم، اگر تم نے واقعی یہ حرکت کی ہے تو اس کا اعادہ نہیں ہونا چاہیے۔ صابر علی کو تو میں کسی نہ کسی طرح سنبھال لوں گا لیکن باقی تمام لوگ تو میرے دوست نہیں ہو سکتے۔“ سعدیہ کے جانے کے بعد کرامت صاحب گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے سخت پریشان تھے۔ پچھلے دنوں قتل کی دو ایسی وارداتیں ہوئی تھیں جن میں ان کے بدن کا ہر عضو توڑ دیا تھا انہیں کسی ایسی چیز سے ہلاک کیا گیا تھا جو وزن دار تھی، دھار دار نہ تھی لیکن قاتل نے جس بری طرح اور بے دردی سے انہیں ہلاک کیا تھا وہ بڑی خوف ناک بات تھی ایسا ہی ایک قتل ایک اور شخص کا ہوا تھا۔ یہ ایک صنعت کار تھا اور اسے بھی اسی طرح ضربیں لگا کر قتل کر دیا گیا تھا۔ سرجن شہریار کا قتل معمولی نہیں تھا۔ نیوروسرجری کی دنیا میں ایک ایسا خلاء پیدا ہو گیا تھا جس کو پر کرنا ناممکن تھا حکومت خاص طور سے اس قتل کی تحقیقات میں مصروف تھی ابھی تک کوئی ایسا سراغ نہیں مل سکا تھا جس سے قاتل کو تلاش کیا جاسکتا اور اب یہ نئی انوکھی واردات جس نے انہیں حیران کر کے رکھ دیا تھا۔ سرجن شہریار کے تو وہ خود بھی ممنون کرم تھے کیونکہ انہوں نے ان کی بیٹی کا آپریشن کیا تھا اور اسے ایک نئی زندگی بخش دی تھی۔ دوسرا آدمی بھی معمولی حیثیت کا نہیں تھا ان معاملات میں الجھنے کے بعد یہ نئی الجھن ان کے لیے پیدا ہو گئی تھی۔ بہر طور انہوں نے تحقیقات کی تو پتا چلا کہ ہاں اس رات تقریباً دو بجے سعدیہ کار لے کر باہر نکلی تھی۔ چوکیدار نے اسے ٹوکا تھا لیکن اس نے چوکیدار کو ڈانٹ دیا تھا اس طرح صابر علی کے بیان کی تصدیق ہو جاتی تھی لیکن آخر ایسا کیوں کیا سعدیہ نے؟ یہ بات اس کے ذہن میں

کیوں پیدا ہوئی وہ تو اس قسم کی لڑکی نہیں تھی۔

اسی شام ایک اور بڑی خبر انہیں سننے کو ملی یہ خبر بھی انہیں فون پر ہی ملی تھی۔ قومی عجائب گھر سے ایک کھوپڑی چوری ہو گئی تھی یہ کھوپڑی قبل از تاریخ کی تھی اور اسے نوادر خانے میں محفوظ رکھا گیا تھا۔ نوادر خانے کے چوکیدار نے جو اس وقت وہاں موجود تھا اپنی آنکھوں سے سعدیہ کو شوکیس کا شیشہ توڑ کر وہ کھوپڑی نکالتے دیکھا تھا۔ چوکیدار نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے پستول نکال لیا اور یہ سرکاری پستول ہی تھا۔ یہ پستول گھر پر ہی رہتا تھا عام حالات میں اسے وہ استعمال نہیں کرتے تھے لیکن یہ سرکاری ہی تھا۔

کرامت صاحب یہ شکایت سن کر دنگ رہ گئے سعدیہ سے رابطہ قائم کیا تو اس نے پرمسرت انداز میں کہا۔

”ڈیڈی! یہ میرے نوادر خانے میں دوسرا اضافہ ہے، انکل صابر کے حسین دانت اور اس کے بعد یہ انسانی کھوپڑی۔ آپ دیکھیے گا میں اپنے نوادر خانے کو کس طرح سجاتی ہوں۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، کیا پاگل پن کی حرکتیں کرتی پھر رہی ہو، میں تمہیں کہاں کہاں سنبھالتا پھروں گا۔ میرا سروں پستول استعمال کرتی رہی ہو، تم اگر محافظ خانے کے چوکیدار کو زخمی کر دیتیں تو پھر شاید میرے لیے بھی تمہاری حفاظت کرنا ناممکن نہ ہوتا۔“

”اب تو کچھ بھی ہو ڈیڈی! مجھے اپنا یہ کام کرنا ہی ہے آخر نوادر خانہ کس طرح مکمل ہوگا؟“

”وہ کھوپڑی نوادر خانے کو واپس کر دو ورنہ میں تمہیں گرفتاری سے نہ بچا سکوں گا۔“

”نہیں ڈیڈی! جو چیز میں حاصل کر لوں گی اسے کبھی واپس نہیں کروں گی چاہے مجھے قتل کیوں نہ

اسی دوران افتادہ آ پڑی تھی لیکن وہ اپنے معبود کے شکر گزار تھے کہ اس نے یہ کھن وقت نال دیا۔ اب ریاض حسن ٹھیک تھا لیکن ابھی اسے طویل آرام کی ضرورت تھی اس لیے انور علی نے اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔

سعادت مند بیٹا ان کا ہر حکم مانتا تھا ایک شام دونوں باپ بیٹے چائے پی رہے تھے کہ اچانک انور علی کی نگاہ ریاض حسن کے ہاتھ پر پڑی اس کے چوڑے ہاتھ کی کلائی پر عجیب و غریب نشانات بنے ہوئے تھے ان پر انگریزی کے حروف کندہ تھے انور علی چونک پڑے۔ سبھی ہوئی طبیعت کے مالک بیٹے کا یہ شوق ان کے لیے بالکل اجنبی تھا۔

”ریاض! یہ کیا ہے بیٹے؟“

”کہاں ڈیڈی؟“

”یہ تمہاری کلائی پر۔“

”اوہ یہ ڈیڈی! نہ جانے یہ نشانات کس طرح میرے بازو پر ابھرتے آ رہے ہیں میں خود حیران ہوں۔“

”ابھرتے آ رہے ہیں؟“ انور علی حیرت سے بولے۔

”جی ڈیڈی! پہلے یہ ایک نشان تھا پھر دوسرا اور پھر اب یہ دیکھیے یہ نئے نشانات ہو گئے ہیں۔“

”جی ہاں! بس ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کبھی کبھی مجھ پر بیٹھے بیٹھے سرخ روشنی پھیل جاتی ہے میری آنکھوں میں اور میرا ذہن اس روشنی کا قیدی بن جاتا ہے پھر مجھے کچھ یاد نہیں رہتا۔ میں سو جاتا ہوں اور جب جاگتا ہوں تو ایک نیا نشان میرے بازو پر ابھرتا ہے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟“ انور

بھی جلا بخشتی ہیں اور وہ اپنے مقابل پر قابو پانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔

سرجنوں نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ اس سلسلے میں سعدیہ کرامت کے سر کا ایک اور آپریشن کرنا پڑے گا۔ جو اب اس ملک میں ممکن نہیں ہے اس کے لیے اسے امریکا لے جانا ہوگا۔ ڈی آئی جی صاحب یہ تمام رپورٹیں پڑھ کر سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔

دوسری طرف تیسرا قتل بھی ہو چکا تھا ویسا ہی قتل جیسے پہلے دو قتل ہوئے تھے۔ قاتل بڑی سفاکی اور درندگی سے اپنے شکار کو کسی وزنی چیز سے ہلاک کر گیا تھا اور یہ شکار بھی معمولی حیثیت کا مالک نہیں تھا یہ بھی ایک مشہور و معروف ڈاکٹر تھا۔ ایک بہت بڑا ڈاکٹر۔

✽.....✽.....✽

انور علی سردور تھے ان کی زندگی کا سہارا واپس مل گیا تھا۔ ان کی چھوٹی سی دنیا میں اور تھا ہی کون۔ یہ حقیقت تھی کہ انہوں نے ساری زندگی صاف ستھری گزاری تھی ایک غلط پیسہ ان کی کمائی میں شامل نہیں ہوا تھا۔ ساری زندگی کی کمائی ریاض حسن ہی تھا عزیز واقارب نے ہمیشہ ان کا مذاق اڑایا تھا اور ان کی شرافت پر ہنستے رہتے تھے لیکن انہوں نے کسی کی پروا نہیں کی تھی۔ انہیں کچھ نہیں چاہیے تھا اپنی زندگی اپنی دنیا میں گزار دی تھی بیٹے کو ویل بنادیا تھا بس اب اس انتظار میں تھے کہ بنا برسر روزگار ہو جائے تو اس کی شادی کر کے زندگی کا یہ فریضہ بھی پورا کر لیں۔

عزیز واقارب عمدہ حیثیت کے مالک تھے ان کے ہم زلف خالد صاحب نے خواہش ظاہر کی تھی کہ انور علی ان کی بیٹی صائمہ کو بہو بنائیں اور صائمہ انور علی کو بھی پسند تھی انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ صائمہ کو اپنی بہو بنائیں گے۔

دونوں ایک دوسرے کی بہت عزت و احترام کیا کرتے تھے آلہ سماعت کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے لیے کوئی ہنگامہ ہو سکے لیکن پریشان کن بات یہ تھی کہ سعدیہ نے اسے حاصل کرنے کے لیے آلہ سماعت کے مالک کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ اس بار اس نے ایک چھری استعمال کی تھی جو باورچی خانے میں استعمال ہوتی تھی۔ اس مسئلے کو ہموار کرنے کے لیے کرامت صاحب کو بڑی مشکلات سے گزرنا پڑا اور اب ان کے ذہن میں وہ خیال تقویت پکڑ گیا چنانچہ انہوں نے اپنے طور پر کوششیں شروع کر دیں۔ سعدیہ کرامت کا ڈاکٹری معائنہ کرایا گیا، دو دماغی سرجنوں نے اس کے بہت سے ایکسرے لیے اور بڑی گہرائی سے اس کی دماغی کیفیت کا جائزہ لیا اور اس کے بعد جو رپورٹ کرامت صاحب کو پیش کی گئی وہ بڑی ہی پریشان کن اور تشویش ناک تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ سعدیہ کرامت بظاہر ذہنی طور پر بالکل صحت مند ہو گئی ہے لیکن اس کے ذہنی توازن میں ایک چھوٹا سا قسم رہ گیا ہے جب دماغ کی برقی لہریں ایک مخصوص خلیے سے گزرتی ہیں تو اس کے ذہن کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ کچھ کرے اور یہ کچھ نوادرات کا حصول تھا اسے خواہ مخواہ یہ شوق پیدا ہو گیا تھا کہ وہ عجیب و غریب چیزیں اپنے نوادر خانے میں جمع کرے۔ اس نوادر خانے کے بارے میں کوئی پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ کہاں بنایا گیا ہے لیکن کرامت کی یہ کیفیت بے حد تشویش ناک تھی چونکہ ڈاکٹر وی کی رپورٹ کے مطابق جب اس خلیے میں تحریک پیدا ہوتی ہے تو سعدیہ کرامت وہ سارے کام کر سکتی ہے جو انتہائی سفاکانہ اور ظالمانہ حیثیت کے حامل ہوں۔ اس وقت اس کے ذہن میں جو قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں وہ اس کی جسمانی قوتوں کو

کر دیا جائے۔“ سعدیہ نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا اور دفعتاً کرامت صاحب کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے سعدیہ اپنے حواس میں نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں وہ کانپ کر رہ گئے۔ سعدیہ خاموشی سے واپس چلی گئی تھی لیکن کرامت صاحب کے لیے سوچنے کو بہت کچھ چھوڑ گئی تھی۔

نوادر خانے کی واردات کے سلسلے میں انہوں نے بڑی تگ و دو کی تب کہیں جا کر معاملہ ٹھنڈا ہو سکا۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کھوپڑی نوادر خانے کو واپس کر دی جائے گی اور اس کا نقصان بھی پورا کر دیا جائے گا اگر ان کے خصوصی اثر و رسوخ نہ ہوتے اور ان کی اپنی یہ حیثیت نہ ہوتی تو نوادر خانے میں جو واردات ہوتی تھی اس کے سنگین نتائج بھی برآمد ہو سکتے تھے لیکن انہوں نے ذہانت سے کام لے کر اس معاملے کو ٹھنڈا کر دیا تھا اور کچھ لوگوں کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ اسے پولیس کیس نہ بنائیں بلکہ فی الحال خاموشی اختیار کریں۔

یہ مسئلہ ٹل گیا تھا لیکن کرامت صاحب کی یہ کیفیت بڑی پریشان کن تھی۔ انہوں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ اپنا سروس ریوالور محفوظ کر دیا اور کوئی ایسا ہتھیار کوئی میں باقی نہ رہنے دیا جس کو وہ استعمال کر سکے۔ اس کے بعد انہوں نے دو آدمی سعدیہ کی نگرانی پر لگا دیئے اور اس کی تمام حرکات و سکنات کا جائزہ لیا جانے لگا۔

تیسری واردات بھی سعدیہ نے نہایت ذہانت سے کی تھی یہ ایک آلہ سماعت کی چوری تھی اور اسے چرانے کے لیے سعدیہ کرامت نے بڑے خطرات مول لیے تھے یہ آلہ سماعت بھی ایک ایسے شخص کا تھا جو کرامت صاحب کے دوستوں میں سے تھا اور

علی نے حیرت سے کہا۔

”یہ ہوتا ہے ڈیڈی! سرخ روشنی میں بہت سے چہرے ابھرتے ہیں قابلِ نفرت چہرے دل چاہتا ہے انہیں فنا کر دوں! نہیں مٹا دوں اور بس.....“

”اللہ رحم کرے یہ بہت عجیب بات ہے۔“ انور علی بڑبڑائے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

✽.....✽

”قاتل کوئی دیوانہ ہے، کوئی جنونی۔ آپ نے یہ غور کیا کہ اس کا محور کوئی نہیں ہے، مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے اس کا شکار ہوئے ہیں لیکن ایک بات قابلِ غور ہے۔“

”وہ کیا؟“

”ہلاک ہونے والا کوئی بھی شخص معمولی انسان نہیں ہے سب دولت مند اور صاحبِ حیثیت لوگ ہیں۔“

”جو کوئی بھی ہیں معزز شہری ہیں اور مزید لوگ خطرات کا شکار ہیں۔ آپ لوگ جس قدر جلد ممکن ہو اس جنونی کو تلاش کر کے گرفتار کریں اس سے زیادہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی بدنامی برداشت نہیں کی جاسکتی۔“ ڈی آئی جی صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔

”ہر ممکن کوشش ہو رہی ہے جناب! آج ہی کے اخبار میں تمام مقتولین کے نام شائع کر دیئے گئے ہیں اور عوام سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ خود بھی اس جنونی قاتل کی تلاش میں پولیس کی مدد کریں۔“

”عوام اس سلسلے میں بھلا کیا مدد کر سکتے ہیں؟ آپ لوگ خود ہی کوشش کریں۔“ ڈی آئی جی صاحب نے کہا۔ ”اور اس سلسلے میں کسی معمولی سی بات کی اطلاع مجھے دی جائے۔“

کئی قتل ہو چکے تھے قاتل مقولین کی ہڈیاں توڑ

دیتا تھا لیکن ابھی تک قتل کا مقصد واضح نہیں ہوا تھا، جن جگہوں پر قتل ہوئے تھے وہاں لاکھوں روپے مالیت کی قیمتی اشیاء موجود ہوتی تھیں لیکن انہیں چرانے کی کوشش کبھی نہیں کی گئی تھی۔ ابھی تک قاتل نے کوئی چوک نہیں کی تھی اور اس کے بارے میں کوئی معلومات نہیں حاصل ہو سکی تھیں۔

چنانچہ ڈی آئی جی نے یہ میٹنگ طلب کی تھی اور تمام رپورٹیں دیکھنے کے بعد اس سلسلے میں احکامات جاری کیے تھے اسی شام پانچ بجے کے قریب ایک پولیس اسٹیشن کے ہیڈ کوارٹر کو ایک رپورٹ موصول ہوئی اور اس کیس کے انچارج ایس پی نے اس شخص کو فوراً ہیڈ کوارٹر طلب کر لیا جس نے اسٹیشن کو رپورٹ دی تھی۔ اسٹیشن انچارج اسے لے کر ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔

”تم نے پولیس سے رابطہ قائم کر کے ایک شریف اور ذمہ دار شہری ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ہم تمہارے شکر گزار ہیں اب ذرا تفصیل سے بتاؤ وہ شخص پہلی بار تم سے کب ملا تھا؟“

”تقریباً ایک ماہ قبل اس نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ اس کے بازو پر ایک یادگار نقش بناؤں۔“

”نام کے حرف اس نے خود بتائے تھے؟“

”جی اور اس نے پہلی بار مجھے سو روپے دیئے تھے اس کے بعد دو مرتبہ وہ بازار میں آیا اور تین مرتبہ میرے گھر۔“

”گھر کا پتا تم نے اسے دیا تھا؟“

”ہاں جناب۔“

”اس نے اپنا نام کبھی نہیں بتایا؟“

”نہیں جناب۔“

”حلیہ بتاؤ اس کا۔“ ایس پی نے کہا اور اس شخص

نے حلیہ نوٹ کر دیا۔

”بعد میں اس شخص نے تمہیں کتنے پیسے دیئے؟“

”پچاس روپے جناب۔“

”کیا وہ کوئی دولت مند آدمی معلوم ہوتا تھا؟“

”نہیں، بلکہ کوئی غریب آدمی کیونکہ بعض اوقات

اس نے مجھے پانچ پانچ روپے کے نوٹ اور ریز گاری

بھی دی تھی۔ اس کے علاوہ وہ پیدل آتا تھا موٹر

سائیکل بھی نہیں تھی اس کے پاس۔“ نقاش نے

جواب دیا۔

”لباس وغیرہ؟“

”کئی بار ایک ہی لباس میں آچکا ہے، معمولی

کپڑے کے قمیص پتلون یا شلوار کرتے ہیں۔“

”تمہیں کیسے شبہ ہوا کہ وہ کوئی غلط انسان ہے؟“

”آج کے اخبار سے جناب! سوچتا تو میں بھی تھا

اس کے بارے میں کہ آخر وہ کون ہے اور یہ سب

کیوں کرتا ہے آج اخبار میں وہ سارے نام پڑھے

جو میں اس کے بازو پر نقش کر چکا ہوں۔“

”پڑھے لکھے آدمی ہو؟“

”میٹرک تک جناب۔“

”شکل و صورت سے وہ کوئی پڑھا لکھا آدمی نظر

آتا تھا؟“

”ہاں صاحب بالکل۔“

”ٹھیک ہے دوست تمہارا شکریہ اب تمہیں ایک

کام کرنا ہے؟“

”جی جناب۔“

”پولیس کے دو آدمی تمہارے قریب ہی دکان

لگائیں گے اور کوئی بھی شے فروخت کریں گے جس

وقت بھی وہ تمہارے پاس آئے تم انہیں اشارہ کر دو

گے۔ جب تم اپنا کام بند کر کے گھر جاؤ گے تب

دوسرے دو آدمی تمہارے آس پاس ہوں گے، تمہیں

ان کے بارے میں بتا دیا جائے گا اگر وہ تمہارے گھر

آئے تو کسی طرح اسے باتوں میں لگا کر ان دونوں کو

اشارہ کر دو گے ویسے گھر وہ کس وقت آتا ہے؟“

”عموماً شام کو سات بجے کے بعد۔“

”اوکے اگر وہ گرفتار ہو گیا تو تمہیں انعام دیا

جائے گا۔“ ایس پی نے کہا اور نقاش کو رخصت

کر دیا۔ پولیس ہیڈ کوارٹر میں ایک بار پھر میٹنگ ہوئی

تھی۔

✽.....✽

خالد صاحب صاحب حیثیت انسان تھے صائمہ

کے بارے میں وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اسے ریاض

حسن سے بیاہ دیا جائے۔ صائمہ خود بھی ان سے متفق

تھی چنانچہ اب ریاض حسن کے برسرِ روزگار ہونے کا

انتظار تھا۔ اس دوران ریاض حسن اور صائمہ کی

ملاقاتوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی ویسے بھی

ریاض حسن صائمہ کا خالہ زاد بھائی تھا۔

چنانچہ اس وقت بھی دونوں لان میں بیٹھے چائے

پی رہے تھے جب ڈی آئی جی کرامت کی بیٹی سعدیہ

کرامت صائمہ سے ملنے آئی۔ دونوں کاج فیلو تھیں

اور ترک تعلیم کے بعد بھی ایک دوسرے سے ملتی رہتی

تھیں۔

صائمہ نے ان دونوں کا تعارف کرایا تو سعدیہ

نے بے تکلفی سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ریاض حسن کو

اس سے ہاتھ ملانا پڑا تھا وہ ہاف آسٹین کی شرٹ

پہنے ہوئے تھا، دفعتاً سعدیہ کی نگاہ اس کے بازو پر

جا پڑی۔

”اوہ! کیا عمدہ نقش بنوائے ہیں آپ نے۔ انوکھا

شوق ہے۔“ سعدیہ نے کہا۔

”انوکھا اور عجیب یہ پراسرار نقش خود بخود ریاض

حسن کے ہاتھ پر نمودار ہوتے ہیں کیا یہ ناقابل

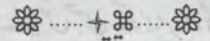
یقین انکشاف نہیں ہے سعدیہ؟“

سعدیہ کسی اور ہی خیال میں کھوئی تھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”ہم لوگ اسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔“ سعدیہ نے کچھ نہیں سنا وہ آہستہ سے بولی۔

”نادر چیز ہے یہ باز محفوظ رکھنے کے قابل۔“ ”ریاض میرے منگیتر ہیں۔“

”اوہ! خوب کہاں رہتے ہیں؟“ سعدیہ نے پوچھا اور صائمہ نے سادگی سے ریاض حسن کے گھر کے بارے میں بتا دیا۔ سعدیہ کسی خیال میں کم ہو گئی تھی اس نے عام لڑکیوں کی طرح مذاق کی کوئی بات بھی نہ کہی تھی۔



چھپلی رات ایک اور قتل ہوا تھا۔ دوسری شام کو پولیس مستعد ہو گئی تھی اور ٹھیک آٹھ بجے نقاش نے اس شخص کے بارے میں پولیس کے سادہ لباس والوں کو اس کی آمد کے بارے میں اطلاع دی تھی اور جب نیا نقش کندہ کرا کے وہ واپس گیا تو انہوں نے اس کا تعاقب کیا تھا اور ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ دے دی گئی تھی۔

رات کو گیارہ بجے پولیس نے اس گھر کا محاصرہ کر لیا اور اب انچارج کی آمد کا انتظار تھا تا کہ چھاپہ مارا جاسکے۔

سوا گیارہ بجے ایک سرخ رنگ کی کار اس مکان کے دروازے پر آ کر رکی اور ڈی آئی جی صاحب کی بیٹی سعدیہ کرامت کو کار سے اتر کر اندر جاتے دیکھا گیا۔

ساڑھے گیارہ بجے عمارت سے ایک دل خراش چیخ بلند ہوئی تو پولیس انتظار نہ کر سکی اور اندر گھس گئی ایک روشن کمرے میں اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ سعدیہ کرامت کے ہاتھ میں ایک تیز دھار والا کاٹھا



روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

قمر النساء..... کوئٹہ، کراچی

جواب: مسات بار سورۃ الفجر خود نہ پڑھ سکو تو کسی سے بلند آواز سے پڑھوا کر سنو روزانہ۔

زل ک..... کجناہ

جواب: بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ پڑھیں اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف کے ساتھ۔ دعا بھی کریں۔

ش۔ن..... نامعلوم

جواب: مسئلہ 1: فجر کی نماز کے بعد سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ اول و آخر 11، 11 مرتبہ درود شریف۔ دعا یہ مانگیں کہ جہاں حق میں بہتر ہو وہیں رشتہ ہو۔ عشاء کی نماز کے بعد 1 سبج استغفار 1 سبج درود شریف (درود ابراہیمی) دعا بھی کریں۔

مسئلہ 2: بیٹے کے سر ہانے کھڑے ہو کر جب وہ سو جائے سورۃ العصر پڑھیں 41 مرتبہ اول و آخر 11، 11 مرتبہ درود شریف اتنی آواز میں کہ اگر جاگ رہا ہو تو سن سکے۔

تمثیلہ شہزادی..... حافظ آباد

جواب: مہینہ نہانے کے بعد لگا تا 3 دن ملنے سے پہلے سورۃ الصبحی 21 بار پڑھ کر دعا کیا کریں۔

نسرین اختر..... ہری پور ہزارہ

جواب: ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھ کر اپنے بچوں کے لیے دعا کریں۔ مالی حالات کے لیے سورۃ القریش 1 سبج روزانہ۔

سعدیہ..... پشاور

جواب: ”رجوع الی اللہ“ سب کچھ بھول کر اللہ سے تعلق جوڑو۔

بعد نماز فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74، 70

بار پڑھیں۔ اول و آخر 11، 11 بار درود شریف۔ بہتر رشتے کی دعا بھی کریں۔ دونوں بہنیں و بھتیجیاں۔ عمل 4 ماہ۔

آمنہ اعوان..... حیدر آباد

جواب: ”یا حکیم یا اللہ“ تعداد 1000 مرتبہ روزانہ رات کے وقت اول و آخر 11، 11 مرتبہ درود شریف (درود ابراہیمی)۔ دعا بھی کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے اس کے تمام مسائل حل فرمائے۔

پڑھتے وقت مسائل حل ہونے کا تصور ذہن میں رکھ کر پڑھیں۔

انوری بیگم..... قمریشیاں والا

جواب: 1: رشتوں کے لیے: سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ بعد نماز فجر (اول و آخر 11، 11 مرتبہ درود شریف)۔

2: فجر کی نماز کے بعد 3 مرتبہ سورۃ یسین پڑھیں اپنے تمام مسائل کا تصور رکھ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ۔

3: گھٹنے کے درد کے لیے: زیتوں کے تیل پر اللہ کے تمام نام 1 مرتبہ پڑھ کر دم کر لیں اسے روزانہ لگائیں۔ نورین شفیع..... ملتان

جواب: 1: بھائی کو درود شریف کا پانی پلایا کریں روزانہ جتنی مرتبہ ہو سکے پڑھ کر۔

2: جب گھر میں جینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر دم کر دیں (اول و آخر 3، 3 مرتبہ درود شریف) جینی گھر کے تمام افراد کے استعمال میں آئے۔

3: معاشی مسائل کے لیے ہر نماز کے بعد 7 مرتبہ سورۃ قریش گھر کے تمام افراد پڑھیں۔

4: بسم اللہ پڑھ کر چیزیں رکھا کریں۔ صبا..... لاہور

جواب: سورۃ یسین کی آیت نمبر 65 روزانہ 1 سبج پڑھ لیں۔ پہلے اس کا ترجمہ پڑھ لیں۔ اس کے بعد شروع کیجیے گا۔ ہر نماز کے بعد۔

شازی بی بی..... نامعلوم

جواب:- اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ اتنا کچھ پڑھتی ہو بہر حال اپنے قریبی اچھے عامل سے رجوع کریں۔
38 سات مرتبہ پڑھیں اولاد کے لیے دعا کریں۔
ش۔ م..... منڈی بہاؤ الدین

جواب:- سعدیہ مسعود..... جہلم
جواب:- مسئلہ نمبر 1:- ہوائی مخلوق تنگ کر رہی ہے۔
”سورۃ جن“ روزانہ 7 مرتبہ پڑھ کر پانی پر دم کر کے پورے گھر میں چھڑکیں باتھ روم کے علاوہ روزانہ۔
مسئلہ نمبر 2:- یہی پانی اسے بھی پلا میں۔
خالہ پروین..... فیصل آباد

جواب:- وظیفہ جاری رکھیں چھوڑیں نہیں مسئلہ ضرور حل ہوگا۔ ان شاء اللہ صدقہ بھی دیں۔
بھائی کے لیے بھی دعا کریں کہ اگر حق میں بہتر ہے تو ہو جائے ورنہ کہیں اور۔
تس..... کوہاٹ

جواب:- فجر کی نماز کے بعد سورۃ الفاتحہ 41 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ مرض والی جگہ پر ہاتھ رکھ کر پڑھیں۔ صدقہ بھی دیں۔ ان شاء اللہ بہت جلد آپ کا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔
یہ عمل ہمیشہ جاری رکھیں گی تو کوئی بیماری مستقل نہیں ہوگی۔
نورین غلام سرور..... قصور

جواب:- 1:- امتحان میں کامیابی کے لیے۔ ”یا فتاح“ 1 تسبیح روزانہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ امتحان شروع ہونے سے نتیجہ آنے تک سب کر سکتے ہیں۔
2:- ورزش کریں۔
آب علی..... چکوال

جواب:- نوکری کے لیے:- سورۃ القیش ہر نماز کے بعد 21 مرتبہ یا رات کو 3 تسبیح بھائی خود کریں تو بہتر ہے۔ ورنہ والدہ کریں۔
مقدمہ میں کامیابی کے لیے:- ”یا عدل“ روزانہ 1000 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف رات کے وقت۔ پڑھتے وقت کامیابی کا تصور ذہن میں رکھیں۔

جواب:- سورۃ الفلق، سورۃ الناس 21'21 مرتبہ۔ بعد نماز عشاء بیماری کے ٹھیک ہونے کا تصور رکھ کر

میں رکھیں۔

امتحان میں کامیابی کے لیے:- سورۃ القیش پڑھیں ہر نماز کے بعد 7 مرتبہ۔

آپ جو وظائف کرتی ہیں وہ کریں یا نہ کریں آپ کی مرضی۔ جن مسائل کے لیے رجوع کیا ہے ان کے لیے کوئی اور وظیفہ نہ پڑھیں علاوہ اس کے جو بتایا گیا ہے۔
رشتے کے لیے:- سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74، 70 مرتبہ بعد نماز فجر اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔
اس شخص سے پیچھا چھڑانے کے لیے رات کے وقت 1 مرتبہ سورۃ نوح پڑھا کریں۔ پڑھتے وقت پیچھا چھڑانے کا تصور بھی رکھیں۔ یہ تمام وظائف پاکی کی حالت میں کرنے ہیں۔

پروین افضل..... بہاول نگر
جواب:- 1:- میڈیکل چیک اپ کروائیے۔ اپنا اور شوہر کا۔ اس کا رزلٹ بتائیے پھر دیکھیں گے۔
2:- سورۃ یسین کی آیت نمبر 65 ہر نماز کے بعد 21 بار پڑھیں دیور کے لیے۔
فرزانہ بی بی..... راولپنڈی

جواب:- ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ ”یا فتاح“ امتحان شروع ہونے سے نتیجہ آنے تک تینوں پڑھیں۔
ب۔ ش۔ زر..... کراچی

جواب:- بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ روزانہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ یقین کے ساتھ پڑھیں۔
طیبہ انصار..... ضلع جہلم

جواب:- سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74، 70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف ہر نماز کے بعد سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 99 مرتبہ۔
سیدہ فوزیہ گیلانی..... لاہور

جواب:- ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھیں۔ تصور رکھیں دونوں کاموں کے ہونے کا۔

ثوبیہ بی بی..... کالونینڈ

جواب:- رشتے کے لیے:- بعد نماز فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74، 70 مرتبہ روزانہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

پورے گھر میں روزانہ پانی چھڑکیں اور پینیں بھی دم کر کے باتھ روم کے علاوہ سورۃ الفلق، سورۃ الناس 41'41 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔
بہنیں ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھیں اور دعا کریں۔ اپنے لیے بھی اور ابو کے لیے بھی۔
عائشہ ناز..... ملتان

جواب:- ”یا علیم علمنی“ پڑھنے سے پہلے 21 بار پڑھ کر سبق یاد کریں۔ ان شاء اللہ کامیابی ہوگی۔
عش..... ڈنگہ

جواب:- 1:- جب گھر چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر دم کر دیں۔ جتنی سب کے استعمال میں آئے۔ (اول و آخر 33 بار درود شریف)
2:- قرض کی ادائیگی کے لیے عشاء کی نماز کے بعد 7 مرتبہ سورۃ العادیاں پڑھیں اور دعا کریں۔
3:- پلاٹ بیچنے کے لیے ہر نماز کے بعد سورۃ القیش 11 مرتبہ دعا کریں ان شاء اللہ جلد اچھا سودا ہو جائے گا۔

شامیہ اختر..... فیصل آباد
جواب:- عمل جاری رکھیں۔ مسئلہ ضرور حل ہوگا۔
صدقہ بھی دیں۔
شرہ..... جہلم

جواب:- جب شوہر سو جائیں ان کے سر ہانے کھڑے ہو کر 1 تسبیح سورۃ الاخلاص پڑھیں اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔
عائشہ اکرم..... ساہیوال

جواب:- رشتے کے لیے بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ (اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف) دعا بھی کریں۔

جواب:- سورۃ الفلق، سورۃ الناس 21'21 مرتبہ۔ بعد نماز عشاء بیماری کے ٹھیک ہونے کا تصور رکھ کر

2۔ اچھی نوکری اور معاشی مسائل کے لیے ہر نماز کے بعد 7 مرتبہ سورۃ القریش۔
3۔ گھریلو مسائل کے لیے جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ یسین (اول و آخر 3'3 مرتبہ درود شریف) پڑھ کر دم کر دیں۔ چینی سب کے استعمال میں آئے۔

4۔ خود اعتمادی کے لیے فیصلے لینا سیکھیں۔

سعدیہ..... گوجرانوالہ

جواب:- رشتوں کے لیے سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74، 70 مرتبہ بعد نماز فجر۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

قرض کی ادائیگی کے لیے سورۃ العادیات روزانہ رات کو 11 مرتبہ (اول و آخر 11'11 درود شریف) بھائی کے لیے والدہ دعا کریں۔

ن۔ س۔ نور..... چکوال

جواب:- مسئلہ نمبر 1:- والقینا بیضم..... یوم القیامہ۔ تک۔ سورۃ المائدہ آیت نمبر 64 اول و آخر 11'11 مرتبہ درود ابراہیمی۔ روزانہ رات کے وقت 1000 مرتبہ

تصور یہ ہو کہ دونوں کے بیچ میں نفرت پیدا ہو رہی ہے۔ آیت کے معنی ذہن میں رکھ کر پڑھیں۔

مسئلہ نمبر 2:- سورۃ ال عمران آیت نمبر 38 ہر نماز کے بعد 7 مرتبہ پڑھیں اور دعا کریں علاج بھی ساتھ شروع کروائیں۔

قیصر محمود..... امریکہ

جواب:- بعد نماز عشاء سورۃ والضحیٰ 41 مرتبہ (اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف) تصور نہیں کہ دل اور دماغ میں گھر کی محبت اور ذمے داری پیدا ہو رہی ہے اور گھر کی طرف لوٹ کر آ رہے ہیں۔

ن۔ گ..... ہری پور

جواب:- بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ۔ (اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف)

سمیرا منیر..... حافظ آباد

جواب:- جب گڑھے میں کودنے کا فیصلہ آپ نے کر لیا ہے تو افسوس کیوں؟ شادی ہوگی یا نہیں یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔

ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھ کر دعا کریں کہ جہاں آپ کے حق میں بہتر ہو وہیں شادی ہو جائے۔



نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔ ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے اپریل 2013ء

گھر کا مکمل پتا

نام والدہ کا نام

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں

خوشیوں و مسکن

عمر اسرار

لوٹ جاؤ

لوٹ جاؤ ابھی سے

یہ محبت کا جنگل

وسیع تر ہے

کچھ وقت جو گزار لو گے

دل اپنا جو بارود گے

یاد کرو گے عمر بھر پھر

بتی ساعتیں

میٹھی باتیں

بازگشت بن کر لوٹیں گی

سماعتوں میں

بے چین رہیں گی تمہیں

دنیا کی آبادیوں میں

سو

لوٹ جاؤ ابھی سے

کہ

ابھی تو وقت تمہارا ہے

ورنہ کھو جاؤ گے تم بھی

راہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے

لوٹ جاؤ ابھی سے

لوٹ جاؤ ابھی سے

ریحانہ سعیدہ..... لاہور

ڈرتا ہوں

رفتاتوں کے سفر میں عناد ڈرتا ہوں
کہ ناگزیر ہے دنگا فساد ڈرتا ہوں
یہ راہزنی یہ ڈھپتی یہ چور بازاری
کرے گا کون یہاں انسداد ڈرتا ہوں

یہاں تو پھول کی خوشبو بھی زہر قاتل ہے
یہاں تو مردہ بھی ہے زندہ باد ڈرتا ہوں
نہ توڑ پائیں گے ظلم و جفا کے ہاتھوں کو
یہ قوم چھوڑ چکی ہے جہاد ڈرتا ہوں
یہاں اکیں گے یقیناً نفاق کے پودے
پڑی ہے فرقہ پرستی کی کماد ڈرتا ہوں
ہر ایک چہرہ یہاں ہے نقاب کے پیچھے
شرافتوں کا ہے رخ پر صنماد ڈرتا ہوں
جو جھوٹ بات کو سچ کی دکان پر بیچیں
قمر ملی ہے یہاں ان کو داد ڈرتا ہوں

ریاض حسین قمر..... منگلا ڈیم
غزل

میری آنکھوں میں خواب رہنے دو
اک حسیں ماہ تاب رہنے دو
نخے ہاتھوں کی ان سے ہے زینت
یہ قلم یہ کتاب رہنے دو
زخم دل کے شمار کرتے ہو
ان کا ہم تک حساب رہنے دو
درس نفرت کتاب میں نہ رہے
الفتوں کا نصاب رہنے دو
اک نہ اک دن یہ لوگ جاگیں گے
ہم کو محو خطاب رہنے دو
گرچہ گملے میں ہے جمال ابھی
یہ مہکتا گلاب رہنے دو

سمیع جمال..... کراچی

غزل

جو بھی دکھ ہے اسے بھلا دینا
ہو سکے تم سنے مسکرا دینا
درد سہ لوں تیری جدائی کا
بس مجھے اتنا حوصلہ دینا

موت نے ہر طرف سے گھیرا ہے
زندہ رہنے کی تم دعا دینا
مجھ سے آخر خطا ہوئی ہے کیا
مجھ کو اتنا ذرا بتا دینا
لوٹ آنا صداؤں پہ میری
مجھ کو پتھر نہ تم بنا دینا
درد کی بارشوں سے تم پہلے
گھر کی دیوار کو اٹھا دینا
پیار کی بات ہو جہاں رانا
سر کو اپنے وہیں جھکا دینا

قدیر رانا

غزل

اب صبح کے موسم بہار بڑا عجیب آیا ہے
دست چین سے کوئی شجر نہ بیچ پایا ہے
زندگی کیا ایسے ہی گزر جائے گی
کسی نے بھی نہیں اس طرح سوچا ہے
سولی پہ چڑھا دیا مجھے لوگوں نے
منصف اپنے شہر میں نہیں کوئی نظر آیا ہے
یہ راز کسی کو نہیں معلوم
وہ میرا ہو کے بھی میرا نہ بنا
کتے چالیم لوگوں سے واسطہ میرا پڑا
خود ہی قتل کیا خود کندھا بھی دیا ہے
فصیل شہر پہ جا کے کون باہر دیکھے
شہر کے اندر نہ جسے کچھ نظر آیا ہے
وسیم اختر.....راولپنڈی

غزل

وہ کوئی اور نہ تھے چند خشک پتے تھے
شجر سے ٹوٹ کے جو فصل گل پہ روئے تھے
ابھی ابھی تمہیں سوچا تو کچھ نہ یاد آیا
وہ کوئی اور نہ تھا ہم ایک دوسرے سے ابھی ابھی تو چھڑے تھے

تمہارے بعد چمن پر جب ایک نظر ڈالی
کلی کلی میں خزاں کے چراغ جلتے تھے
تمام عمر ہم وفا کے پرستار ہو کر گناہ گار رہے
یہ اور بات کہ ہم آدمی تو اچھے تھے
شب خاموشی کو تنہائی نے زباں دے دی
پہاڑ گونجتے تھے جبکہ دشت سناتے تھے
وہ ایک بار مرے جن کو تھا حیات سے پیار
جو زندگی سے گریزاں تھے روز مرتے تھے
نئے خیال اب آتے ہیں دھل کے ذہن میں
ہمارے دل میں بھی لہلہاتے تھے
یہ ارتقا کا چلن ہے کہ ہر زمانے میں
پرانے لوگ نئے انسانوں سے ڈرتے تھے
جو بھی ملاقات تھی واجد ادھوری تھی
کہ ایک چہرے کے پیچھے ہزار چہرے تھے
پروفیسر واجد گینوی.....ملیر، کراچی

غزل

گنگناتے ہوئے آنچل کی ہوا دے مجھ کو
انگلیاں پھیر کے بالوں میں سلا دے مجھ کو
جس طرح فالو گلکان پڑے رہتے ہیں
اپنے گھر کے کسی کونے میں سجا دے مجھ کو
یاد گر کے مجھے تکلیف ہی ہوتی ہوگی
ایک قصہ ہوں پرانا سا بھلا دے مجھ کو
روٹھنا تیرا میری جان لے جاتا ہے
ایسے خفا نہ ہو ہنس کے دکھا دے مجھ کو
اور کچھ بھی نہیں مانگا میری جان تم سے
بس اپنا جیون سا بھی بنا لے مجھ کو

مجاہد ناز عباسی.....سجڑ پور

غزل

اندھیری شب کے دامن میں روشنی کیسی
دل اداس ہو تو پھر زندگی میں ہنسی کیسی

دے گیا وہ خوب ہمیں ترک الفت پہ سزا
ہمارے لیے اب زمانے میں پھر خوشی کیسی
تیری یادوں کے تصور میں کھلے ہیں پھول بھی
مہکتی ہوئی ہواؤں میں پھر یہ نغمہ کیسی
حسن بہاراں سے وہ بھی ہم کنار نہ ہوا
بجھی بجھی سی نگاہوں میں یہ بہاروں کی دلکشی کیسی
گلشن میں شاخ تمنا کی طرح ہیں جاوید
پھر میرے لیے یہ اداؤں کی تازگی کیسی
محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد

میرا دکھ

لحہ لچھ بکھر رہا ہوں

کوئی آئے

سمیٹ لے مجھ کو

دل زخمی ہے

روح زخمی ہے

زمانے کی ٹھوکروں میں ہوں

جیسے بدن میرا

لرز رہا ہے اندر میرا

میری چیخوں سے مگر

لوگ بہرے ہیں

کوئی سنتا ہی نہیں

جیسے اندھے ہیں

کوئی دیکھتا ہی نہیں

عبدالملک کیف.....صادق آباد
نظم

ضروری نہیں ہے

جو ساحل کی گیلی خشک ریت پر

ہاتھ میں ہاتھ دے کر

سفرِ تلاطم کے قصے سنائے

جزیروں ہو اوّل اور ان کے موسم

اور آنکھوں سے اوجھل کناروں پر بکھرے
منظروں ذائقوں اور رنگوں کی باتیں کرے
وہ ان وارداتوں سے گزرا بھی ہو
گر کہتا وہم ان پریشان موجوں کا چچھا کریں
جو تیرے پاؤں میرے پاؤں چومتی ہیں
تلاطم کی بے نام منزلوں سے گزریں
یہ دیکھیں ہوائیں کسے ڈھونڈتی ہیں
تو چنے سے پہلے ذرا سوچ لینا
ضروری نہیں جوان دیکھے رستوں کی خبر سنائے
وہ ان راستوں کا شناسا بھی ہو
کہیں یہ نہ ہو تم سمندر میں اس کو
ڈھونڈو تو وہ

ساحلوں پر کھڑا مسکراتا رہے

انتخاب: محمد ثقلین صابر لنگاہ.....خانپوال

غزل

خدا کی مرضی وہ میرے ہاتھوں پر بھر لکھے وصال لکھے
رضا جو اس کی ہے میں بھی خوش ہوں عروجِ بخشے زوال لکھے
سنو میرے دل کا آج سے بس جدا جدا ہیں ہمارے رستے
تمہارے دستوں پر چل کے ہم نے دکھ بڑھے ہیں ملال لکھے
جو مختن تھا بنایا اس نے ہے اتنا مشکل حیات پرچہ
کہ ہم سے میر تو قتل ہوں گے ہیں ایسے اس نے سوال لکھے
یہ میرے اشعار درحقیقت ہیں سب قصیدے تری ادا کے
جو غزل لکھی جو نظم لکھی بس اس میں تیرے جمال لکھے
میری اتنا ہے نہیں جھکوں گا کبھی بھی حاکم کے سامنے
ڈال دے مجھ کو خواہ قفس یا میرا منصب بحال لکھے
نہ تمازت میری ضرورت نہ چاہ مجھ کو سائے کی ہے
اتنا پرستوں کا ذکر جب ہو تاریخ میری مثال لکھے
آزاد سخن کی بات ہے غزل کا جیسے کہ شہنشاہ ہے
موتی جیسے ہوں اک لڑی میں وہ لفظ ایسے کمال لکھے
آزاد حسین آزاد.....رکن سٹی

ذوقِ آگہی

عنان احمد

تکبر کی مذمت

اپنے کو بڑا سمجھنا ذلت کا باعث ہے، کوئی عقل مند اس کو پسند نہیں کرتا۔ تکبر کرنا، کمینگی، بد بختی اور جہالت کی نشانی ہے۔ متکبر مزاج سر کے بل گرتا ہے انسانوں کی نظر میں ایسا شخص نہیں بھاتا جو بہت زیادہ اپنی بڑائی ظاہر کرے، جس کے سر میں غرور ہو ہر گز خیال نہ کرنا کہ وہ سچی بات سنے گا۔

آفتاب احمد..... کراچی

مصلحت

میرے ایک واقف کار نے مجھے یہ واقعہ سنایا ہے لیجیے آپ بھی اسی کی زبانی سنئے۔

میرے بھائی کا نام غلام حسین ہے۔ میرے بھائی صاحب زکوٰۃ باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں اور نماز بھی ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے ایک دفعہ وہ میرے پاس بہاول پور آئے چند روز میرے پاس رہے اور پھر واپسی کا قصد کیا۔ علی پور جانے کے لیے وہ بس اڈہ پر پہنچے۔ بس اڈے سے نکل کر مین روڈ پر آئی ہی تھی کہ اذان شروع ہو گئی۔ میرے بھائی صاحب مین روڈ پر کھڑے تھے اسی بس میں سوار ہونا تھا جب اذان کی آواز سنی تو ان کو ایک خیال آیا کہ وہ نماز ادا کر لیں۔

دوسرا خیال آیا کہ بس میں سوار ہو جائیں۔ ابھی وہ ذہنی کشاکش میں مبتلا تھے۔ شیطانی وسوسہ یہ تھا کہ میاں بس میں سوار ہو جاؤ۔ نماز پھر ادا کر لینا لیکن ضمیر نے گوارہ نہ کیا۔ میرے بھائی صاحب نے بس کو جانے دیا اور قریبی مسجد میں نماز ادا کرنے

دھاگے ٹوٹ بھی جاتے ہیں
شیشے سے بنتے ہیں سپنے
سینٹوٹ بھی جاتے ہیں
میلے کی گہما گہمی میں ہاتھ تو چھوٹ بھی جاتے ہیں
میں بس اتنا چاہتی ہوں کہ
ساتھ ہمارا جب بھی چھوٹے
رابطہ ہمارا جب بھی ٹوٹے
چاہے کہیں دور میں جاؤں
یاد ہمیشہ تم کو آؤں
مجھ کو یاد کرو گے ناں.....؟

صائبہ ساحل..... حجرہ شاہ مقیم
پردیس

پردیس نہ کوئی جائے

اپنا دیس پیارا ہے

یہاں اپنے سارے ہیں

ہر دکھ درد میں

شریک ہمارے ہیں

پردیس جانے والے

نہ جانے کن راہوں سے گزرتے ہیں

کھن راہیں، دشوار گزار راستے

جدائیاں، اپنوں کی

یادیں ڈھکی ہوں گی

اور یہی جدائیاں

بھی بھی!

ابدی جدائیاں بن جاتی ہیں

اتنے حسین چہرے

ہمیشہ کے لیے خاک میں مٹ جاتے ہیں

لہر پردیس کا دکھ نہ اپنانا

اپنا ملک چھوڑ نہ جانا

(زاہدہ رشید علوی، راولپنڈی)

غزل

کب کہا میں نے گلستاں دے دے
چند نکلیاں ہی باغباں دے دے
مرے جذبات کو سرخرو کر دے
مرے الفاظ کو زباں دے دے
ساری خوشیاں نصیب کر اس کو
آہ دے دے مجھے فغاں دے دے
تھک چکی ہوں میں اس مسافت سے
مجھ کو منزل کا اب نشاں دے دے
رنگ بھر دے حیات میں اس کی
مرے دامن کو یہ خزاں دے دے

رخسانہ ضیاء بھٹی..... سرگودھا

مجھ کو یاد کرو گے ناں!

تم کتنے اچھے لگتے ہو میرے سکھ دکھ بانٹتے ہو
تم کتنے اپنے لگتے ہو

اپنے دل کی ساری باتیں

میں تم سے کہہ دیتی ہوں

دنیا بھر کے سارے شکوے میں تم سے کر لیتی ہوں

لوگوں کی چپ چاپ سہہ کر

ان کے حصے کا آخری تم سے لڑ لیتی ہوں

پھر تم اپنی نرم نہی سے کہتے ہو کہ اب تو میں لو

تب تم کو معلوم نہیں تم کتنے پیارے لگتے ہو

دوست تمہارے جیسا کوئی قسمت والوں کو ملتا ہے

میری بھی قسمت اچھی ہے

میں نے تم کو پایا ہے

میری دعا میں ساتھ رہیں گی

دور کہیں جب جاؤ گے تم

یہ تو ہم تم جانتے ہیں کہ

ساتھ کوئی دیر تک کب رہا ہے

دھاگے کے ہیں بندھن سارے

چلے گئے۔ انہوں نے سوچا بس میں سوار تو بعد میں ہو سکتا ہوں نماز کا وقت نکل گیا تو نماز کی ادائیگی سے محروم ہو جاؤں گا۔ انہوں نے نماز ادا کی اور پھر دوسری بس میں علی پور جانے کے لیے سوار ہو گئے۔ اب وہ مطمئن تھے اور دل میں سوچ رہے تھے کہ دیر ہو جانے میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔ وہ جب ترنڈہ پہنچے تو انہوں نے اس بس کو وہاں دیکھا۔ جس کو انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔ قریب ہی بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان کی بس قریب ہی جارہی اور لوگوں کی زبانی پتا چلا کہ اس بس کو ڈاکو لوٹ کر فرار ہو گئے ہیں۔ میرے بھائی صاحب نے جب یہ خبر سنی تو اللہ پاک کا شکر ادا کیا کہ نماز کی برکت سے وہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹنے سے محفوظ رہے تھے۔ یہاں یہ پڑھ کر آپ کو حیرت ہوگی کہ غلام حسین کی جیب میں ستر ہزار روپے موجود تھے جو شادی کے لیے وہ اپنے بھائی سے لے کر علی پور جا رہا تھا۔ یوں نماز کی برکت سے 70 ہزار روپے بچ گئے۔ نماز کی برکت سے وہ ایک بڑے نقصان سے بچ گئے۔

بشیر احمد بھٹی..... بہاول پور

امام غزلی کے اقوال

☆ برے کاموں سے بچنے کے لیے صفائے دل ضروری ہے اور صفائے دل کے لیے باطنی تقویٰ ضروری ہے۔

☆ بلند آواز سے رونا بے صبری اور قہقہہ مار کر ہنسنا بے وقوفی ہے۔

☆ بد خلقی نجاست باطنی کی دلیل ہے۔

☆ جو کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہو اگرچہ بے شکل عبادت ہو گناہ ہے۔

☆ جس مجلس میں جا کر خلاف شرع امور

معلوم ہوں اور منع نہ کر سکتا ہو تو وہاں سے چلے آنا واجب ہے۔

☆ تو اگر اس قدر نماز پڑھے کے پشت خم ہو جائے اور اس قدر روزے رکھے کہ بدن ہلال بن جائے ان کا ہرگز ہرگز فائدہ نہ پہنچے گا تا وقتیکہ تو حرام مال سے پرہیز نہ کرے گا۔

☆ بد فطرت انسان سے بھلائی کرو تا کہ تم اس کے شر سے بچو۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی..... راولپنڈی

مسکراہٹیں

تین پھول

لڑکی لڑکی سے ”آپ جو چنبیلی کا پھول ہیں۔“

لڑکی لڑکی سے ”آپ بھی تو کم نہیں میری نظر میں آپ گلاب کا پھول ہیں۔“

لڑکی ”اف..... ادھر دیکھو میری ماما آ رہی ہیں۔“

لڑکا۔ ”یہ گلاب اور چنبیلی کے درمیان گو بھی کا پھول کہاں سے ٹپک پڑا۔“

بشیر احمد بھٹی..... بہاول پور

مقابلہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کرکٹ گراؤنڈ پر دوڑ کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ ایک آدمی نے دوسرے سے پوچھا۔

”ان میں سے انعام کس کو ملے گا؟“

دوسرے آدمی سے جواب۔

”سب سے آگے والے کو۔“

یہ بات سن کر انہوں نے کہا۔

”تو پھر پیچھے والے کیوں بھاگ رہے ہیں۔“

پروفیسر واجد گدگنیوی..... ملیر، کراچی

بارش

مالک نے نوکر سے کہا۔ ”کیوں بھی صنوم نے کل باغ کو پانی کیوں نہیں دیا؟“

نوکر۔ ”جناب کل تو بارش ہو رہی تھی۔“

مالک بولا۔ ”تو کیا ہوا چھتری لگا کر پانی دے دیتے۔“

ریاض بٹ..... حسن ابدال

ناشکی کی سزا کا عجیب قصہ

ایک فقیر نے ایک بد اخلاق مال دار کے پاس اپنی تنگی کی شکایت کی اور کچھ مدد چاہی۔ اس بے رحم نے نہ روپیہ دیا اور نہ پیسہ بلکہ غصہ سے اس کو جھڑک دیا۔ سوال کرنے والے کا دل زخمی ہوا اس نے کہا: اے دولت مند! غصہ کیوں کرتا ہے شاید سوال کرنے کی کجی سے نہیں ڈرتا ہے۔ نا عاقبت اندیش نے حکم دیا تو غلام نے ذلت سے جھڑک کر اس کو نکال دیا۔ میں نے سنا کہ پروردگار کا شکر نہ کرنے کے سبب سے اس کا زمانہ پلٹ گیا سختی نے اس کو بسن کی طرح ننگا کر دیا اس کے اسباب اور جانور سب برباد ہو گئے قضائے الہی نے اس پر فاقہ مسلط کیا اس کی ہتھیلی اور اس کا ہاتھ خالی ہو گیا۔

اس حال پر ایک زمانہ گزرا اس کا غلام ایک نیک خجی دل کے ہاتھ میں پہنچا جو غریب پریشان حال کو دیکھ کر ایسا خوش ہوتا جیسے فقیر مال سے خوش ہوتا ہے۔ رات کے وقت اس کے دروازے پر ایک شخص نے روٹی کا سوال کیا وہ چلنے سے معذور تھا۔ خجی آقا نے غلام کو حکم دیا کہ اس عاجز شخص کو خوش کر۔ غلام جب اس کے پاس کھانا لے کر گیا تو ایک دم رو پڑا۔ مالک کے پاس واپس آیا تو مالک نے آنسو دیکھ کر رونے کا سبب معلوم کیا؟ غلام نے کہا: اس بد نصیب بوڑھے کا

حال دیکھ کر دکھ ہوا میں پچھلے زمانہ میں اس کا غلام تھا یہ آدمی جائیداد اسباب اور روپیہ کا مالک تھا۔ اس کا زمانہ بدل گیا ہے آج بھیک مانگ کر روٹی کھاتا ہے۔ یہ سن کر وہ نیا مالک ہنسا اور کہا: لڑکے زمانہ کا کسی پر حکم نہیں ہے عزت ذلت یہ سب اپنے عمل کا نتیجہ ہے اس کا سر غرور سے آسمان پر تھا اس نے مجھ کو اپنے دروازے سے جھڑک کر ذلت سے نکال دیا تھا زمانہ نے آج اس کو میری جگہ پر بٹھادیا بہت سے بے سروسامان مفلس دولت مند ہو گئے اور بہت سے مال داروں کا کام خراب ہو گیا۔

فائدہ: زمانہ کی گردش سے ڈرنا چاہیے۔

محمد جاوید اقبال..... حیدرآباد

مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات

اے داتا! ہم تیرے رزق سے پلے ہیں تیری مہربانی اور انعام کے عادی ہو گئے ہیں۔ عزت اور ذلت تیرے ہاتھ میں ہیں۔ اے خدا! اپنی عزت کے طفیل ہمیں دنیا اور آخرت میں بھی عزت عطا فرما ہم پر بخش فرما۔ اے خدا! ہم نفس اپنے اور شیطان کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں، چوٹی چیتوں کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے اپنی ذات کے طفیل اپنے بے مثل اوصاف کے طفیل ان دشمنوں سے ہمیں پناہ عطا فرما۔

یا اللہ! یقین کے چراغ کو ہمارے راستہ میں رکھ دے بُرائی کرنے سے ہمارے ہاتھوں کو تھام لے نہ دیکھنے کی چیز سے ہماری آنکھیں پھیر دے ناپسندیدہ چیز پر ہمیں قابو نہ دے تیری مہربانی کے سورج کی ایک کرن بھی ہمارے لیے کرن ہے تیرے پاک بندوں کے طفیل ناپاکی سے ہمیں دور رکھ اگر کوئی لغزش ہو جائے تو معاف

فرمادے۔

اے خدا! ہم کام میں کوتاہی کرنے والے ہیں گناہ گار ہیں اور امیدوار بن کر آئے ہیں اگر غلام نادانی سے سرکشی کرتے ہیں تو مالک معاف کر دیتے ہیں نیک بختی کے چہرے سے ہماری آنکھیں بند نہ کر، موت کے وقت کلمہ سے ہماری زبان بند نہ کر۔

خدا یا بحق بنی فاطمہ کہ پر قول ایمان کم خاتمہ اگر دعوت رد کنی و قبول من دوست و دامان آل رسول

اے اللہ! یوسف نے یعقوب کی اولاد کو معاف کر دیا (علیہا الصلوٰۃ والسلام) گناہ کی وجہ سے ان کو قیدی نہیں بنایا، ان کی کھوئی ہوئی کو واپس نہیں لوٹایا، تیری مہربانی سے ہم بھی امید کرتے ہیں۔ اے عزیز! اس بے مائیگی کے باوجود ہم کو بخش دے۔

بضاعت نیا وردم الا امید خدا یا زعقوم مکن نا امید سوائے امید کے اور کوئی سامان نہیں لایا ہوں۔ اے خدا! مجھے اپنی بخشش سے نا امید نہ کرنا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و آلہ واصحابہ اجمعین و بارک وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً

محمد حذیفہ..... ناظم آباد، کراچی



سازشہ منا

راحیلہ تاج

اک نازک ادا سیم تن کا فسانہ قدرت نے اسے ایک معروف اندکارہ کا ہم شکل بنا دیا تھا۔ وقت نے اسے اس اندکارہ کی شہرت کیش کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ان لمحوں کی رو یاد، جب موت سامنے کھڑی مسکراتی ہے اور انسان اس سے بچنے کی ہر ممکن جدوجہد پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جنگ عظیم دوم میں یورپی اقوام نے کس طرح اپنے مفادات کی خاطر اپنے وطن کی آبرو کو فروخت کیا کس نے اپنی اپنی جان وطن پر وارد دی یہی اس ناول کا خاصہ ہے۔

نیویارک کے سب سے خوب صورت اور پر شکوہ ریستورنٹ ریکس میں لوگوں کا ہجوم تھا ہر طرف تیشے کے گلاسوں کی چھنک اور لوگوں کے باتیں کرنے کی دھیمی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس ریستورنٹ کے ایک کونے میں خوب صورت سیڑکی سہی سہی بیٹھی تھی اس کا خیال تھا کہ چند ہی لمحوں بعد جب ویٹر اس کے پاس بل لے کر آئے گا اور وہ بل کی رقم ادا نہ کر سکے گی تو اسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ وہ یہاں قصداً نہیں آئی تھی بلکہ بدحواسی میں یہاں آنے کی حماقت کر بیٹھی تھی۔ وہ نیویارک جیسے گہما گہمی والے شہر میں کئی ماہ بعد آئی تھی اور کچھ گھبراہٹ ہوئی تھی۔ وہ سمندری راستے سے سفر کر کے وہاں پہنچی تھی سفر کے دوران اس کی خوب صورتی اس کے سرخ بال اور پُرکشش سراپا دیکھ کر کئی مرد اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے لیکن اس نے ایک مسکراہٹ سے زیادہ آگے قدم نہیں بڑھایا تھا۔

ایسا ہی اتفاق اس کے ساتھ اب سے ایک گھنٹہ پہلے بھی ہوا تھا۔ وہ ایک سڑک پر جا رہی تھی کہ ایک لمبے قد کا آدمی اس کے سامنے رکھا پھر اس نے جھک کر اسے سلام کیا اور آگے بڑھ گیا۔ یہ اس کا نیویارک آنے کے بعد تیسرا موقع تھا کہ شناسائی کی جھلک آنکھوں

”میرا خیال ہے تم غلطی کر رہے ہو میں کسی مس بروک کو نہیں جانتی، میرا نام فرانس نارتھ ہے اور میرے پاس بل ادا کرنے کے لیے رقم نہیں، تم میری بات سمجھ رہے ہو؟“ فرانس نے کہا اور ویٹر پھر مسکراتے لگا۔ اسی وقت فرانس کو احساس ہوا کہ اس کے سامنے کی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے ایک آواز سنائی دی۔

”میں تمہیں دیکھ رہی ہوں مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم فرانس نارتھ ہو؟ اور فرین! تم وہی ہو نا جو کچھ عرصہ پہلے میرے ساتھ ڈرامہ اکیڈمی میں ہوئی تھیں؟“

اس آواز پر فرانس نے آہستہ سے اپنا سر موڑا۔ اس کے قریب کی سیٹ پر ایک لڑکی بیٹھی تھی اور اس کی طرف قدرے جھکی ہوئی تھی۔ اس کے بال بھی فرانس کی طرح ہی سرخ رنگ کے تھے اور آنکھیں گہری نیلی تھیں اور اس نے شرتی رنگ کی لمبی میکسی پینٹی ہوئی تھی اور اس کی طرف دوستانہ انداز سے دیکھ رہی تھی۔

”تو..... تو تم این بروک ہو؟“ فرانس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اوہ اتنے سال بعد اب پھر لوگ مجھ پر تمہارا دھوکا کھا رہے ہیں۔ ویٹر بھی مجھے مس بروک کہہ رہا تھا میں..... میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہاں تم بھی مل سکتی ہو..... این بروک.....“

”تانیہ بروک.....!“ اس کے سامنے بیٹھی لڑکی نے تصحیح کی۔

”یہاں لوگ مجھے تانیہ بروک کہتے ہیں۔ اب میں نے اپنے نام سے این کے الفاظ نکال دیے ہیں۔“ ”تم تانیہ بروک ہو؟“ فرانس نے پوچھا۔ ”ہاں میں نے تمہارا نام سنا ہے اس وقت میں سوچ بھی نہیں

سکتی تھی کہ وہ تم ہوگی تم نے بہت اچھا کام کیا تھا این!“ فرانس نے کہا وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے یہ نام ایک نائٹ کلب کے باہر لکھا دیکھا تھا اس کے علاوہ ایک اخبار میں اس نام سے متعلق یہ خبر بھی چھپی تھی کہ این بروک ہالی ووڈ جانا چاہتی ہے۔ وہ ایک اچھی اداکارہ تھی اور اپنی شہرت کے زمانے میں اپنا نام انیتا بروک استعمال کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے این کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ پانچ سال پہلے فرانس کے ساتھ ڈراما اکیڈمی میں ایک اسٹوڈنٹس تھی۔ یہ ڈراما اکیڈمی لندن میں تھی۔

”میں نے تمہیں ریستورنٹ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔“ فرانس کو تانیہ کی آواز سنائی دی۔ ”لیکن مجھے پوری طرح یقین تھا کہ یہ تم ہوگی۔ میں وہاں بیٹھی تھی۔“ تانیہ نے دور کونے میں ایک میز کی طرف اشارہ کیا جہاں دوسرا ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ ”میں تمہیں کافی دیر سے دیکھ رہی تھی۔ تم یہاں کس سلسلے میں آئی ہو؟“

”بس یونیو شاپ اس لیے کہ یہ جگہ سب سے اچھی ہے۔“ فرانس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ اس کا جواب سن کر بھی تانیہ اپنی جگہ واپس نہیں گئی تھی۔ اس نے زور سے انداز میں اپنا سگریٹ ایش ٹرے میں بچھا کر دوسرا سلگایا تھا۔

”تو اب بھی لوگ تم پر میرا دھوکا کھاتے ہیں۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”تم مصیبت میں ہو فرین ہے نا؟ کیا وہ کوئی بڑی مصیبت ہے؟“ اس نے نرم لہجے میں پوچھا لیکن اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا تھا۔ ”تم کیا کر رہی ہو؟ میرا مطلب ہے کس قسم کی ملازمت کرتی ہو؟“ ”کچھ نہیں۔“ فرانس نے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”میں دو ماہ پہلے فرینک لیچر کمپنی کے

کمانڈر ہے۔ اودہ..... اگر جنگ نہ ہوتی تو ہماری زندگی کسی کتاب میں لکھی گئی افسانوی زندگی سے بھی کہیں زیادہ رنگین ہوتی فرین۔

”تم نے جنگ کی باتیں کیوں چھیڑ دیں۔ مجھ سے جنگ کی باتیں مت کرو۔ میں برداشت نہیں کر سکتی۔ بس تم اپنے اور میرے بارے میں ہی باتیں کرو۔“

”میں بھی تم سے جو بات کرنے جاری ہوں کیا تم اس بارے میں میرا ساتھ دینے کا خطرہ مول لے سکتی ہو؟ تم میری جگہ لے لو اور چند ہفتے کے لیے یہ ظاہر کر دو کہ تم تانیا ہو۔“

”تم مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟“ فرانس نے پوچھا۔ ”مذاق نہیں؟ بالکل نہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ میں کام کی زیادتی کی وجہ سے اکتا گئی ہوں پھر یہاں لاکھوں لوگوں کے جھوم میں تم سے ملاقات ہو گئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ قدرت نے مجھے یہ موقع دیا ہے کہ میں تمہاری موجودگی سے فائدہ اٹھاؤں یا ایک لمحے کو مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ تمہاری یہاں موجودگی شاید میرے خلاف کوئی چال ہے۔“

”چال؟ میں تمہاری بات نہیں سمجھی؟“ فرانس نے حیرت سے کہا۔

”میرا مطلب ہے..... ارے میں مذاق کر رہی تھی۔ یہاں لوگ اکثر ایسے مذاق کرتے ہیں ویسے اگر تم میری مدد کرو تو میری زندگی بچ جائے گی میرا مطلب ہے کہ.....“ تانیا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ چند لمحے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئی۔

”مجھے بہر حال یہاں سے چلے جانا ہے میں پاگل ہو جاؤں گی۔ اگر میں یہاں سے نہیں گئی تو یہ میرے حق میں اچھا نہیں ہوگا؟“ تانیا نے زنجھٹے ہوئے کہا۔

”تمہاری قوت برداشت تو بالکل ہی جواب دے

کر متعارف کروا سکتی ہو۔ کسی کو تم پر شبہ بھی نہیں ہوگا۔ ہم دونوں جڑواں بہنوں کی طرح مشابہ ہیں۔“ تانیا نے کہا پھر وہ اچانک مڑی اور فرانس کو کاندھے سے پکڑ لیا۔ ”فرین! کیا صرف پندرہ دن کے لیے تم میری جگہ لے سکتی ہو؟ تم خود کو میری جگہ ثابت کرنا میں کچھ دن آزادی سے گزارنا چاہتی ہوں۔ میں اداکاری کرتے کرتے گھبرا گئی ہوں۔ اب سکون سے کچھ وقت گزارنا چاہتی ہوں۔ میری بات غور سے سنو فرین! میں پاگل نہیں ہوں میں اکتا گئی ہوں۔“ تانیا گھبرائی ہوئی آواز میں جلدی جلدی باتیں کر رہی تھی۔

”یہ سب جنگ کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں اس جنگ کو پسند نہیں کرتی جس میں جھوٹ بولے جاتے ہیں اور انسانوں کا خون بہتا ہے اور انسانوں کو مارنے کے لیے اسیسٹین بنائی جاتی ہیں۔ یہ جنگ یہاں بھی پہنچ سکتی ہے حالانکہ درمیان میں ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔ اس سے کوئی نہیں بھاگ سکتا ہر شخص اس کے بارے میں سوچتا ہے۔ کیا تمہارا بھی کوئی رشتہ دار اس جنگ میں گرفتار ہے۔“

”میرا کوئی رشتہ دار گرفتار نہیں ہوا ہے۔“

”کوئی چاہنے والا بھی نہیں؟“

”نہیں۔“

”خیر ایک نہ ایک دن ضرور ہوگا۔“ تانیا نے کہا۔

”کیا تمہارا کوئی چاہنے والا ہے؟“ فرانس نے

تانیا سے پوچھا۔

”چاہنے والا ہاں!“ تانیا نے فریم میں لگی ایک

تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تصویر ایک خوب صورت اور وجہ نہوجوان کی تھی

جس کی آنکھیں سیاہ تھیں اور چہرے پر دلاؤیز

مسکراہٹ قص کر رہی تھی۔

”یہ نام ہے..... نام کینٹین! برطانوی نیوی میں

وہ واپس فرانس کے پاس آ گئی اور اپنا کوٹ پہن کر اس کے ساتھ ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئی۔ باہر نکل کر تانیا نے ایک عینسی روکی اور اسے اپنے گھر کا پتہ بتاتے ہوئے عینسی میں بیٹھ گئی تھی۔ فرانس اس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ جلد ہی وہ ایک عمارت کے سامنے اتر گئیں۔ اس عمارت کی سولہویں منزل پر تانیا کافلیٹ خاصا وسیع اور پرا سائش تھا۔

”تم نے میرے ساتھ جوہر بانی کی ہے این! اس کے لیے میں تمہاری مشکور ہوں۔“

”کوئی بات نہیں۔ یہاں بہت ٹھنڈ ہے آؤ

میرے کمرے میں آ جاؤ۔ وہاں اطمینان سے بات

کر سکیں گے۔“ تانیا نے کہا۔

اپنے بیڈ روم میں جانے کے بعد بھی تانیا بیٹھی نہیں

وہ سفید قالین پر بے چینی سے ٹہل رہی تھی اور فرانس

سے باتیں کرتے ہوئے اس کی آواز کانپ جاتی تھی۔

”تم اپنی چیزیں اتار دو اپنا ہیٹ اپنا کوٹ میں

تمہیں اچھی طرح دیکھنا چاہتی ہوں کہ کیا واقعی تم اب

بھی میری طرح لگتی ہو۔ ہم ایک دوسرے سے مشابہ

ہیں؟ تمہیں وہ وقت یاد ہے جب لوگ ہمیں دیکھ کر

دھوکا کھا جاتے تھے۔“

”ہاں۔“

”آؤ ادھر آؤ اور میرے قریب کھڑی ہو فرین!“

تانیا نے کہا اور اسے اپنے ساتھ لیے ایک قد آدم

آینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ دونوں کی جلد سفید

پھولوں کی طرح نرم اور چمک دار تھی لیکن ان کے منہ

کے دہانے دانت قد اور دونوں کے بال بھی ایک جیسے

تھے۔ بس لباس کی یکسانیت کی ضرورت تھی ورنہ ان

میں کوئی فرق نہیں تھا۔

”اگر تم اپنے بال میری طرح بناؤ تو تم ہر اس جگہ

جاسکتی ہو جہاں میری آمد متوقع ہو اور خود کو میرا نام لے

ساتھ یہاں آئی تھی۔ وہ یہاں لیکچر بنانا چاہتے تھے کیونکہ ہمارے وطن پر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے جس روز ہم نے وہاں سے اپنے بحری سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس روز ہی جنگ شروع ہو گئی پھر یہاں آنے کے بعد دو ہفتے ہی میں لیکچر کمپنی ناکام ہو گئی اور اس کی ایک وجہ جنگ بھی تھی۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں یہیں رہوں گی اور انگلینڈ واپس جانے کے لیے رقم جمع کروں گی۔ میں اپنے ملک واپس جانا چاہتی ہوں تاکہ جنگ میں کسی طور اپنے ملک کی خدمت کر سکوں یہاں رہ کر وہاں کی جنگ کے بارے میں سننا مجھے عجیب سا لگتا ہے لیکن اب یہ بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پولیس مجھے گرفتار کرنے آنے والی ہوگی۔ میں نے ویٹر کو بتا دیا تھا کہ میرے پاس اس کا بل ادا کرنے کے لیے رقم نہیں ہے۔“ فرانس نے کہا اور تانیا نے گردن گھما کر ہیڈ ویٹر کی طرف دیکھا۔ جوان کی طرف ہی متوجہ تھا۔

”میڈم؟“ اس نے جھک کر کہا۔ اس نے

فرانس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

”ایک غلط فہمی ہو گئی ہے یہ میری بہن ہے یہ رقم

لیے بغیر ہی یہاں آ گئی تھی۔ تم اس کا بل میرے

حساب میں لگا دینا۔“

”جی بہتر۔“ ویٹر نے کہا اور واپس چلا گیا۔ تانیا

پھر فرانس کی طرف مڑ گئی تھی۔

”اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے تم سے

کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں ایک منٹ.....“

تانیا نے کہا اور فرانس کے پاس سے اٹھ کر اس

میز کی طرف چلی گئی جہاں وہ پہلے دو مردوں اور ایک

لڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی پھر اس نے ان لوگوں سے کوئی

بات کی۔ اس کی بات پر ایک مرد نے کچھ کہا اور تانیا

نے بے پروائی سے کاندھے اچکائے۔ ایک منٹ بعد

چکی ہے تانیا! تمہیں کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے اور اس کے بعد کسی پرسکون جگہ پر جا کر آرام کرنا چاہیے۔“ فرانس نے کہا۔

”ایسا میں چاہتی ہوں لیکن میں ایسا نہیں سکتی۔ تم نے بھی دیکھا ہوگا کہ اب میرا نام شہر کی مشہور جگہوں پر لکھا جا چکا ہے اب میں اس کام سے بچھا بھی نہیں چھڑا سکتی لیکن میں اب بہت کام کر چکی ہوں اور کچھ عرصے آرام کرنا چاہتی ہوں..... تم تو نیویارک کو اچھی طرح جانتی ہو فرین! یہاں لوگوں کی زندگیاں جیسے نئی ہیں اس طرح گزرتی جاتی ہیں اور اب لوگوں میں ایک سرگوشی تیزی سے گون رہی ہے کہ تانیا اب اچھی اداکارہ نہیں رہی۔ تم تو جانتی ہو کہ کسی کے متعلق افواہیں کتنی تیزی سے پھیلتی ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر میں کچھ عرصہ کے لیے اپنی شخصیت اور اپنے نام سے بچھا چھڑا کر پرسکون زندگی بسر کروں تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”لیکن میں یہ سب نہیں کر سکتی۔ یہ تمہاری مہارت ہے جس نے تمہیں اس مقام تک پہنچایا ہے میں تو صرف جسمانی طور پر تم سے مشابہہ ہوں۔ میں تمہاری طرح نہ گانا گاسکتی ہوں اور نہ ناچ سکتی ہوں میں تو ایک سادہ سی اداکارہ ہی بن سکتی ہوں۔“

”میری مہارت..... تم اس کی پروا مت کرو۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ تم میرے پیشے کو بھی اپناؤ میں کچھ لوگوں کے ساتھ پندرہ دن کے لیے میری ساؤنڈ جاری ہوں جہاں میں قیام کروں گی اگر میں وہاں گئی تو میں اس پارٹی کے ہنگاموں سے پاگل ہو جاؤں گی۔ میں چاہتی ہوں وہاں تم میری جگہ جاؤ وہ پارٹی ایک باؤس پارٹی ہوگی اور بس۔“ تانیا نے وضاحت کی۔

”یہ پارٹی کون دے رہا ہے؟“ اچانک فرانس نے پوچھا۔

”تم نے روئے کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ روئے ہالینڈ کا!“ تانیا نے پوچھا۔

”ہاں میں نے سنا ہے وہ نیویارک کے امیر ترین لوگوں میں سے ایک ہے۔“ فرانس نے جواب دیا۔

”اور تم وہاں بہت اچھا وقت گزارو گی۔“ تانیا نے کہا۔

”کسی کو تم پر شبہ بھی نہیں ہوگا۔ اگر وہاں کوئی تم سے میرے کردار کی نقل کرنے کے لیے کہے تو تم انکار کر سکتی ہو۔ وہ سب میری عادت سے واقف ہیں میں اپنی مرضی سے کام کرتی ہوں۔“

”تو پھر تم خود ہی وہاں کیوں نہیں چلی جاتیں؟ تم اپنی مرضی سے اپنا وقت گزارنا اور صرف آرام کرتی رہنا۔“ فرانس نے کہا۔

”اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پارٹی میں شرکت کے وقت مجھے تازہ دم اور ہشاش بشاش ہونا چاہیے جب کہ میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ تم وہاں جانے کے لیے بالکل ٹھیک ہو تم میری جگہ وہاں جا سکتی ہو۔ لوگ یہی سمجھیں گے کہ میں تازہ دم ہو کر ان کے درمیان موجود ہوں پھر روئے مجھے بہت کم جانتا ہے اس نے میری ایک پکچر دیکھی تھی اور مجھ سے ملنے کے لیے بے چین ہو گیا۔ آخر کار وہ مجھ سے متعارف بھی ہو گیا۔ وہ تین یا چار بار مجھ سے مل سکا ہے اور کبھی تنہائی میں نہیں ملا۔ آج رات بھی تم نے دیکھا کہ لوگوں نے تم میں اور مجھ میں تمیز نہیں کی حالانکہ تمہارے بالوں کا اسٹائل بھی مجھ سے مختلف تھا۔“ تانیا نے کہا۔

فرانس آنکھیں بند کیے اس کی باتیں سن رہی تھی اور تصور کر رہی تھی کہ اس کی فاقہ زدہ زندگی کے دو ہفتے عیش و آرام سے گزر سکتے تھے۔

”جب پندرہ دن گزر جائیں گے تو میں تمہارے اس کام کا تمہیں معقول معاوضہ بھی دوں گی اور تمہیں واپس انگلینڈ جانے کے لیے رقم بھی ملے گی۔ میرے

لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے میں یہ کر سکتی ہوں۔“ تانیا نے کہا اور فرانس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

”ٹھیک ہے میرا اس میں کوئی نقصان نہیں خطرہ تمہارے ہی لیے ہے اگر میں کوئی غلطی کر بیٹھی تو لوگوں کو حقیقت کا پتا چل جائے گا۔ میں اس کام کے لیے تیار ہوں۔“ فرانس نے کہا اور اس کی رضامندی سے تانیا کے چہرے پر خوشی سے چمک آ گئی۔

”بہت خوب مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ اس نے خوش ہو کر کہا پھر اس نے ہی فرانس کی روانگی کا انتظام کیا تھا اور اسے اپنے بارے میں خاصی معلومات بھی فراہم کی تھیں۔

روئے ہالینڈ کے جزیرے میری ساؤنڈ پہنچنے کے بعد دس دن تک فرانس کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی اور اس کے لیے سب کچھ اپنی توقع سے بھی زیادہ آسان رہا تھا۔ اس باؤس پارٹی میں شریک ہیں افراد میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس کو اس پر شبہ ہوا ہو کہ وہ تانیا نہیں ہے۔

وہ اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے بیٹھی اپنا میک اپ درست کر رہی تھی پھر اس نے برش سے اپنے بال سلجھانا شروع کر دیے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب اس کے پاس صرف چار دن اور باقی رہ گئے ہیں جس کے بعد اس کا کام مکمل ہو جانا تھا۔ اسے امید تھی کہ تانیا آرام کر رہی ہوگی وہ دس روز پہلے جب اس کے پاس سے روانہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے اس کے متعلق اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ وہ یہاں تانیا کی کار میں اس کے سوٹ کیسوں اور اس کے نام کے ساتھ آئی تھی۔

اسے دکھ تھا تو صرف ایک بات کا کہ روئے ہالینڈ نے یہاں پر اس کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارا تھا اور اس کے رویے سے یہ ظاہر تھا کہ اسے تانیا سے کسی

اور بات کی توقع تھی جو پوری نہیں ہوئی ہے اس کے علاوہ یہاں ایک اور آدمی بھی تھا روئے ہالینڈ کا مہمان چارلس دوس۔ فرانس نے اس کے بارے میں سوچتے ہوئے برش ایک طرف رکھ دیا۔ اب وہ آئینے میں بغور اپنا جائزہ لے رہی تھی۔

چارلس کا خیال آتے ہی فرانس کے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل سے کھڑی ہو گئی تھی اور اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور چارلس کمرے میں داخل ہوا۔ سیاہ رنگ کے سوٹ میں اس کا کھلتا ہوا گلابی رنگ اور لمبا قد بہت دلکش لگ رہا تھا اچانک ہی ایک خیال فرانس کے دل میں آیا اور اس نے بغیر سوچے سمجھے چارلس سے ایک سوال کر دیا۔

”چارلس! کیا تم فوج میں رہے ہو؟“

”میں! بالکل نہیں۔“ چارلس نے حیرت سے کہا۔

”نہ جانے کیوں تمہیں دیکھ کر کسی فوجی کا تصور ذہن میں آ جاتا ہے۔“ فرانس نے ہنستے ہوئے کہا۔

چارلس اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

”تانیا! تم بہت اچھی ہو..... خوب صورت ہو! وہ پلیز.....“ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

فرانس اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”تمہاری آنکھیں نیلی نیلی بلکہ نیلا ہٹ مائل شرتی ہیں۔“

”اوہ چارلس! میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے کیونکہ ملازمہ کمرے میں آئی ہی ہوگی۔ اسے یہاں کی صفائی کرنا ہے۔“

”میں تمہیں یہ کہنے آیا تھا کہ ذرا جلدی تیار ہو جاؤ۔“ چارلس نے اس کا ہاتھ تھام کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اور مجھ سے شادی کرلو۔“ چارلس آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا اور فرانس کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے کانوں میں جلتے رنگ بج رہے ہوں۔

”ہاں چارلس ہاں!“ اس نے مدہوشی کے عالم میں سرگوشی کی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے دنیا جہاں کی خوشیاں مل گئی ہوں لیکن یہ لہجہ اسے خواب جیسے محسوس ہو رہے تھے، جن کی کوئی حقیقت نہ ہو کچھ دیر بعد وہ چارلس سے باتیں کرتے کرتے اس کے کندھے سے ٹک گئی اور اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک اجنبی کمرے میں تھی۔ اس کے کانوں میں میری ساؤنڈ کے ساحل پر سرچختی لہروں کی آوازیں کی بجائے ٹریفک کے شور کی آوازیں آرہی تھیں وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہ نیویارک کے پارک ایونیو کے علاقے میں ایک تیرہ منزلہ عمارت میں تھی۔ وہ کھڑکی کے قریب سے ہٹ گئی اور پھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ وہ ایک راہداری تھی جس کے دونوں اطراف سفید رنگ کے دروازے تھے پھر وہ ایک دروازے کے قریب رک گئی۔ اندر سے چارلس کے الفاظ صاف سنائی دے رہے تھے۔

”یہیں جنرل نشہ آور دوانے فوراً ہی اپنا کام دکھایا تھا پھر وہ خود بھی خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔ میں نے بہت آسانی سے نشہ آور دوا شراب میں ملا کر اسے دے دی تھی جس کے بعد وہی ہوا جو تم نے کہا تھا اس کی قوت ارادی ختم ہوگئی پھر ہماری شادی قانونی طور پر انجام پائی۔“

”نچو لن نے یہ فرض انجام دیا۔“
”بہت خوب!“ فرانس کو دوسری آواز سنائی دی۔ ”تم نے بہت اچھا کارنامہ انجام دیا ہے۔ لیٹیننٹ دوس تمہاری قربانی رانگاں نہیں جائے گی

چارلس نے اس کو خیالات سے چونکا دیا۔
”تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ اس نے ایک بار پھر اس کی تعریف کی اور فرانس ہنس پڑی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ خوشی کے ان چند لمحات کو مستقبل کے اندھیروں پر قربان نہیں ہونے دے گی اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کرے گی کہ اس کی آئندہ زندگی کس طرح گزرے گی۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں تانیا!“ فرانس کے کانوں میں جاوہرے الفاظ گونجے اور وہ چارلس کو حیرت سے دیکھنے لگی۔ جو اسے دیکھتے ہوئے ٹکسکر رہا تھا۔ رخصت ہو چکا تھا اور لوگ اپنی اپنی نشستوں کی طرف جا رہے تھے۔ چارلس فرانس کو ساتھ لیے ہوئے گولڈن گالف سے باہر آ گیا اور اسے اپنی کار میں بٹھا کر خود بھی اس کے قریب آ بیٹھا تھا۔

”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ فرانس نے پوچھا۔

”کیا اس سے کچھ فرق پڑتا ہے؟“ چارلس نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔ ”تانیا! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہارے بغیر ایک پلی بھی نہیں رہ سکتا۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی..... ابھی..... اسی وقت؟“

چارلس نے بے چینی سے کہا۔
”کیا؟“ فرانس نے حیرت سے پوچھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی خواہش اتنی جلدی اور اچانک پوری ہو جائے گی۔

”تانیا! ہم لوگ اس وقت امریکہ میں ہیں چنانچہ اگر چاہیں تو آج رات ہی شادی کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں پوسٹ روڈ تک جانا ہوگا۔ وہاں ایک نج ہے اور وہ آج رات ہماری شادی کروا سکتا ہے۔ تانیا! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم میری بات مان لو

”در اصل ہارٹ سائنس نے روڈ کے ساتھ ایک مکان خریدا ہے اور وہ آج ادھر جانا ہوتا ہے میرا خیال ہے روئے بھی ساتھ جائے گا کیا تم بھی چلو گی؟“

”ہاں! کیوں نہیں؟“ فرانس نے کہا پھر رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ ان لوگوں کے ساتھ روڈ ہاؤس تک گئی۔ راستے میں وہ چارلس کے ساتھ اس کی کار میں بیٹھی تھی۔ فرانس کے اندازے کے مطابق چارلس کی عمر چوبیس یا پچیس برس کے لگ بھگ ہوگی لیکن وہ خود کو اس سے زیادہ بڑا ظاہر کرتا تھا۔

”میں شرط لگا سکتا ہوں کہ جب ہم لوگ گولڈن گالف روڈ ہاؤس پہنچیں گے تو پارٹی کے آدھے لوگ یہی کہیں گے کہ انہیں یوں لگتا ہے کہ وہ پہلے بھی یہاں آ چکے ہیں وہ وہاں رکنا نہیں چاہیں گے۔“ چارلس نے کہا اور پھر تانیا کو دیکھنے لگا۔

”تانیا! کیا روئے کی اس ہاؤس پارٹی میں تمہارا اچھا وقت گزرا؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں! بہت ہی اچھا۔“ فرانس نے جواب دیا پھر وہ لوگ گولڈن گالف پہنچ گئے تھے اور چارلس کے خیال کے برعکس سب کو وہ جگہ پسند آئی۔ وہ جگہ ان سب کے لیے نئی تھی یہاں پہلے سے لوگوں کا ایک جھوم تھا اور وہ سارے امیر و بکیر لوگ تھے۔

فرانس اب بھی اسی سوچ میں گم تھی کہ اس کے واپس جانے میں صرف چار دن رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد اس کی زندگی میں صرف چارلس کی یادیں ہوں گی اور بس وہ یہ بھی کر سکتی تھی کہ وہیں رکی رہے اور چارلس کے ساتھ اپنی زندگی گزار دے لیکن تانیا سے کہا ہوا وعدہ اس کی راہ میں حائل تھا۔

”دیکھو! سب لوگ رخصت کر رہے ہیں اور تم یہاں بُت بنی بیٹھی ہو۔ آؤ ہم بھی ان بہترین اشارز اور مشہور لوگوں کے جھرمٹ میں شامل ہو جائیں۔“

ہدایت اور اصلاح کا روشن چراغ
ملک کا منفرد دینی و اصلاحی رسالہ

الاسلام

تازہ شماره شائع ہو گیا ہے

ممتاز مفکر و دانشور مشتاق احمد قریشی کی زیر ادارت

قیمت: 20 روپے

دینی مسائل کا حل: مولانا سعید احمد جلال پوری
روحانی مسائل: حافظ شبیر احمد

اسلام اخوت بھائی چارے اور تہذیب شناسی کا مذہب ہے۔
اپنے دین کو جاننا اور سمجھنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔
اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، ہمیں اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔
اس پر عمل کر کے ہی ہم آخرت میں سرفروغ حاصل کر سکتے ہیں۔
قارئین کی مشکلات کو مد نظر رکھتے ہوئے الاسلام میں کچھ نئے سلسلے شروع کیے ہیں جن سے عام لوگوں کو دینی مسائل سمجھنے میں آسانی ہو سکے گی۔

دنیا کے تمام مسالک متعلق
علماء کا اعلیٰ نگارشات اور آراء پر مشتمل

ادب و صحب گچھ گچھ

پتا: کمرہ نمبر 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی
فون: 35260771/2 ٹیکس: 35260773
alislamkhi@gmail.com

اور خدا تمہیں اپنے ملک کے لیے دی جانے والی اس قربانی کا صلہ ضرور دے گا۔ وہ لڑکی اب ہمارے لیے محفوظ ہے وہ اپنی شہرت کھو چکی ہے اور اب ایک نازی کی بیوی ہونے کے ناتے ایک جرمن شہری ہے۔“

”میں نے کوئی قربانی نہیں دی جنرل! وہ خوب صورت ہی اتنی ہے۔“ چارلس نے جواب دیا۔

”ہاں میں جانتا ہوں۔“ جنرل کی آواز فرانس کے کانوں سے نگرانی اور اس نے تیزی سے دروازہ کھول دیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے چارلس موڈبانہ انداز میں کھڑا تھا اور سامنے جنرل بیٹھا تھا جو فرانس پر نظر پڑتی ہی کھڑا ہو گیا تھا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور اس کی نظریں سر سے پیر تک اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ چارلس نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ پہلے جیسے انداز میں ہی کھڑا تھا۔

”اوہ مس تانیا بروک! ہم لوگ دوبارہ مل گئے۔ ویسے اب مجھے تم سے فراؤدوس کی حیثیت سے بات کرنا چاہیے۔“ جنرل نے کہا۔

”کیا مطلب! تم کون ہو؟ آخر یہ سب کیا ہے؟“ فرانس نے پوچھا۔

”تانیا! پاگل مت بنو۔ میں جنرل دون ہوں اور یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو۔ تم اس بات سے منکر کیوں ہو رہی ہو کہ تم ایک جرمن شہری اور ایک نازی کی بیوی ہو۔“

”یہ صحیح نہیں ہے۔“ فرانس نے چیخ کر کہا۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں نے تمہاری باتیں سن لی ہیں۔ میں نے یہ بھی سن لیا ہے کہ چارلس کی نشاآوردوا کی بات کر رہا تھا۔ چارلس..... چارلس.....! وہ بے ساختہ چارلس کی طرف مڑی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا سینہ سینے لگی۔

”مجھے بتاؤ کل رات کیا ہوا تھا؟ میں نے تم سے شادی نہیں کی۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ یاد نہیں ہے کیا تم نے مجھے نشاآوردوا کوئی چیز پلائی تھی؟“

”ہاں! اس نے تمہیں بے ہوش کیا تاکہ اس ملک سے نکال کر جرمنی لے جائے اور وہاں تمہاری نگرانی کی جاسکے۔“ جنرل نے کہا اور فرانس اسے حیرت سے دیکھنے لگی پھر وہ چارلس کی طرف مڑی۔ وہ لٹھی میں اپنے سر کو حرکت دے رہی تھی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”کیا یہ سب سچ ہے؟“ اس نے سرگوشی کی۔ ”تم امریکن نہیں ہو تم چارلس دوس نہیں ہو؟“

”یہ کارل دوس ہے۔“ جنرل نے جواب دیا۔

”اور بلیک گارڈ میں لیفٹیننٹ ہے اسے نازی حکومت کے لیے ایک خاص کام کے سلسلے میں کچھ دن کی چھٹی دے کر یہاں بھیجا گیا تھا اور آج ہم لوگ جرمنی جا رہے ہیں۔“

”چارلس کیا یہ صحیح ہے؟ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ کیا وہ درست ہے؟“ فرانس نے چارلس کے قریب جاتے ہوئے کہا لیکن چارلس نے اس کی طرف نہیں دیکھا اس کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔

”یہ درست ہے اور اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“ کچھ دیر بعد چارلس نے جواب دیا اور فرانس اس کے قریب سے ہٹ گئی تھی۔ اس نے جنرل کی طرف دیکھا جس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ وہ ایک آہ بھرتی ہوئی کمرے سے نکل کر اسی کمرے میں آ گئی جہاں اس کی آنکھ لٹی تھی۔ اس نے کمرے میں جا کر دروازہ بند کیا اس نے جو کچھ سنا تھا اس پر یقین نہیں آ رہا تھا اور اس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اس نے چارلس دوس کو ایک خوب صورت امریکی نوجوان سمجھا لیکن وہ ایک نازی تھا۔ اس کے ملک کا ایک دشمن اور اس نے اسے دھوکا دے کر اس سے شادی کی تھی۔

جب وہ جنرل اور چارلس سے باتیں کر رہی تھی تو وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ اسے تانیا بروک سمجھ کر اس سے باتیں کر رہے تھے لیکن وہ تانیا نہیں تھی بلکہ اس کا کردار ادا کر رہی تھی۔ وہ فرانس نارتھ تھی اور چارلس سے محبت کرتی تھی لیکن اب اسے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔

”مجھے پولیس کی مدد لینا چاہیے اور انہیں ساری بات بتانا ہوگی پھر وہ لوگ تانیا کو ڈھونڈ نکالیں گے۔“

اس خیال کے ساتھ ہی وہ تیزی سے اٹھی اس نے اپنا پرس سنبھالا اور آئینے پر الواداعی نگاہ ڈالی اس کے سامنے تانیا کھڑی تھی۔ تانیا کے انداز میں اس کے لباس میں اور اس کے ہیئر اسٹائل میں اس نے جو کچھ پہن رکھا تھا وہ تانیا کا تھا۔ وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی پھر اس نے باہر جانے کے لیے دروازہ کھولنا چاہا لیکن وہ لاک تھا خوف سے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ جانتی تھی اگر چارلس اور جنرل چاہیں تو اس سے ملنے اندر آ سکتے ہیں لیکن وہ باہر نہیں جاسکتی تھی۔ اچانک اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر وہ انہیں یہ بتادے کہ وہ تانیا نہیں بلکہ کوئی اور ہے جو اس کی جگہ پارٹی میں شرکت کرنے آ گئی تھی تو شاید اس کی جان چھوٹ سکتی ہے پھر اس نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا۔

اسے باہر سے باتیں کرنے کی دھیمی دھیمی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن وہ الفاظ نہیں سمجھ سکتی تھی۔ وہ دروازے کے قریب سے ہٹ گئی اس کمرے میں ایک ہی دروازہ تھا جو لاک تھا لیکن کھڑکیاں بالکنی میں تھیں اور بالکنی دوسرے فلیٹ سے لٹی تھی۔

وہ تیزی سے بالکنی میں گئی اور ساتھ والے حصے میں کود گئی اس حصے کی کھڑکیاں بھی کھلی ہوئی تھیں پھر وہ کمرے سے نکل کر ایک لاؤنج میں آ گئی اسے وہاں بھی چارلس کی آواز سنائی دے رہی تھی اور اس نے

اندازہ لگایا تھا کہ وہ حصہ بھی اس گھر کا ہی تھا۔ وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی آگے بڑھی تھی اور اسے جنرل کی آواز سنائی دی تھی۔

”اسے کسی طرح بھی یہاں سے نکلنے نہ دیا جائے دوس! اور آج رات ہی یہاں سے روانگی کے لیے تیار رہنا۔ آج رات سب معاملات تیار ہوں گے تب تک تم اپنی بیوی پر کڑی نظر رکھو گے۔“ اتنا سنتے ہی فرانس نے دوڑنا شروع کر دیا تھا لیکن وہ قدموں کی آہٹ پیدا نہیں ہونے دے رہی تھی۔ وہ اسی طرح دوڑتی ہوئی سیڑھیاں اترتی نیچے تیسری منزل تک آ گئی تھی اور وہاں سے گراؤنڈ فلور تک جانے کے لیے اس نے لفٹ کا سہارا لیا تھا جو اس کے سامنے ہی رکی تھی۔

”مس بروک! آپ بہت جلدی میں نظر آ رہی ہیں۔“ لفٹ بوائے نے اس سے پوچھا تھا اور اس نے اثبات میں جواب دیا تھا پھر اس لفٹ بوائے ہی نے اسے ٹیکسی میں سوار کرایا اور اس کے سامنے ہی فرانس نے ٹیکسی ڈرائیور کو پولیس اسٹیشن چلنے کے لیے کہا تھا اور جیسے ہی ٹیکسی روانہ ہوئی جنرل بھی دوسری لفٹ سے باہر آیا اور اس نے ٹیکسی میں کسی عورت کو بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا پھر اس نے لفٹ بوائے سے اس بارے میں پوچھا تھا۔

”سر وہ تانیا بروک تھی اس کی تصویر میرے کمرے میں بھی لگی ہے۔“ لفٹ بوائے نے کہا۔

”وہ کہاں لگی ہے؟“ جنرل نے تیزی سے پوچھا۔

”سینٹرل پولیس اسٹیشن۔ سر! کیا کچھ بڑبڑ ہے؟“ لفٹ بوائے نے پوچھا۔

”نہیں..... شکریہ!“ جنرل نے جواب دیا اور پھر لفٹ میں سوار ہو گیا۔

”مجھے مسٹر دوس کے سوٹ تک لے چلو۔“ اس نے لفٹ بوائے سے کہا۔

فرانس نے پولیس اسٹیشن پہنچنے کے بعد ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا تھا اور دوڑتی ہوئی بلڈنگ میں داخل ہو گئی تھی پھر اس نے جیسے ہی پولیس آفیسر کے کمرے میں قدم رکھا۔ اس نے مسکرا کر فرانس کی طرف دیکھا تھا۔

”گڈ مارنگ مس بروک! آپ کی فلم دیکھنا اور آپ کو حقیقت میں یوں دیکھنا بڑا عجیب سا لگتا ہے۔“ پولیس آفیسر نے حیرت سے کہا۔

”میں تانیا بروک نہیں ہوں۔“ فرانس نے کہا۔

”میں تو اس لیے یہاں آئی ہوں کہ مجھے تمہاری مدد درکار ہے میں بہت مشکل میں ہوں اور اس کی وجہ جنگ ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ آفیسر نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

”میرا نام تانیا بروک نہیں ہے؟“ فرانس نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”مجھے فرانس نارتھ کہتے ہیں۔ میں انگریز ہوں اور میں جنگ شروع ہونے سے ایک ہفتہ پہلے نیویارک آئی ہوں.....“ فرانس بات کرتے کرتے اچانک رک گئی۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ جنرل اس کے پیچھے ضرور آئے گا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔

”کیپٹن! جب تک میں آپ سے بات کروں مہربانی کر کے کسی کو اندر مت آنے دیجیے گا۔“ فرانس نے کہا۔ ”دو افراد میرے پیچھے ہیں وہ دونوں نازی ہیں یعنی جرمن ایجنٹ..... وہ مجھے روکنے کی کوشش کریں گے۔“

”تم یہاں بیٹھ جاؤ اور مجھے تفصیل سے بتاؤ یہاں کوئی نہیں آ سکتا خود ٹلر بھی نہیں..... ہاں تو تم تانیا بروک نہیں ہو؟“

”نہیں!“ فرانس نے کہا۔ ”تانیا بروک میری دوست ہے۔“ فرانس نے کہا۔ ”سالوں پہلے ہم دونوں کی ملاقات لندن میں ہوئی پھر کافی عرصے تک ہماری ملاقات نہ ہو سکی پھر تقریباً پندرہ دن پہلے میری اس سے پھر ملاقات ہوئی۔ اس نے ایک مشکل سے مجھے نجات دلائی اور اس کے بدلے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کی جگہ لے لوں اور خود کو تانیا بروک ظاہر کروں۔“ فرانس بات کرتے ہوئے مسلسل نیچے دیکھ رہی تھی اور اس کی کوشش تھی کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی یاد کر کے کیپٹن کو بتا دے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اس نے اوپر دیکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں میرا ایک ایک لفظ سچ ہے۔“ اس نے کیپٹن کے چہرے پر بے یقینی کے تاثر دیکھ کر کہا۔

”میں سن رہا ہوں..... تم نے کہا کہ تم نے چارلس دوس سے شادی کی اور یہ کل رات کی بات ہے لیکن تمہیں اس کے متعلق کوئی بات یاد نہیں بس آج صبح جب تمہاری آنکھ کھلی تب کی باتیں تمہیں یاد ہیں آخر تم سیدھی تانیا بروک کے پاس کیوں نہیں چلی گئیں؟“

”میرا خیال تھا کہ مجھے پولیس کو بتانا چاہیے نہیں میرا یقین نہیں ہے تو ایسا کرو کہ تانیا بروک کے پاس کسی کو بھیج دو وہ تمہیں مل جائے گی اور وہاں میرا لباس اور دوسری چیزیں بھی تمہیں ملیں گی جب تک تم اس تک پہنچو میں یہاں انتظار کروں گی۔“

”یہ بھی کر لیں گے۔“ پولیس کیپٹن نے کہا اور اسی وقت دروازے پر تیز دستک ہوئی دروازہ کھل گیا اور ایک پولیس آفیسر نے اندر جھانکا تھا۔

”ایک شخص آیا ہے جو خود کو مسٹر دوس ظاہر کر رہا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اس کی بیوی.....؟“

”تانیا!“ آفیسر کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی چارلس نے اسے ایک طرف ہٹایا اور خود کمرے میں داخل ہو گیا۔

”تانیا! مجھے پتا چلا ہے کہ تم یہاں آئی ہو۔ بھلا اس کی کیا ضرورت تھی؟“ اس نے فرانس سے کہا۔

”تم..... تم ایک نازی ہو تم نے مجھے دھوکا دیا ہے اور اب یہاں بھی آ گئے۔“ فرانس نے غصے سے کہا پھر اس نے پولیس آفیسر کو لاکھ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ تانیا بروک نہیں ہے لیکن ساری شہادتیں اس کے خلاف تھیں آخر میں پولیس آفیسر نے اس کے کہنے کے مطابق تانیا بروک کے بچے پر معلومات کروائیں اور پتا یہ چلا تھا کہ وہاں کوئی نہیں ہے فلیٹ بالکل خالی تھا۔ مزید انکوائری کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ اس فلیٹ میں فرانس نامی کوئی لڑکی رہتی تھی جو چند روز پیشتر فلیٹ چھوڑ گئی اور نیویارک سے ہی بحری راستے سے کہیں اور کے لیے روانہ ہو گئی۔ اس کے سفری کاغذات بھی مکمل تھے۔

اس کے بعد فرانس کی آخری امید بھی دم توڑ گئی اور چارلس اسے ساتھ لے کر واپس آ گیا۔

پھر اس عمارت سے ان کی روانگی رات ڈیڑھ بجے ہوئی اس تمام عرصے میں فرانس سخت نگرانی میں رہی۔ اس نے چارلس کو بہت سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ تانیا نہیں ہے لیکن چارلس نے ایک بھی نہیں سنی تھی۔

پھر وہ جنرل اور چارلس کی نگرانی میں ایک آبدوز میں منتقل کر دی گئی اور ایک نامعلوم منزل کی جانب اس کا سفر شروع ہو گیا۔ کئی گھنٹے کے سفر کے بعد اس کے کمرے میں جنرل اور چارلس داخل ہوئے تھے ورنہ اس کے کمرے کو لاک ہی رکھا گیا تھا پھر فرانس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب جنرل نے اس سے کیپٹن انرکرافٹ پروڈکشن کے متعلق معلومات حاصل کرنا

چاہی تھیں اور اس کے لاعلمی ظاہر کرنے پر اس پر تشدد کیا گیا چارلس کھڑا دیکھتا ہوا فرانس سسکتی رہی تھی۔

”میں نہیں جانتی کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اس کا کیا مطلب ہے چارلس؟“ اس نے چارلس کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا تھا لیکن چارلس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جنرل نے اس کی لاعلمی کو اس کی چالاکی گردانا اور کسی صورت بھی اسے فرانس تسلیم نہیں کیا تھا پھر اس کے سامان کی تلاشی لی گئی تھی اور شومنی قسمت کہ وہ مطلوبہ کاغذات جو اس سے مانگے جا رہے تھے۔ اس انچی کیس کی نگلی تہہ سے برآمد ہو گئے جو تانیا نے اسے دیے تھے۔ ان کاغذات میں کیپٹن انرکرافٹ پروڈکشن کے بارے میں مکمل معلومات درج تھیں۔ ان کی فیکٹریوں کی پوزیشن اور ہر ماہ فیکٹری کی کارکردگی ان بندرگاہوں کا ذکر جن سے ان فیکٹریوں کا سامان لاداجاتا تھا اور جہازوں کی روانگی کی تاریخیں۔ ان کاغذات کو دیکھ کر جنرل کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

”بہت خوب فرالین دوس۔“ اس نے فرانس کو مخاطب کیا۔ اس نے فرانس کا یہی جرم نام تجویز کیا تھا۔

”تم نے کام تو بہت خوب کیا ہے لیکن شاید تمہیں اس کام کا کسی اور جگہ سے زیادہ معاوضہ ملنے کی توقع تھی بھی تم ہمیں کاغذات دینے سے ہچکچا رہی تھیں۔“ جنرل نے کہا پھر اس نے فرانس کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور چارلس کو ساتھ لے کر اس کمرے سے نکل گیا تھا۔ فرانس رحم طلب نظروں سے چارلس کی طرف دیکھتی رہی تھی لیکن چارلس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔

دونوں کے جانے کے بعد جب فرانس کمرے میں تنہا رہ گئی تھی تو اس نے انچی کیس کا جائزہ لیا وہ

سانڈ سے کٹا ہوا تھا اور اس کٹی ہوئی جگہ میں کاغذات چھپائے گئے تھے اور فرانس کی سمجھ میں تانیا کی حقیقت آگئی اور اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ شخص ایک اداکارہ ہی نہیں بلکہ ایک جرمن ایجنٹ بھی تھی۔ وہ انگریزوں کے اہم راز چرا کر جرمنوں کے ہاتھوں فروخت بھی کیا کرتی تھی اور اب کسی خاص وجہ سے اس نے فرانس کو اپنی جگہ استعمال کیا ہے اور خود بچ نکلی۔ اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ جو راز اس سے جرمنوں نے حاصل کیا ہے اس کا خریدار کوئی اور بھی ہے اور وہ اس راز کی زیادہ قیمت دے سکتا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد چارلس پھر اس کے کمرے میں موجود تھا۔ اس بار وہ تنہا تھا۔ اس نے کمرے میں آنے کے بعد کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور فرانس کی جانب پسندیدگی کی نظروں سے دیکھنے لگا۔

”تم بہت خوب صورت ہوتا تھا۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اور تم بہت اچھی اداکارہ بھی ہو۔“

”اداکارہ! کیا مطلب؟“ فرانس نے کہا۔

”مطلب یہ کہ تم مجھے تقریباً احمق بنانے میں کامیاب ہوئی گئی تھیں۔ مجھے تمہارے اس بیان پر کسی حد تک یقین آ گیا تھا کہ تم تانیا نہیں ہو لیکن پھر تمہارے اٹیچی کیس سے نکلنے والے کاغذات نے سارا مسئلہ حل کر دیا۔“ چارلس نے کہا۔

”تم میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے ہو؟ تمہارا رویہ مجھے ہاگل کر دے گا چارلس! تم بھی مجھ سے محبت کا اظہار کرتے ہو اور ابھی میرے دشمن بن جاتے ہو۔ آخر تم کیا چاہتے ہو۔ کل رات تم نے مجھے اپنی محبت کا یقین دلایا اور میں نے تمہاری اس بات کا یقین کر لیا تھا۔ یہ سب دھوکا تھا کیا یہ سب تم نے صرف اپنے ملک کی خاطر کیا جسے خون کا پیاسا ایک شخص تباہ کر رہا ہے۔“ فرانس نے روتے ہوئے کہا۔

”خاموش ہو جاؤ۔ تمہیں احساس ہے کہ اس وقت جرمنوں کے سب سے بڑے لیڈر کے بارے میں بات کر رہی ہو۔ اگر یہاں کسی نے تمہاری بات سن لی تو تمہیں فوراً شوٹ کر دیا جائے گا۔“ چارلس نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر زنی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

”تم احمق ہو۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میرا خیال تھا کہ تم ہوشیار بھی ہو لیکن تم جیسی باتیں کر رہی ہو ان سے تو تم جنرل کو اپنا دشمن بنا لو گی۔“ چارلس نے کہا۔ فرانس حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی وہ شخص اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کبھی تو وہ اسے دھمکی دیتا اور کبھی اسے احتیاطیں بتاتا تھا کہ وہ خطرے سے دور ہے۔

”اوہ! میں تمہیں نہیں سمجھ سکی کل رات تم نے مجھ سے محبت جتائی آج میں تمہاری بیوی ہوں لیکن جب دوسرا شخص تمہارے سامنے مجھے مارتا رہا تو تم کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔“

”میں یہ بھول جانا چاہتا ہوں تانیا! کہ تم میری بیوی ہو۔ تم کیوں مجھے یہ بات یاد دلاتی ہو؟“

”کیا! تم اس سے انکار کر سکتے ہو کہ میں تمہاری بیوی نہیں ہوں۔“ فرانس نے پوچھا۔

”میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔“

”لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔“ فرانس نے یقین سے کہا۔

”میں اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا ہوں۔“

”نہیں! میں یقین سے کہتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔“

”نہیں! مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح تم سے شادی کر لوں سو میں نے کر لی اور بس۔“

چارلس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”نہیں ایسا نہیں ہے بھلا جرمنی کے علاوہ اس فہرست میں اور کون آ سکتا ہے۔“

”میں بھی یہی جانتا چاہتی ہوں کیونکہ مجھے شبہ ہے کہ ہمارے ہی لوگوں میں سے کچھ ہمارے خلاف بھی ہو سکتے ہیں۔“

”نہیں کوئی اور خریدار نہیں تھا میں نے تمام تفصیلات اسی طرح حاصل کی تھیں جس طرح مجھے کہا گیا تھا۔“

”گویا تمہارے لیے پانچ ہزار امریکن ڈالر کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور تم ہم ہی سے زیادہ رقم وصول کرنا چاہتی ہو؟ ہمیں ڈر تھا کہ تم ایسا کوئی حربہ ضرور استعمال کرو گی کیا یہی اصل وجہ تانیا؟ تم آخر یسوی عورت ہو تم اپنے وطن سے بھی کئی بار غداری کر چکی ہو۔“

”میں خوف زدہ تھی۔“ اچانک ہی فرانس کے ذہن میں اپنے بچاؤ کی تریکب آئی تھی۔

”میں نے اب تک جو کام کیے یہ ان میں سب سے بڑی ذمہ داری تھی چنانچہ مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ میں برٹش سیکریٹ سروس کی نظر میں آ گئی ہوں۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرا تعاقب کیا جا رہا ہو میری نگرانی ہو رہی ہے۔ میں گھبرا گئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ میں سب کام چھوڑ کر اپنی جان بچا کر بھاگ جاؤں۔“

”ہاں! ہم نے اس بارے میں بھی سوچا تھا۔“

چارلس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”جس طرح ہم تم سے انفارمیشن حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسی طرح یہ بھی جانتا چاہتے تھے کہ تمہارے کام کا کوئی خریدار تو نہیں ہے۔“

”اور اسی لیے تم نے مجھ سے شادی بھی کی تھی۔“

”یہ سب میری ڈیوٹی میں شامل تھا۔“ چارلس نے کہا اور فرانس کی طرف دیکھنے لگا۔

”تم نے کہا ہے کہ تم مجھے نہیں سمجھ سکی ہو لیکن ایسا نہیں ہے بات درحقیقت یہ ہے کہ تمہیں سمجھنے سے قاصر رہا ہوں پہلے تم ہمارے لیے کام کرتی تھیں اور ہمارے لیے دستاویزات اور اطلاعات چراتی تھیں یہ کام تم نے ایک بار نہیں بلکہ بار بار کیا ہے۔ مجھے تمہارے ریکارڈ کا اچھی طرح علم ہے میں جب میری ساؤنڈ میں تم سے ملتا تو تمہارا سارا ریکارڈ دیکھ چکا تھا پھر تم نے اچانک اس حقیقت سے انکار کرنا شروع کر دیا کہ تمہارے پاس انفارمیشن ہے تم نے آخری موقع پر ہمیں ڈبل کر اس کرنے کی کوشش کی اور ہمارے لیڈر سے بھی نفرت کا اظہار کیا ہے۔“ چارلس خاموش ہو گیا پھر اچانک ہی اس نے قہقہہ لگایا اور اس کے چہرے پر فرانس کے لیے پسندیدگی کے آثار پیدا ہو گئے۔

”تم بہت چالاک ہوتا تھا! شاید تم مجھے آزما رہی تھیں شاید تم میری وفاداری کو آزما رہی تھیں۔ یہی بات تھی نا؟ کیا تم نے مجھ پر غداری کا شبہ کیا ہے؟“

لیکن جواباً تانیا خاموش رہی۔

”تمہیں پتا ہے اس آب دوز پر ایک لمحے کے لیے تم نے مجھے یقین دلایا تھا کہ تم تانیا نہیں ہو پھر جب تمہارے اٹیچی سے مکمل دستاویز نکلیں تو میں نے سوچا کہ تم نے نیویارک پولیس کو جو کہانی سنائی تھی اس میں کچھ حقیقت ہوگی۔“

چارلس بول رہا تھا اور فرانس سوچ رہی تھی کہ اگر چارلس کو اس نے حقیقت بتادی تو وہ مزید خطرے میں پڑ جائے گی۔ چارلس نازی تھا اور نازی اصول اور ڈسپلن اس کی ذات میں رچے بسے تھے۔ فرانس نے کچھ غور کرنے کے بعد ایک نئی چال چلنے کا فیصلہ کر لیا۔

”کیا تمہاری نظر میں کوئی بڑا خریدار بھی ہے جو ان رازوں کو خرید سکے“

”اچھا خدا حافظ.....! ہیل ہٹلر!“ چارلس نے کہا اور فرانس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہیل ہٹلر!“ فرانس نے بھی نہ جانتے ہوئے اس کے ہی انداز میں کہا پھر وہ باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے کمرے کا دروازہ بھی لاک ہو گیا تھا اور فرانس ایک گہری سانس لے کر بستر پر بیٹھ گئی۔

فرانس سے رخصت ہونے کے بعد چارلس سیدھا جنرل کے پاس آیا اور اسے بتایا کہ تانیا خوف زدہ ہونے کی وجہ سے راز دینے سے انکار کر رہی تھی۔ جنرل کسی حد تک مطمئن ہو گیا تھا اور اس نے چارلس کو تائید کی تھی کہ وہ تانیا پر نظر رکھنے کے لیے اس سے زیادہ قریب رہنے کی کوشش کرے۔ اس کے لیے وہ اپنے رشتے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

جنرل سے ملنے کے بعد چارلس آبدوز کے عرثے پر چلا گیا۔ اس وقت آبدوز سمندر کی سطح پر سفر کر رہی تھی۔ رات گہری اور آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ چارلس آبدوز کی ریبنگ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کافی دور اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

”تانیا..... میری محبت..... میری بیوی..... جہاں کسی پھول کی طرح حسین اور معصوم ہے وہیں کسی جھوٹ کی طرح گہری اور تاریک..... اودہ خدایا! میری ذمہ داری بہت سخت ہے۔“ چارلس نے زیر لب کہا۔ یہ الفاظ اس نے صاف انگریزی زبان میں کہے تھے لیکن اس کے لہجے میں امریکن یا جرمن رنگ نہیں تھا۔ جب چارلس کی ملاقات فرانس سے ہوئی تھی تو وہ عام لباس کی بجائے بلیک گاڑی کی وردی میں ملبوس تھا۔ اس نے لمبے کالر کا سیاہ اورو کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کے سر پر آفیسر کی ٹوپی تھی اور کوٹ پر نازی بیج لگا ہوا تھا۔ فرانس اس سے انکار نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اس لباس میں بھی بہت خوب صورت اور اسٹارٹ لگ رہا تھا۔

”تانیا! ہمارا وطن آ گیا۔“ اس نے پُرسکون لہجے میں کہا لیکن تانیا خاموش کھڑی رہی۔

”کیا بات ہے تانیا؟“ ”کچھ نہیں! سردی بہت ہے۔“ فرانس نے بات بنائی۔ وہ اپنے محسوسات کو اپنے شوہر پر بھی ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔

چارلس نے اس کا ہاتھ تھاما اور دوسرے لوگوں کے ساتھ آبدوز سے نکل کر ساحل پر قدم رکھا۔ جہاں فوجی وردی میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ جنرل دوس بھی ان میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور شخص تھا جسے دیکھ کر فرانس کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ جرمن گورنمنٹ میں کوئی اہم عہدہ رکھتا ہے۔ سب سے پہلے جنرل نے اس شخص کو سیلوٹ کیا اور اس کے بعد چارلس نے اپنی رپورٹ پیش کی تھی پھر وہ کاغذات بھی اس شخص کو دے تھے جو فرانس کے سوٹ کیس سے ملے تھے۔ اس شخص نے کاغذات پر سرسری نظر ڈالی اور اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آنے لگی تھی پھر اس شخص نے چارلس اور جنرل کی حوصلہ افزائی میں چند الفاظ کہے تھے اور فرانس کی طرف پسندیدگی سے دیکھا تھا۔

”یہ میری بیوی ہے..... فرالین دوس اور یہ کاغذات اس کی ہی بدولت ہمیں ملے ہیں۔“ چارلس نے اس کا تعارف کروایا جس پر اس آفیسر نے فرانس کو سیلوٹ کیا اور اس کے بعد وہ سب اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھ گئے جو ان کی منتظر تھیں۔

چارلس کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے فرانس کو ایک بار پھر اس آفیسر کے سیلوٹ کا جواب دینا پڑا تھا اور وہ اپنی ہنسی ضبط کرتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے اپنی ہستی کو نہیں چھپایا تو اس کا نتیجہ اس کی موت بھی ہو سکتا ہے۔

”تمہیں یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ اب تم جرمنی میں ہو۔ یہ خیال رکھنا کہ بہت سی آنکھیں تمہیں دیکھ رہی ہیں۔ تمہیں پتا ہے کہ ابھی تم جس آفیسر سے ملی ہو وہ کون تھا۔“ چارلس نے گاڑی کے دور جانے کے بعد فرانس سے کہا۔

”نہیں! میں ان لوگوں کے بارے بات بھی نہیں کرنا چاہتی..... میں.....“

”وہ ہملر تھا گستاخ کا چیف!“ چارلس نے خشک لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال تھا کہ تم نے تصویریں ضرور دیکھی ہوں گی اور تم اسے پہچان جاؤ گی۔“ چارلس نے کہا اور فرانس کو جھجھکی سی آگئی۔

ان کی گاڑی شہر سے نکل کر ایک سنسان روڈ پر آ گئی تھی۔ فرانس نے ایک بار چارلس کی طرف دیکھا اس کی نظریں سڑک پر لگی تھیں۔

”کیا بات ہے؟“ چارلس نے اپنے چہرے پر اس کی نظریں محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”میں جانا چاہتی ہوں کہ تم کہاں جا رہے ہیں؟ شاید اب مجھے تم کو کارل کہہ کر مخاطب کرنا ہوگا کیونکہ یہی تمہارا جرمن نام ہے؟ کارل دوس!“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم برلن جا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں پتا ہے۔“ چارلس نے کہا۔

”وہ لوگ جو بائیں کر رہے تھے وہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔“ فرانس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا کیونکہ جرمن کوئی آسان زبان نہیں ہے۔ ہم کب تک برلن پہنچ جائیں گے؟“

”میری کچھ دن چھٹی ہے میرا خیال ہے تم پسند کرو گی کہ میں تمہیں یہاں کے اچھے مقامات دکھاؤں یہ ایک خوب صورت ملک ہے۔“ چارلس نے کہا۔ اچانک اسٹیرنگ پر اس کے ہاتھ پکپکائے اور کار ایک طرف جھکتی چلی گئی۔ سڑک پر برف کی تہ بہت

موٹی ہو گئی تھی اور کار کا سنبھلنا بہت مشکل تھا لیکن چارلس نے اسے سنبھال لیا تھا۔

”میرا خیال ہے تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو؟“ چارلس نے کچھ دیر بعد اس سے کہا۔ ”کیا تم اپنی آزادی چاہتی ہو؟“

”آزادی؟ اگر مجھے آزادی مل بھی گئی تو میں کیا کروں گی! میں واپس انگلینڈ نہیں جاسکتی وہ مجھے شوٹ کر دیں گے۔“

”ہاں! اگر تم نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش تو گستاخ نہیں ہلاک کر دے گا اور اگر تم بھاگنے میں کامیاب ہو گئیں تو انگریز انتظامیہ تمہیں معاف نہیں کرے گی۔ تم خوف زدہ ہونے میں حق بجانب ہو۔ ان کی سیکریٹ سروس کے لوگوں کو تم پر شبہ ہو گیا ہوگا اگر ہم بروقت تمہیں نیویارک سے نہ نکال لاتے تو وہ لوگ تمہیں ہرگز نہ چھوڑتے۔ تم نے ان کے خلاف خاصا کام کیا ہے ویسے میرے لیے یہ وجہ کافی نہیں ہے کہ تم نے صرف پیسے کے لیے یہ کام کیا ہے میں یہ سننا پسند کروں گا کہ تم دل و جان سے جرمنوں کے ساتھ ہو۔“

”تمہیں اس بات کا یقین کیوں نہیں ہے اگر میں نے صرف رقم حاصل کرنے کے لیے یہ کام کیا ہوتا تو میرے لیے یہ مشکل نہیں تھا کہ میں ان رازوں کی زیادہ قیمت وصول کر لوں۔“ فرانس نے کہا اور چارلس اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ اسی لمحے ایک بار پھر کار گہری برف میں پھسل گئی۔ اس کے دونوں اطراف میں بہت اونچی برف جمع ہو گئی تھی اور چارلس اسے سڑک پر لانے کی جدوجہد کر رہا تھا پھر اچانک ہی کار تیزی سے اونچی اور سڑک پر آ گئی لیکن وہ چارلس کے قابو میں نہیں تھی اور ایک درخت سے ٹکرائی تھی۔ فرانس کو یوں لگا تھا جیسے چاروں طرف سفید برف کے گالے اڑ رہے ہوں اور گاڑی لڑھکتی چلی گئی

ہو وہ چارلس سے بہت دور جا پڑی تھی اور پھر اندھیرا چھا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد اسے ایک نرم اور گہیرا آواز سنائی دی تھی۔ وہ اس آواز کو پہچان سکتی تھی لیکن وہ اسے اجنبی لگ رہی تھی اس نے اپنے ہاتھ کو جنبش دی اور اس کا ہاتھ نرم نرم برقی سے مس ہوا۔ اسے اچانک یاد آ گیا کہ وہ آواز اس شخص کی ہے جس سے اس کی شادی ہوئی ہے۔

”مجھے چھوڑ کر مت جانا..... ہم جو بھی کچھ کر چکے ہیں وہ ہمارے درمیان دیوار نہیں بن سکتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں تانیا! تم میری ہو..... تم نہیں سکتیں۔“

”چارلس!“ فرانس نے سرگوشی کی اور سر گھما کر آواز کی سمت دیکھا۔ چارلس اس پر جھکا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ فرانس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تم ٹھیک ہو۔“ چارلس نے پرسکون انداز میں کہا۔ ”میں سمجھا تھا تم مر گئیں۔ مجھے تمہارے دل کی دھڑکنیں محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔ تم بالکل سہمہ پڑی تھیں۔“

”میرے سر میں شدید درد ہے۔“ فرانس نے کہا پھر اس نے چارلس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر بے ہوش ہو گئی۔

اس کے بعد جب اسے ہوش آیا تھا تو اس نے خود کو ایک گھر میں پایا۔ وہ کسی جرمن دیہاتی کا گھر تھا اور چارلس نے وہاں پناہ لی تھی گھر میں صرف دو افراد تھے ایک شوہر اور ایک بیوی۔ دونوں نے چارلس اور فرانس کا بہت خیال رکھا تھا اور فرانس بھی اس کی تنہائی اور خوش گوار ماحول میں چارلس کے ساتھ بہت خوش تھی۔ اس کی گاڑی قریبی گاؤں میں ٹھیک ہو رہی تھی۔ جس کے لیے کچھ اور وقت درکار تھا اور اس

عرصے میں چارلس ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔ ایک روز وہ فرانس کے روکنے کے باوجود گھر سے نکل گیا اور اسے تاکید کر گیا کہ اس کی واپسی تک وہ گھر سے باہر نہ نکلے۔ وہ بہت ہوشیاری اور محتاط انداز سے چلتا ہوا قریبی گاؤں تک آیا تھا اور وہاں کے ایک گھر میں داخل ہو گیا تھا۔ اس گھر میں ٹیلی فون لگا تھا۔

”میں ایک فون کرنا چاہتا ہوں یہ بہت ضروری ہے۔“ اس نے گھر کے مالک سے کہا اور گھر کا مالک اس کا سیاہ کوٹ دیکھ کر بیچھے ہٹ گیا۔ چارلس نے فوراً ہی برلن کے نمبر ملائے تھے اسے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا تھا پھر دوسری طرف سے بہت دھیمی سی آواز سنائی دی گئی۔

”گلاب کھل رہے ہیں۔“ چارلس نے دھیرے سے ریسیور میں کہا۔

”لکارڈی میں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”گڈ..... کیا تمہیں میری آواز سنائی دے رہی ہے؟“ چارلس نے پوچھا۔

”بہت مدہم..... مگر۔“

”میں ایسے لین ہوں۔“ چارلس نے بہت دھیمے اور نرم لہجے میں کہا۔

”تم مجھے صاف طور پر سن رہے ہو؟“

”بہت مدہم۔“ تمہیں اس طرح فون نہیں کرنا چاہیے تھا ہماری گفتگو سن بھی جاسکتی ہے..... لائنوں کو ٹیپ کیا جاتا ہے..... ممکن ہے کٹاپو۔“

”خدا کے لیے وقت برباد مت کرو اگر ضروری نہ ہوتا تو میں فون نہ کرتا بہت وقت برباد ہو چکا ہے اب ایک ایک منٹ اہم ہے میری بات غور سے سنو۔“

فٹنٹین ایمر جنسی چینل کے ذریعے لندن کو اطلاع دے دو کہ کینیڈین انزکرافٹ پروڈکشن کی فیکٹری اور تمام بحری جہازوں کی تفصیلات ان کی روانگی اور لنگر انداز ہونے کی تاریخیں اور جگہیں ایس ایس کے

ہاتھ لگ چکی ہیں اب پروڈکشن کا شیڈول تبدیل کرنا ضروری ہے۔ تمام تاریخیں اور بندرگاہیں بھی تبدیل کرنا ہوں گی یہ فوراً ہونا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”اور وہ عورت..... تانیا بروک!“ اس جملے پر چارلس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔

”ہاں وہ یہاں ہے..... میرے ساتھ..... تم اس کی پروا مت کرو کہ میں اسے یہاں کیسے لایا وہ میرے پاس محفوظہ.....“ اچانک دوسری طرف سے قطع کلامی کی گئی۔

”میں نے کلک کی آواز سنی ہے، ممکن ہے ہماری باتیں ٹیپ ہو رہی ہوں۔“

”مجھے یہ خطرہ مول لینا ہی تھا۔“ چارلس نے کہا۔

”تم فوراً نکل جاؤ..... ابھی اسی وقت اور میرا پیغام جلد از جلد کسی چوکی تک پہنچا دو یہ بہت اہم ہے۔“

کال کرنے کے فوراً بعد چارلس واپس فرانس کے پاس پہنچ گیا تھا پھر دو دن بعد اس کی گاڑی بھی مرمت ہو کر آگئی تھی اور وہ فرانس کے ساتھ برلن میں اپنے فلیٹ پر پہنچ گیا جس کے دوسرے ہی دن سے وہ اپنی ڈیوٹی پر بیورو میں حاضر ہو گیا تھا۔

فرانس فلیٹ کی کھڑکی میں بیٹھی باہر کا نظارہ کر رہی تھی کہ فلیٹ کی گھنٹی بجی وہ بھی چارلس آیا ہوگا۔ وہ دوڑتی ہوئی دروازہ کھولنے پہنچی لیکن جب اس نے دروازہ کھولا تو وہاں ایک اجنبی کھڑا تھا۔

”تم.....“

”فرالین دوس؟“ اس شخص نے پوچھا۔

”ہاں!“ فرانس نے جواب دیا اور وہ شخص دروازہ سے اندر داخل ہو گیا پھر اس نے دروازہ بند بھی

کر لیا تھا۔ فرانس نے مزاحمت کرنا چاہی تھی لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی۔ جب اس شخص نے خود کو تانیا کا شوہر ظاہر کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کچھ عرصے تانیا کا شوہر رہ چکا ہے اور اس ناتے ہی سے وہ چاہتا تھا کہ فرانس اس کی مدد کرے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے فرانس اسے یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ اس کی بیوی تانیا نہیں ہے۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں چاہتا ہوں کہ تم میرے لیے کارل کی جاسوسی کرو۔ کارل سے تمہاری کیسے نہج گئی۔“

”میں اس سے محبت کرتی ہوں۔“

”اور محبت کو بچانے کے لیے تمہیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ کارل کو کسی نازی پر غدار ہونے کا شبہ تو نہیں کیونکہ گورنمنٹ کو پتا چلا ہے کہ چند نازی بھی حکومت سے غداری پر آمرا آئے ہیں اور ایسے لوگوں کی نشاندہی پر انعام رکھا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں اگر کارل کو کسی پر شبہ ہے تو وہ تم مجھے معلوم کر کے بتا دو اس طرح میں اس شخص کی نشاندہی کر کے انعام کی رقم حاصل کر لوں گا۔ اس کے بدلے میں کارل کے لیے تمہیں چھوڑ دوں گا اور تم پر اپنی بیوی ہونے کا دعویٰ نہیں کروں گا۔“

”لیکن.....!“ اس سے پہلے کہ فرانس کوئی جواب دیتی دروازے پر جانی پہچانی دستک ہوئی۔ یہ چارلس کے دستک دینے کی آواز تھی۔ فرانس نے خوف زدہ نظروں سے آنے والے کی طرف دیکھا جس نے اپنا نام روڈولف بتایا تھا۔

”میں کوئی بھی بہانہ کر دوں گا۔ ویسے میں تم سے ملنے پھر آؤں گا۔“ روڈولف نے کہا اور اسی وقت چارلس اندر داخل ہوا۔ وہ روڈولف کو وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

”تم! تم یہاں کیا کر رہے ہو روڈولف؟“ اس

”اس ساری بات سے میرا کیا تعلق ہے؟“

فرانس نے پوچھا۔

”تمہارا تعلق یہ ہے کہ تم میری ہمشکل ہو اور چارلس تم سے محبت کرتا ہے وہ ایک اعلیٰ نازی آفیسر ہے اور میں تمہاری ہمشکل ہونے کی وجہ سے تمہاری جگہ لے کر اس سے بآسانی اہم راز اگوا سکتی ہوں۔“

تانیہ نے جواب دیا۔

”گویا تم ایک بار پھر مجھے تختہ مشق بنانا چاہتی ہو۔“ فرانس نے غصے سے کہا۔

”صرف ایک رات کی بات ہے فرانس! تم صرف ایک رات کے لیے مجھے اجازت دے دو کہ میں تمہاری جگہ تمہارے شوہر کے ساتھ رہ سکوں بس پھر میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

”کیا کہا؟“ فرانس نے غصے سے کہا۔ ”تمہیں احساس ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم جانتی ہو کہ کوئی عورت اپنے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے کسی دوسری عورت کو یہ اجازت نہیں دے سکتی کہ اس کا شوہر کسی دوسری عورت کے ساتھ وقت گزارے تم نے یہ بات کیا سمجھ کر کہی۔“

”فرانس! میرا خیال ہے کہ اس وقت ذاتی جذبات و احساسات کی قربانی کوئی بڑی قربانی نہیں ہے یہ کام میں اپنے ملک کے مفاد میں کر رہی ہوں اور شاید اپنے ملک کی خاطر تم یہ قربانی دینے سے گریز نہیں کرو گی۔“ تانیہ نے فرانس کی دھڑکی رگ پھر ہاتھ رکھ دیا اور فرانس اس بار پر رضامند ہو گئی۔

پھر اس نے وہیں تانیہ کے لباس سے اپنا لباس تبدیل کیا تھا اور تانیہ کو تاکید کر دی تھی صبح چار بجے تک وہ چارلس کے ساتھ رہ سکتی ہے ٹھیک چار بجے وہ اپنے فلیٹ پہنچ جائے گی پھر چاہے جو بھی ہو اس کی پروا نہیں کرے گی۔ اس نے تانیہ کو ہدایت کی تھی کہ صبح

نے پوچھا۔

”میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ کیا تم لوگ ڈبلی کیٹک بال پارٹی میں آ رہے ہو؟“ اس نے بات بنائی۔

”ہاں ضرور لیکن یہ کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔“ چارلس نے کہا۔

”ٹھیک ہے تو پھر آج رات ملاقات رہے گی۔“ روڈولف نے چارلس کو سیلوٹ کرتے ہوئے کہا اور واپس چلا گیا۔ چارلس کو اس کے وہاں آنے پر تشویش تھی پھر بھی اس نے رات کو بال پارٹی میں فرانس کے ساتھ شرکت کی۔ پارٹی میں ایک موقع پر کسی نے بڑے خفیہ طریقے سے فرانس کے ہاتھ میں ایک پرچہ پکڑا دیا تھا جس پر لکھا تھا فرانس نارتھ تم مجھ سے گمراہ نمبر بارہ میں فوراً ملو۔ فرانس اس حکم کو نظر انداز نہ کر سکی تھی اور اسی وقت گمراہ نمبر بارہ میں پہنچی تھی۔

جہاں اس کی ملاقات تانیہ سے ہوئی تھی جواب وینس کا نام اپنائے ہوئے تھی اس کا کہنا تھا کہ وہ برطانوی سیکرٹ سروس کے لیے کام کر رہی ہے اس نے فرانس کو بتایا کہ کیم عمری میں اس کی ملاقات روڈولف سے ہو گئی تھی اور اس نے روڈولف سے شادی کر لی جو نازی تھا پھر روڈولف کے کہنے پر وہ چھوٹے چھوٹے برطانوی راز چراتی رہی تھی لیکن جاسوسی کا کام کرتی رہی اب اس نے کینیڈین انٹراکٹ پروڈکشن کاراز چرایا لیکن برطانوی سیکرٹ سروس نے نہایت مشکل کے بعد اسے گرفتار کیا تھا تو وہ اس وعدے پر چھوڑی گئی تھی کہ وہ انہیں نازیوں کے متعلق اہم معلومات فراہم کرے گی۔ وہ اپنے پچھلے کردار کی وجہ سے یہ کام بخوبی کر سکتی تھی چنانچہ کامیابی کی صورت میں اسے معاف کر دیا جائے گا اور وہ برطانیہ میں وہاں کی شہری کی حیثیت سے آزادانہ زندگی گزار سکے گی۔“

چار بجے وہ کسی بہانے سے خاموشی سے فلیٹ سے نکل جائے پھر وہ اس کی جگہ لے لے گی اور چارلس کو کچھ بتائیں چلے گا۔

پھر ایسا ہی ہوا تھا تانیہ فرانس کے کپڑے پہن کر واپس اس ہال میں آ گئی تھی جہاں بال پارٹی منعقد ہو رہی تھی اور چارلس اسے دیکھتے ہی اس کے پاس آ گیا تھا۔

”تم کہاں چلی گئی تھیں تانیہ! ایک گھنٹے سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔“ چارلس نے کہا۔

”میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی چارلس! میں کچھ دیر آرام کرنے کے لیے ڈریسنگ روم میں چلی گئی تھی۔“ تانیہ نے جواب دیا۔

”اوہ! واقعی تم زرد ہو رہی ہو میرا خیال ہے اب ہمارے یہاں رکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ چارلس نے کہا۔

”نہیں چارلس! میں تمہاری یہ تقریب خراب نہیں کرنا چاہتی تم ٹھہر جاؤ میں اکیلی جاؤں گی۔“ تانیہ نے مکاری سے کہا۔

”نہیں تانیہ! میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔“ چارلس نے جواب دیا اور پھر وہ تانیہ کے ساتھ اپنے فلیٹ آ گیا تھا۔

”اچھا تانیہ! تم آرام کرو مجھے کچھ کام ہے میں اسٹڈی میں ہوں کام مکمل کر کے آ جاؤں گا۔“ چارلس نے کہا۔

”زیادہ دیر نہ لگانا چارلس!“ تانیہ نے اتراتے ہوئے کہا اور چارلس اسے عجیب انداز سے دیکھنے لگا۔

”تم مجھے کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہو۔“ اس نے کہا۔

”نہیں چارلس! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں آرام کروں گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے کہا۔

اور اپنے بیدروم میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد تانیہ اسٹڈی روم میں آ گئی تھی اب اس نے فرانس کا سلیپنگ گاؤن پہنا ہوا تھا۔

”تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ چارلس نے اس کی تعریف کی۔

”ہوں تم یوں ہی کہہ رہے ہو حالانکہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔“ تانیہ نے کہا۔

”یہ تم نے کیسے سوچ لیا میں تو تم سے ہمیشہ سے محبت کرتا ہوں۔“ چارلس نے کہا۔

”لیکن مجھ پر اعتبار نہیں کرتے۔“ تانیہ نے لقمہ دیا۔

”یہ الگ بات ہے تانیہ! میں اپنی حکومتی ذمہ داریوں کو پیار پر قربان نہیں کر سکتا۔“

”لیکن میں نے تو سب کچھ چھوڑ دیا اور میں نے یہ سب اس وقت چھوڑا جب مجھے یہ احساس ہوا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔“ تانیہ نے کہا۔

”کاش میں تمہاری اس بات پر یقین کر سکوں لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہماری شادی ہی جھوٹ پر مبنی تھی جب تم سے میری شادی ہوئی تو تم ہوش میں نہیں تھیں اور مجھے کچھ اور ہی سمجھتی تھیں۔“

”لیکن ہم اب تو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔“ تانیہ نے کہا۔

”لیکن تم مجھ پر توجہ دینے کی بجائے اپنی سیاسی ذمہ داریوں کو زیادہ وقت دیتے ہو جن میں اب میں دلچسپی نہیں رکھتی اور نہ ہی تم پسند کرتے ہو کہ میں دلچسپی لوں۔“

”تانیہ میں تمہیں یہاں سے دور بھیج رہا ہوں ہو سکتا ہے کچھ عرصے بعد جب میں اس قابل ہو جاؤں تو تمہیں اپنے بارے میں زیادہ تفصیل سے بتا سکوں۔“ چارلس نے کہا۔

”تم مجھے کہاں بھیج رہے ہو۔ میں کہیں

نہیں جاؤں گی! جب تک تم مجھے یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم مجھے کہاں بھیج رہے ہو۔“ تانیانے کہا۔

”تمہارے حق میں ہی بہتر ہے تانیانے! چارلس نے کہا۔ میں مجبور ہوں۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے میں تمہارے بچے کو جنم دینے والی ہوں! کیا یہ بھی میری محبت کی سچائی کے لیے کافی نہیں ہے۔“ تانیانے ایک اور چال چلی۔

”تم نے کیا کہا؟“ چارلس کے لہجے میں حیرت اور خوش نمایاں تھی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں چارلس!“

”لیکن پھر بھی تمہیں یہاں سے جانا ہوگا۔ یہ بچے کے اور تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔“ چارلس نے کہا۔

”لیکن کیوں؟“

”یہ میں تمہیں پھر بتاؤں گا۔“

”میں ابھی جاننا چاہتی ہوں چارلس! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں نے تمہاری خاطر اپنی زندگی وقف کر دی ہے میں نے اپنی تمام سیاسی سرگرمیاں چھوڑ دی ہیں۔ اب میں تمہارے ساتھ ہوں! کیا تم اب بھی مجھ پر اعتماد نہیں کرتے؟“ تانیانے کہا اور چارلس اس کو جواب دینے کے بجائے اسے گھورنے لگا پھر وہ اس کے قریب آیا تھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کے بازو پکڑ لیے تھے۔ اس کی گرفت تانیانے کے بازوؤں پر سخت ہوتی جارہی تھی اور وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ تانیانے کا دل خوف سے دھڑک رہا تھا اسے شبہ تھا کہ کہیں چارلس اس کی حقیقت جان نہ جائے۔

”ٹھیک ہے تانیانے! میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ چارلس نے کہا اور تانیانے اطمینان کا سانس لیا۔ ”تانیانے! میں تم پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی زندگی تمہارے ہاتھ میں دے رہا ہوں! تم مجھے کارل دوس کی حیثیت سے جانتی

ہو جو بلیک گارڈز میں لیفٹیننٹ ہے اور سیکرٹ بیورو میں ایک افسر ہے! مجھے جرمنی میں ہر شخص جانتا ہے مجھے اعلیٰ حکام کا اعتماد حاصل ہے! میں ہٹلر سے براہ راست مل سکتا ہوں لیکن یہ سب حقیقت نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میں چارلس ہینس برٹش سیکرٹ سروس کا ایک تجربہ یوں اور جرمنی میں برٹش سیکرٹ سروس کا ایجنٹ ہوں وہ شخص جس کی گرفتاری کے لیے گٹا پوڑے سے بڑا انعام دے سکتی ہے۔“ چارلس نے کہا۔ تانیانہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی وہ اپنے خوابوں میں بھی ایسا تصور نہیں کر سکتی تھی۔

”تم..... تم ایک انگریز ایجنٹ ہو..... یہ میرے لیے ناقابل یقین ہے۔“ تانیانے کہا پھر اس نے چارلس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو محسوس کر لیا تھا اور خود کو زیادہ محتاط کر لیا تھا۔

”خیر کچھ بھی ہو ہم دونوں کے درمیان خلیج ختم ہوگئی ہے۔“ اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”اب ہم دونوں زیادہ سچائی سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکیں گے۔ کاش ہم پہلے ہی اس موضوع پر بات کر لیتے۔“ تانیانے کہا پھر اس کے ذہن میں اچانک ایک اور سوال آیا

”تم یہ کام کب سے کر رہے ہو..... کیا انہیں تم پر شبہ ہو گیا ہے؟“

”میرا خیال یہی ہے کہ انہیں مجھ پر شبہ ہوا ہے لیکن وہ اس بارے میں زیادہ پریشان ہوتے جا رہے ہیں کہ ان کے اہم معاملات کی خبریں باہر کیسے پہنچ جاتی ہیں۔ وہ اس سلسلے میں سخت تحقیقات کر رہے ہیں پانچ آفیسرز پر شبے کی بنیاد پر نظر رکھی گئی ہیں۔ روڈولف اسپیشل ڈیپارٹمنٹ آف انٹیلیجنس کا آفیسر ہے اس لیے آج جب وہ تنہائی میں تم سے ملنے میرے فلیٹ آیا تو میں اسے دیکھ کر متفکر ہو گیا وہ یہاں ضرور کسی خاص

وجہ سے آیا تھا لیکن اس نے اچانک میرے وہاں پہنچ جانے کی وجہ سے بات بدل دی تھی۔ میرا خیال ہے اب تم سمجھ گئی ہوگی۔ تانیانے! میں نے اپنی زندگی تمہارے ہاتھ میں دے دی ہے میں نے نہ صرف اپنی زندگی تمہارے ہاتھ میں دی ہے بلکہ برطانیہ اور فرانس کی بھلائی بھی اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

”کیا تم مجھے یہ سب کچھ بتا کر کچھ بتا رہے ہو؟“ تانیانے پوچھا۔

”ہاں اور وہ اس لیے کہ اس طرح میں نے تم پر اور زیادہ بوجھ ڈال دیا ہے لیکن اب تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں اب الفاظ کو واپس نہیں لیا جاسکتا۔ اب تم کل چلی ہی جاؤ گی چنانچہ اگر تم میرے بارے میں حقیقت جان ہی لو تو اچھا ہے۔“

”ہاں..... ہاں میں چلی جاؤں گی۔“ تانیانے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے ذہن میں نئے منصوبے بنا رہی تھی اس کے پاس ایک ایسی خبر تھی جسے براڈ کاسٹ کر دیا جاتا تو جرمنی میں تہلکہ مچ جاتا لیکن اس کا یہ ارادہ نہیں تھا کہ وہ یہ خبر کسی عام شخص کو بتائے وہ یہ خبر خود ہٹلر کو دینا چاہتی تھی اب وہ جلد از جلد اس گھر سے نکلنا چاہتی تھی۔

”تم بہت تنگھے ہوئے نظر آ رہے ہو۔ میں تمہارے لیے کافی بنا کر لاتی ہوں۔“ تانیانے کہا اور باورچی خانے میں چلی گئی پھر اس نے چارلس کے لیے کافی بنائی تھی اور جب پیالی میں کافی ڈالی تو اس میں نشا در دوام ملا دی تھی جسے پینے کے بعد چارلس دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا تھا لیکن مدہوش ہونے کے آخری لمحات میں اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ تانیانے اسے کافی میں کچھ ملا کر دیا ہے۔

چارلس کے بے ہوش ہوتے ہی تانیانہ فلیٹ سے نکلی تھی اور اسی لمبے فرانس کے فلیٹ میں داخل ہوئی

تھی اسے فلیٹ کی طرف آتے ہوئے ایک پہرہ دار نے دیکھا بھی تھا۔ تانیانہ فلیٹ سے نکلنے کے بعد دوڑتی ہوئی قریبی پبلک فون بوتھ پر گئی تھی اور اس نے جنرل دوس کے نمبر ڈائل کیے تھے پھر اس نے جنرل کو بتایا تھا کہ اس کے پاس ایک اہم اطلاع ہے اور وہ اطلاع وہ بذات خود ہٹلر کو دینا چاہتی ہے چنانچہ ہٹلر سے اس کی ملاقات کا انتظام کیا جائے۔

ابھی اس کی بات نامکمل ہی تھی کہ پبلک فون بوتھ کے باہر کھڑی گاڑی میں سے ایک شخص باہر آیا تھا اور جیسے ہی تانیانہ بوتھ سے باہر آئی ایک مضبوط ہاتھ نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ ایک مردانہ آواز سنائی دی اور تانیانہ اس کی سخت گرفت میں چل کر رہ گئی۔

”مجھے چھوڑ دو۔“ تانیانے کہا لیکن اسے دھکا دے کر کھڑی ہوئی کار کی نشست پر گرا دیا گیا۔

”میں تم کوں کو دیکھ لوں گی۔“ تانیانے غصے سے کہا۔

”ہم گٹا پو سے تعلق رکھتے ہیں۔“ ایک تیز سرگوشی نما آواز میں کہا گیا۔

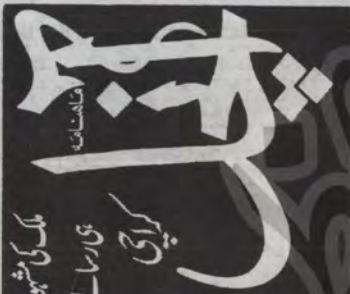
”اور تم تانیانہ میری سابق قانونی بیوی تم نے میری توجہ اپنی طرف خوب مبذول کروائی ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرائے بغیر فلیٹ میں داخل کیسے ہو سکتی ہو پھر باہر آ کر دوبارہ اندر کیسے چلی گئیں اس کی تو ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے کہ کوئی تمہارا ہم شکل ہے۔“ روڈولف نے اپنے ذہن میں آنے والے ڈرامائی خیال پر خود محفوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون سی خاص اطلاع جنرل تک پہنچانا چاہتی ہو؟“

”اگر تم نے مجھے دیر کروائی تو اس کے بدلے تمہیں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔“ تانیانہ

aanchal.com.pk

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں



ملک کی مشہور معروف کلاؤں کے سلسلے وار ناول ناواٹ اور افسانوں سے موزون ایک مکمل جلد جہیز کے لیے ہے۔ جہیز کی آسودگی کا باعث ہو سکتا ہے اور وہ ہے صرف اور صرف آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں۔
جہیز کا نکتہ نگار سہاجی دیویاں پٹی سارا دھبک گندھی نازیکہ نوناری کا لکھا سلسلہ
پیشہ کیلکولاجی: معروف مصنفہ اقرا صغیر کا خصوصی ناول نیا قاب فراموش ناول
ایک چھ خواب: معروف ناول نگار پیرا دھبک گندھی عشاق اور سردار کی خوب صورت سلسلے وار کہانی

35620771/2 فون: چندن پٹن کی صورت میں دفتر سے رابطہ کریں۔

ہو؟“ فرانس نے پوچھا۔
”میں تھوڑی دیر بعد فون کر لوں گا۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”اے بتانا کہ میں بہت اہم موضوع پر بات کرنا چاہتا ہوں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔
فرانس پھر چارلس کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی اور دوسری بار جب فون آیا تو چارلس ہوش میں آچکا تھا اور اس نے خود ہی فون پر بات کی تھی۔
”ہاں کون بول رہا ہے؟“ اس نے کہا۔
”گلاب کھل رہے ہیں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔
”تھہرو..... یاد آیا..... پکار ڈی میں ایس اے ٹین.....“
”میں سیون بول رہا ہوں..... اس طرح بات کرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔
”لیکن یہ ضروری بھی تھا تمہیں شبہ کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے اور آج رات ہی یہ سب ہوا ہے روڈ ولف گسٹاپو کے ساتھ چل پڑا ہے تمہارے پاس صرف دس منٹ ہیں کہ وہاں سے اپنے تمام نشان منہا کر نکل جاؤ اگر تم ایسا کر سکتے ہو تو..... اگر کم دس منٹ میں یہاں نہیں پہنچ سکتے تو ہر اہم چیز کو جلا دینا۔“ دوسری طرف سے کہا گیا اور فون بند ہو گیا۔
اب معاملہ کچھ کچھ چارلس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس نے ریسپور رکھ دیا اور حیرت سے فرانس کی طرف دیکھنے لگا۔
”تم نے مجھ سے دھوکا کیا..... بتاؤ تمہیں یہ کام کرنے کا انہوں نے کتنا معاوضہ دیا؟ تم تو مجھ سے محبت کی باتیں کر رہی تھیں میرے بچے کو جنم دینے کی باتیں..... میں تمہیں مار ڈالوں گا۔“
”میں تانیا نہیں ہوں..... میں نہیں جانتی کہ کیا ہوا

ڈالوں گا۔ بتاؤ وہ کون سی اطلاع ہے۔ جلدی کرو یہاں ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ ٹیپ ہو رہا ہے۔“
”میں نہیں بتاؤں گی کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اطلاع دیتے ہی مجھے مار دیا جائے گا۔“ تانیا نے کہا اور روڈ ولف آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر اس نے تانیا کا گلا اپنے دونوں ہاتھوں سے دیوبج لیا تھا اور وہ گھٹی گھٹی آواز میں ساری کہانی اسے سنارہی تھی اس کے بعد روڈ ولف نے اپنی پستول سے اپنی سابقہ بیوی کا کام تمام کر دیا تھا۔ جسے بھی وہ چاہتا تھا لیکن اس کے غریب ہونے کی وجہ سے وہ اسے چھوڑ گئی تھی اور اب اپنے ملک سے غداری کر رہی تھی جسے روڈ ولف کبھی معاف نہیں کر سکتا تھا۔
تانیا اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی لیکن فرانس ابھی اپنی زندگی کی جنگ لڑ رہی تھی۔ تانیا کے فلیٹ سے نکلے ہی وہ دوڑتی ہوئی اندر آئی تھی اور اس نے ایک کرسی پر چارلس کو بے ہوش پڑے ہوئے پایا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ تازہ کافی بنا کر چارلس کو دے پھر اس نے جیسے ہی کافی کی ٹرے اٹھائی جو چارلس کی کرسی کے قریب رکھی تھی نشا ووردوا کی شیشی لڑھک کر نیچے گری جو تانیا جلدی میں لے جانا بھول گئی تھی۔
فرانس جان گئی تھی کہ تانیا نے چارلس کو نشا آور دوا دی ہے۔ وہ تیزی سے باورچی خانے میں گئی تھی اور چارلس کے لیے بلیک کافی بنا کر لائی تھی اسی لمحے ٹیلی فون کی کھنٹی بجی تھی اور دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز سنائی تھی۔
”تم کون ہو؟“ اس سے پوچھا گیا۔
”تم کس سے بات کرنا چاہتے ہو؟“ فرانس نے پوچھا۔
”میں لیفٹیننٹ دوس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“
”میں انہیں جگا نہیں سکتی۔ تم کون بول رہے“
”نہیں کہی دی۔“
”ہو سکتا ہے ایسا ہو۔“ روڈ ولف نے کہا۔ ”لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آج رات تم کس چکر میں ہو۔“ روڈ ولف نے کہا پھر اس نے ڈرائیور کو گسٹاپو بلڈنگ چلنے کی ہدایت کی تھی۔
”تم مجھے وہاں کیوں لے جا رہے ہو؟ میں تمہیں خبردار کرنا چاہتی ہوں کہ.....“
”جب تم گسٹاپو کے آخری فلور پر پہنچ جاؤ تب بات کرنا۔“
پھر جلد ہی وہ گسٹاپو بلڈنگ کے آخری فلور کے اس کمرے میں پہنچ گئے تھے جہاں جانے والے بہت کم زندہ واپس آتے تھے یا اپنے پیروں پر چل کر نہیں آتے تھے۔
تانیا کو کمرے میں لے جانے کے بعد ایک کرسی سے جکڑ دیا گیا تھا اور اس کے چہرے پر تیز روشنی ڈالی جا رہی تھی۔
”آج رات تم بال پارٹی سے ایک گھنٹہ غائب رہی ہو تم کہاں گئی تھیں؟“
”تم میرے ساتھ ایسا سلوک کر کے پچھتاؤ گے۔“
تانیا نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے کہا۔
”میرے پاس اطلاع موجود ہے۔“ تانیا نے کہا۔
”کیسی اطلاع؟“
”میں یہ خبر صرف جنرل وون کو ہی بتاؤں گی۔“
تانیا نے کہا اور روڈ ولف نے اس کے منہ پر پھٹڑ مارا۔
تانیا حیرت سے اسے تک رہی تھی۔
”میں تمہیں نہیں بتاؤں گی۔“ اس نے چیخ کر کہا۔ ”میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں روڈ ولف! اگر میں نے تمہیں بتا دیا تو تم یہ خبر اپنی ترقی کے لیے استعمال کرو گے اور مجھے مار ڈالو گے۔“
”اگر تم نے مجھے نہیں بتایا تو میں تمہیں ضرور مار

ہے تم میری بات غور سے سنو۔
”میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔“

”نہیں چارلس! ایسا تم کو میں سمجھ رہی ہوں کہ کوئی اہم بات ہوئی ہے ایسی بات جس کے متعلق میں نہیں جانتی اور تم یہاں سے جا رہے ہو مجھ سے دور لیکن میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میں تانیا نہیں ہوں وہ لڑکی نہیں ہوں جو ایک گھنٹہ پہلے یہاں تمہارے ساتھ موجود تھی جو تمہارے ساتھ بال پارٹی سے واپس یہاں آئی تھی۔“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ اب تم کون سا نیا حربہ آزمانا چاہتی ہو؟ کیا اب تم مجھے زیادہ بڑا حق بنانا چاہتی ہو؟ کیا تم اس بات سے انکار کر دو گی کہ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم میرے بچے کو جنم دینے والی ہو اور میں نے اس بات سے متاثر ہو کر تمہیں اپنی حقیقت بتادی تھی۔“

”چارلس! میں نے کبھی تم سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ میں نہیں جانتی کہ تم کون ہو میں یہ بھی نہیں جانتی کہ تمہارے ساتھ دھوکا کیسے کیا گیا ہے۔ تم مجھے بتاؤ تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟ تم کیا ہو؟“

”اگر تم یہ وقت صرف اس لیے خراب کر رہی ہو کہ گسٹاپو یہاں پہنچ جائے تو تم بہت اچھی اداکاری کر رہی ہو۔“ چارلس نے کہا۔ ”میں اپنے دس سینڈ اور ضائع کر چکا ہوں ایک غلطی میں نے تمہیں یہ بتا کر کی تھی کہ میں کیپٹن چارلس نہیں ہوں اور میرا تعلق برطانوی سیکرٹ سروس سے ہے۔“

”تم انگریز ہو؟ تم جرمن نازی نہیں ہو؟“ فرانس نے حیرت سے پوچھا۔

”تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ میں ایک نازی کا کردار کافی عرصے سے ادا کر رہا تھا لیکن میں نے اب تک کسی عورت سے دھوکا نہیں کھایا تھا لیکن اب

میرے ساتھ ایسا ہو چکا ہے میرے راستے سے ہٹ جاؤ تانیا!“

”میں تانیا نہیں ہوں میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا۔ میں اب بھی تمہارے ساتھ ہوں اگر تم مجھے چھوڑ کر کہیں گئے تو میں اپنی جان دے دوں گی۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی تم جہاں جاؤ گے میں تمہارے ساتھ جاؤں گی چاہے اس میں کتنا ہی خطرہ کیوں نہ ہو۔ تم سوچو تو اگر میں نے تمہیں دھوکا دیا ہوتا، تمہیں بے ہوش کیا ہوتا۔ تو میں کیوں تمہیں ہوش میں لاتی؟“ فرانس نے کہا اور چارلس اپنا ہاتھ سہلانے لگا۔

”تم نے ایک بار پھر مجھے اپنے اوپر یقین کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔“ اس نے کہا۔

”تم میرے ساتھ چلنا چاہتی ہو ٹھیک ہے اس طرح مجھے یہ سننے کا موقع بھی مل جائے گا کہ تمہاری حقیقت کیا ہے۔“ چارلس نے کہا پھر اس نے اپنے تمام ضروری کاغذات اپنے ساتھ لیے تھے اور فرانس کے ساتھ اپنے فلیٹ سے نکل گیا تھا۔ فلیٹ سے چند گز کے فاصلے پر ایک کالے رنگ کی کار موجود تھی جس میں وہ فرانس کے ساتھ بیٹھ گیا تھا اور کار تیز رفتاری سے روانہ ہوئی۔ کچھ دور جانے کے بعد چارلس نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

”میں تمام اہم کاغذات لے آیا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ سرحدوں کی نگرانی سختی سے ہو رہی ہوگی۔“ چارلس نے کہا۔ اس کا مخاطب وہ شخص تھا جو کار چلا رہا تھا۔

”تمہیں یہ شبہ کیسے ہوا کہ وہ میرے پیچھے ہے جم؟“ اس نے پوچھا۔

”ہم پل پل کی خبر رکھتے ہیں چارلس! گسٹاپو کا ہیڈ روڈ ولف آج دوپہر تمہارے گھر آیا تھا پھر اس

نے وہاں فون کیا۔ اس کے بعد پھر رات کو اس کی کار وہاں دیکھی گئی وہ وہاں کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر تمہارے فلیٹ سے کوئی نکلا تھا یہ صبح چار بجے کی بات ہے میں اندھیرے کی وجہ سے یہ نہیں دیکھ سکا کہ وہ کون تھا، وہ کوئی عورت تھی اور وہ سیدھی پبلک ٹیلی فون بوجھ کی طرف گئی تھی۔ اس نے جنرل وون کو فون کیا تھا اور کہا تھا کہ اس کے پاس ایک اہم اطلاع ہے جو وہ بذات خود ہٹلر کو دینا چاہتی ہے اور میرا خیال ہے اس نے ایسا کر بھی دیا۔ اس عورت کے فون کرنے کے کچھ ہی دیر بعد روڈ ولف کی کار بھی وہاں سے چلی گئی تھی اور تب ہی میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

”تم نے بہت اچھا کام کیا ہے جم۔“ چارلس نے کہا پھر وہ تانیا کی طرف دیکھنے لگا۔

فون کرنے کے بعد وہ عورت کہیں گئی نہیں تھی جم وہ میرے پاس واپس آ گئی تھی اور وہ اب بھی اس کار میں ہمارے ساتھ موجود ہے اور اب میں اس کی کہانی سننا چاہوں گا۔“ چارلس کے لہجے میں ہلاکی کاٹھی تھی۔ فرانس حیرت سے چارلس کو دیکھ رہی تھی۔ کار برلن شہر کو پیچھے چھوڑ کر کھلی سڑک پر آ گئی تھی۔

”چارلس! اگر تم برطانوی سیکرٹ سروس میں ہو تو پھر تم امریکہ میں نازیوں کے لیے کیسے کام کر رہے تھے؟ انہوں نے تمہیں مجھ سے شادی کرنے کے لیے کیوں منتخب کیا تاکہ مجھے جرمنی لایا جاسکے۔“

”میں تین سال سے ایک نازی کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ میں جن لوگوں کے درمیان کام کر رہا ہوں وہ حقیقت ان کے خلاف کام کر رہا ہوں۔

برطانوی سیکرٹ سروس کو بھی تم پر شبہ تھا چنانچہ دونوں طرف سے یہ کام میرے ہی حق میں تھا۔ برطانوی حکومت تمہیں گرفتار کرنا چاہتی تھی اور نازی بھی تم پر نظر

رکھنا چاہتے تھے کیونکہ انہیں شبہ تھا کہ تم اہم معلومات حاصل کرنے کے بعد کسی بڑے گام کو فروخت کر دو گی۔ خیر جو بھی ہو ایک نہ ایک دن تمہارا انجام یہ ہوگا کہ تم کسی گندی کھڑی میں پڑی ہو گی اور کسی رپوالور کی گولی تمہارے سر کے رپارنکل چکی ہو گی۔ کیونکہ نازی خطرناک لوگوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔“

”لیکن وہ میں نہیں تھی۔“ فرانس نے معصومیت سے کہا۔ ”تم میری بات شروع سے سنو چارلس! چار سال پہلے میں لندن کی ایک ڈرامہ اکیڈمی میں تھی میرا نام فرانس ناتھ تھا جواب بھی ہے۔“

”میں سن رہا ہوں۔“ چارلس نے اس کے خاموش ہوتے ہی کہا۔ ”ویسے میں تمہیں یاد دلا دوں کہ اب تمہارا نام وہ حقیقت مسز چارلس مینسن ہے۔ اب تم اپنی بات جاری رکھ سکتی ہو۔“

فرانس نے شروع سے لے کر آخر تک ساری کہانی چارلس کو سنادی۔

فرانس کی کہانی سننے کے بعد چارلس کچھ دیر خاموش رہا تھا۔

”جب ہم جرمنی پہنچ گئے تو تم نے خود کو میری بیوی تسلیم کر لیا، ہم دونوں عرصے تک تمہارے اور تب تم نے مجھے یہ بتانے کی کوشش نہیں کی جو اب بتا رہی ہو۔“ چارلس نے کہا۔

”میں تب تک تم سے محبت کر بیٹھی تھی۔“ فرانس نے کار کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو۔“

”ہاں! میں بھی تم سے محبت کرتا تھا تانیا!“ چارلس نے کہا۔ ”اگر تم مجھ سے محبت کرتی تھیں اور تمہیں بھی میری محبت کا یقین تھا تو تم نے مجھے حقیقت کیوں نہیں بتائی تھی؟“ چارلس نے پوچھا۔

”اس لیے کہ میں خوف زدہ تھی تم ایک نازی تھے

اور مجھے اس بات کا یقین تھا میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں ان کی طرح باتیں کرتے اور منہ کرتے دیکھا تھا۔ لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے دیکھا تھا جیسے وہ تمہارے پاؤں کی دھول ہوں مجھے اب بھی یاد ہے جب جنرل وون مجھ پر تشدد کر رہا تھا تو تم خاموش کھڑے تماشا دیکھتے رہے تھے اور مجھے بجانے کی کوشش نہیں کی تھی، تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح ظالم نظر آتے تھے چنانچہ میرا خیال تھا کہ اگر میں نے تم سے کچھ کہا تو تم اپنی نازی حکام کو اس بارے میں بتا دو گے اور مجھے کسی نازی کیمپ میں بھیج دیا جائے گا۔

”تمہارے پاس ہر بات کا کوئی نہ کوئی جواب موجود ہوتا ہے۔“ چارلس نے دھیمی مگر غصہ سے بھری آواز میں کہا۔

”تم مجھ پر یقین نہیں کرنا چاہتے۔“

”نہیں! میں یقین نہیں کرنا چاہتا اور اس طرح ممکن ہے کہ میں کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے سے بچ جاؤں۔“ چارلس نے کہا اور کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

”میں عام حالات میں شاید تمہارا یقین کر بھی لیتا لیکن آج رات جو کچھ ہوا ہے.....“ چارلس نے غصے سے کہا۔

”تم نے کہا کہ تانیا بروک نے تمہارا پاسپورٹ چرایا تھا اور فرانس نارتھ کی حیثیت سے انگلینڈ چلی گئی تھی تو پھر کل وہ اچانک بال پارٹی میں کیوں آ گئی۔ جنگ چھڑی ہوئی ہے اور لوگ اپنی مرضی سے جرمنی میں نہ تو آسانی سے آ سکتے ہیں نہ آسانی سے داخل ہو سکتے ہیں اور نہ یہاں سے جاسکتے ہیں۔“

”تم بھی تو کوشش کرنے جا رہے ہو اور یہاں سے نکلنے میں کامیاب بھی ہو جاؤ گے۔ تانیا بروک بھی کوئی احمق نہیں ہے وہ اپنا راستہ جانتی ہے۔“

آرام کرنے کا موقع دیتا رہا تھا اور وقفے وقفے سے کار خود بھی چلاتا رہا تھا پھر رات کے وقت اس نے کار ایک جگہ روک دی تھی۔ یہ ایک سنسان سڑک تھی اس کے بعد جم نے کار کی ڈکی سے ایک سوٹ کیس نکالا تھا اور جم اور چارلس نے اپنے کپڑے تبدیل کیے تھے اب وہ دونوں تمباکو خریدنے والوں کے بھیس میں تھے جن کا تعلق ہمبرگ فرم سے تھا جو تمباکو کا کاروبار کرتی تھی ان دونوں کے نام اب لیمن اور کورلر تھے اور مڈرہم کی طرف سفر کر رہے تھے جہاں سے انہیں تمباکو کی بڑی کھیپ لے کر جرمنی جانا تھا۔ چارلس نے یہ تمام باتیں فرانس کو بھی ذہن نشین کرا دی تھیں اور کہا تھا کہ وہ اب اس کی سیکرٹری ہے اور اس کا نام فرالین میری ہے۔

”ٹھیک ہے۔“ فرانس نے آہستہ سے کہا۔

”تم اپنی ماں اور تین بہنوں کے ساتھ پورٹ ڈیم میں رہتی ہو اور تمہارے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کا ثبوت میرے پاس ایک دستاویزی صورت میں محفوظ ہے جسے تم راستے میں پڑھ سکتی ہو میرے پاس تمہارے اس نام کا پاسپورٹ ویزا اور پرمٹ موجود ہے اگر تم سے کسی قسم کے سوالات پوچھے جائیں تو گھبرانا نہیں اگر تمہیں کسی سوال کا جواب نہ آئے تو

اپنی سمجھ سے کوئی جواب گھڑ لینا لیکن جواب بروقت دینا، جتنی جلدی جواب دو گی تم پر اتنا ہی کم شبہ کیا جائے گا۔“ چارلس نے کہا اس کے بعد ان کا سفر پھر شروع ہو گیا تھا ایک موقع پر انہوں نے کار بھی چھوڑ دی تھی اور آگے ٹرین سے سفر کیا تھا پھر وہ ایک اسٹیشن میں سوار ہو گئے تھے۔

جب وہ لندن پہنچے ہی والے تھے تو ان کا سفر پھر کار میں شروع ہو گیا تھا اور ایک موقع پر جب جم ایک ریسٹورنٹ میں کھانے کے لیے کچھ خریدنے گیا تھا۔

فرانس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

”تم میرے ساتھ قیدیوں جیسا سلوک نہیں کر سکتے۔“ فرانس نے چارلس سے کہا اور وہ اخبار سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”لیکن تم میری قیدی ہو اور اب ہم چیف سے ملنے جا رہے ہیں۔“ چارلس نے جواب دیا۔

”مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو لیکن کیا تمہیں یہ بھی احساس نہیں کہ میں تمہاری بیوی ہوں اور تم مجھے یونہی نہیں چھوڑ سکتے؟“

”میں ایسا کرنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں رکھتا۔“ چارلس نے کہا۔ ”اور میں اس سلسلے میں ابھی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تانیا!“

”تانیا! تانیا! کیا تم ہمیشہ مجھے اسی نام سے پکارتے رہو گے؟“

”بہت بہتر فرانس!“ چارلس نے کہا۔

”اب تم کیا کرو گے؟“

”میں اپنے چیف سے ملنے سے پہلے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں پہلے اسے رپورٹ دوں گا۔“

”کیا تم اسے میری کہانی بھی سناؤ گے؟“

”ہاں جو بھی سچ بات مجھے پتا ہے وہ میں بتاؤں گا۔“

”تو پھر کیا مجھے شوٹ کر دیا جائے گا؟“

”اب تم انگلینڈ میں ہو نازی جرمنی میں نہیں۔“ چارلس نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

ایک گھنٹے بعد چارلس اور فرانس وائٹ ہال بلڈنگ کے کارڈور میں تھے پھر چارلس ایک دروازے کے سامنے رک گیا تھا۔

”تمہیں میرے ساتھ ہی اندر چلنا ہوگا۔“ اس نے فرانس سے کہا اور اسے ساتھ لیے اندر داخل ہو گیا پھر اس نے اندر موجود شخص سے اس کا تعارف

کروایا تھا۔

”یہ میری بیوی فرانس ہے سرباف ڈیلن!“ اس نے کہا۔

”میں سمجھا نہیں۔“ چیف نے کہا۔ ”جب تم نیویارک میں تھے.....“

”میں نے تب ہی شادی کر لی تھی۔“ چارلس نے جواب دیا۔ ”اور یہ لڑکی ہمارے ریکارڈ پر تانیا بروک کے نام سے موجود ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے کتاب کوئی بات کہیں اور میں کوئی رپورٹ دوں میں اپنا اسٹیفانی پیش کرتا ہوں۔ میں اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں کہ میری بیوی کا اب کسی سیاسی سرگرمی سے کوئی تعلق نہیں ہے اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم دونوں اس ملک سے چلے جائیں گے اور کہیں مستقل قیام کر لیں گے۔“

”ایک منٹ ٹھہرو ہنسن!“ چیف نے کہا وہ فرانس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

”ہمیں بہت ہی باوثوق ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ تانیا بروک نامی عورت کورڈولف نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے، اطلاع ہمیں برلن سے ملی ہے۔“

”دیکھا میں نے کہا تھا نا کہ میں تانیا بروک نہیں ہوں۔“ فرانس نے چیف کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ نے کبھی فرانس ناتھ کا نام سنا ہے؟“

”ہاں یہ وہ نام ہے جو تانیا بروک نے امریکہ سے یہاں پہنچنے کے بعد استعمال کیا تھا ہمارا خیال تھا کہ وہ تمہیں دھوکا دے آئی ہے اور ہم اسے گرفتار کرنے والے تھے چارلس! لیکن وہ پھر غائب ہو گئی۔“

”چارلس! جب نیویارک میں تم نے مجھ سے شادی کی میں ایک لمحے کے لیے بھی تمہاری نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی ہے نا؟“ فرانس نے چارلس سے

کہا۔ ”اب تو تمہیں مجھ پر یقین آ گیا؟“

”ہاں اب مجھے یقین آ گیا۔“ چارلس نے کہا اور چیف کی طرف مڑا۔

”کیا آپ مجھے ایک منٹ کی مہلت دیں گے جناب! میں اپنی بیوی سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا پھر اس نے چیف کے جواب کا انتظار نہیں کیا تھا اور فرانس کا ہاتھ پکڑے ہوئے اسی کمرے میں کھلنے والے دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جو ایک چھوٹے کمرے میں کھلتا تھا اندر جا کر اس نے دروازہ بند کر لیا تھا۔

”تو تم سارا وقت مجھے سچائی بتانے کی کوشش کرتی رہیں اور میں نے تم پر یقین نہ کیا میں کبھی نہیں سکتا تھا اب تم بتاؤ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

”اگر میں سچائی پر نہ ہوتی تو تم کیا کرتے؟“ فرانس نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں لیے اس سے پوچھا۔ ”اگر تم یہی سمجھتے رہتے کہ میں تانیا بروک ہوں؟“

”میں پھر بھی تم سے پیار کرتا رہتا، تم نے سنا میں نے چیف کو کیا بتایا تھا اور میں نے اس سے کس چیز کی درخواست کی تھی میں نے سوچا تھا کہ ہم یہاں سے چلے جائیں گے آئرلینڈ یا کہیں اور اپنا گھر بنائیں گے۔“

”میں بھی یہی چاہتی ہوں لیکن اب کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہے تم مستقبل میں بھی مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو ہم اگر ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور سچائی پر ہیں تو ہم گھر پہنچ گئے ہیں چارلس! ہم گھر پہنچ گئے ہیں۔“ اور چارلس مسکراتا ہوا اس پر جھک گیا۔ ان دونوں کے درمیان اب کوئی دیوار نہیں تھی انہیں ایک دوسرے سے محبت تھی اور ایک دوسرے پر اعتماد تھا۔

